خطوطِ غالب

حصّہ اوّل

مُرتّبہ

غلام رسُول مہر

کتاب منزل لاہور

قیمت ۸-۶

خطوطِ غالب

مرتّبہ

غلام رسول مہر

کتاب منزل لاہور

بار .... اوّل

قیمت ....

شیخ نیاز احمد پرنٹر و پبلشر نے پاکستان ٹائمز پریس لاہور
سے طبع کرا کے کشمیری بازار لاہور سے شائع کی

فہرست

تعارف

میرزا غالب کے اردو مکاتیب کا جو مجموعہ آپ کے ملاحظہ میں پیش ہو رہا ہے، اس کی خصوصیات کے بارے میں چند گزارشیں ضروری ہیں:

اس مجموعے میں مرزا کے وہ تمام خطوط آ گئے ہیں، جن کا مرتّب کو سراغ مل سکا۔ صرف دو مجموعوں کو چھوڑا گیا۔ ایک مکاتیب رام پور کا مجموعہ، دوسرا منشی نبی بخش حقیر کے نام خطوط کا وہ مجموعہ جو "نادرات غالب" کے نام سے چھپا۔

تمام خطوط تاریخ وار مرتب کر دیے گئے ہیں۔ جن خطوں پر تاریخیں ثبت نہیں تھیں، ان کے بارے میں داخلی شہادتوں کی بنا پر قیاساً فیصلہ کیا گیا کہ وہ کس زمانے کے ہوں گے۔ اغلب ہے اکثر قیاس درست ہوں۔ اگر کہیں لغزش ہوئی ہو تو اسے مرتب کی سعی نارسا کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔

تمام مکتوب الیہم کے حالات لکھ دیے گئے ہیں تاکہ مرزا کے ساتھ ان کے تعلق کی حیثیت واضح ہو جائے۔ اور خطوط ملاحظہ فرماتے وقت وہ حیثیت سامنے رہے۔

خطوط میں جا بجا مقامی اور تاریخی تلمیحات ہیں، جن کی حقیقت مکتوب الیہم سے مخفی نہیں تھی لیکن عام خوانندگان گرام تشریح کے بغیر انہیں سمجھ نہیں سکتے اور خطوط سے بقدر طلب و ذوق لذت اندوز نہیں ہو سکتے۔ مرتّب نے حتی الامکان تمام تلمیحات کی تشریح کر دی ہے۔

ابتدا میں مقدمہ لکھا، جس میں انشائے غالب کی خصوصیات بیان کی گئیں۔ ان خصوصیات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے خطوط کا مطالعہ یقیناً زیادہ دلچسپی کا باعث ہوگا۔

اوقاف کے اہتمام میں کوئی دقیقۂ سعی فروگذاشت نہ ہوا، لیکن اس بارے میں لغزش و خطا سے برأت کا دعوے خیال میں بھی نہیں آسکتا۔ لیتھو کی چھپائی میں مسودہ جن مراحل سے گزر کر کتاب کی شکل اختیار کرتا ہے، ان کا تجربہ رکھنے والے اصحاب سے کچھ عرض کرنا تحصیل حاصل ہے اور جن کو تجربہ نہیں وہ مشکلات کا ذکر کر دینے سے ان کا پورا اندازہ نہیں کر سکتے رواج عام یہ ہے کہ ایسی لغزشوں کو کاتبوں یا سنگ سازوں کے ذمے لگا دیا جاتا ہے۔ لیکن مرتّب تمام لغزشوں کو اپنے اہتمام ہی کی کوتاہی پر محمول کرتا ہے۔

میری رائے برسوں سے یہ ہے کہ میرزا غالب کے اُردو مکاتیب کو مختلف درجوں میں درسی کتابوں کے طور پر پڑھانے سے اُردو زبان کا صحیح ذوق جس پیمانے پر پیدا کیا جا سکتا ہے، وہ کسی دوسری کتاب سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ "اُردوئے معلّٰی" اور "عودِ ہندی" قرنوں سے نصاب میں داخل ہیں، لیکن چونکہ ان مجموعوں کی ترتیب میں وہ اہتمامات نہیں کیے گئے جو ان کی افادی حیثیت کو واضح کر سکتے، اس لیے نہ اساتذہ ان کی تدریس پر پوری توجہ کر سکے اور نہ طلبہ ان سے بقدرِ آرزو فائدہ اٹھا سکے۔ میں نے پیش نظر مجموعے میں اپنی بساط کے مطابق اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں مزید کام ضروری ہے۔ دُعا ہے کہ خدا اسے بھی سرانجام کو پہنچانے کی توفیق عطا فرمائے۔

۷۸۶

مقدمہ

میرزا غالب میرزا اسداللہ بیگ خاں غالب، قوم کے سلجوقی ترک، ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرے میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا، میرزا قوقان بیگ خاں اس زمانے میں سمرقند سے ہندوستان آئے تھے۔ جب سلطنت مغلیہ کے اقبال کا دیا ٹمٹما رہا تھا اور نواب معین الملک عرف میر منّو پنجاب کے ناظم تھے۔ میرزا قوقان بیگ خاں پہلے میر منّو کے پاس ملازم ہوئے، اُن کی وفات پر نظامت پنجاب کا کارخانہ درہم برہم ہو گیا تو دہلی چلے گئے۔ یقینی طور پر معلوم نہیں کہ دہلی ہی میں رہے یا اور کسی جگہ بھی مشغولیت اختیار کی۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ جب شاہ عالم ثانی مرہٹوں کا سہارا لے کر پورب سے دہلی پہنچا اور ذوالفقار الدولہ نجف خاں کے ہاتھ میں اختیارات کی باگ آئی تو میرزا قوقان بیگ خاں کو بلند شہر کے ضلعے میں پہاسو کا تعلقہ ذات اور رسالے کی تنخواہ کے لیے مِل گیا۔ غالباً دہلی ہی میں انھوں نے شادی کی اور متعدد بچے ہوئے۔ ہمیں صرف دو کے نام معلوم ہیں: اول میرزا عبداللہ بیگ خاں عرف میرزا دولھا، دوم میرزا نصراللہ بیگ خاں۔

کچھ معلوم نہیں کہ یہ خاندان دہلی سے آگرے میں کیوں منتقل ہوا؟ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ عبداللہ بیگ خاں کی شادی آگرے کے رئیس خواجہ غلام حسین خاں کمیدان کی صاحبزادی عزت النسا بیگم سے ہوئی تھی اور وہ خانہ داماد کی حیثیت میں وہاں رہنے لگے۔ ان کے تین بچے ہوئے: چھوٹی خانم، میرزا اسداللہ بیگ خاں غالب اور میرزا یوسف خاں۔

عبداللہ بیگ خاں پہلے آصف الدولہ کے پاس لکھنؤ میں ملازم رہے، پھر حیدرآباد چلے گئے، جہاں نظام الملک میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی نے انھیں تین سو سوار کا افسر مقرر کر دیا۔ یہ نوکری چھٹی تو آگرے چلے آئے۔ پھر سواروں کا ایک دستہ لے کر ملازمت کی غرض سے الور پہنچے۔

وہاں ایک لڑائی میں مارے گئے۔ یہ ۱۸۰۳ء کا واقعہ ہے۔ راج گڑھ میں ان کی قبر بنی۔ میرزا غالب نے مہاراجہ الور کے قصیدے میں لکھا ہے:

کافی بود مشاہدہ، شاہد ضرور نیست ‏ ‏ در خاک راج گڑھ پدرم را بود مزار

عبداللہ بیگ خاں کی وفات کے وقت غالب کی عمر صرف پانچ برس کی تھی۔ چھوٹی خانم ان سے بڑی تھیں، میرزا یوسف دو برس چھوٹے تھے۔ ان یتیم بچوں کو ان کے حقیقی چچا میرزا نصراللہ بیگ نے اپنے دامنِ شفقت میں لے لیا۔ وہ پہلے مرہٹوں کی طرف سے آگرے کے صوبہ دار تھے۔ جب انگریز دہلی اور آگرے پر قابض ہو گئے اور صوبیداری کمشنری بن گئی۔ تو لارڈ لیک نے میرزا نصراللہ خاں کو چار سو سواروں کا افسر بنا دیا اور ایک ہزار سات سو روپے ماہانہ تنخواہ مقرر کی۔ پھر میرزا نے سونک اور سونسا کے پرگنے ہلکر سے بزور چھین لیے۔ سونسک اور سونسا آجکل ضلع متھرا میں ہیں۔ لارڈ لیک نے اس کارنامے پر خوش ہو کر دونوں پرگنے نصراللہ بیگ خاں کو دے دیئے۔ اس طرح اُن کی آمدنی لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپے سالانہ ہو گئی۔ لیکن اس واقعہ پر تھوڑی ہی مدت گزری تھی کہ میرزا نصراللہ خاں بھی ۱۸۰۶ء میں اچانک وفات پا گئے۔ اس طرح نہ محض ان کی تنخواہ بند ہوئی، بلکہ سرکار انگلشیہ نے سونک اور سونسا کے پرگنے بھی اپنے قبضے میں لے لیے لیکن میرزا کے پسماندوں کے لیے دس ہزار روپے سالانہ کی پنشن مقرر کر دی۔ پسماندوں میں مرحوم کی والدہ، تین بہنیں، ایک بھتیجی اور دو بھتیجے تھے۔

پنشن میں قطع و برید میرزا نصراللہ بیگ خاں کی شادی نواب احمد بخش خاں والیے فیروز پور جھرکا کی ہمشیر سے ہوئی تھی اور ان کے پسماندوں کی پنشن فیروز جھرکا ہی کی ریاست سے متعلق کر دی گئی تھی۔ نواب نے پہلے دس ہزار روپے کی رقم گھٹا کر پانچ ہزار کی پھر اس پانچ ہزار میں سے دو ہزار روپے کا حصہ دار خواجہ حاجی کو بنا دیا جو میرزا نصراللہ بیگ خاں کے رسالے کا ایک افسر تھا اور میری معلومات کے مطابق اسے میرزا کے خاندان سے کوئی نسبی علاقہ نہ تھا اس لیے پسماندوں میں شمار نہیں ہو سکتا تھا۔ گویا میرزا کے متعلقین کے لیے صرف تین ہزار روپے

سالانہ کی رقم رہ گئی جو بہ صورت ذیل تقسیم ہوئی:

والدہ و ہمشیرگان میرزائے مرحوم	پندرہ سو روپے سالانہ
برادرزادگان میرزائے مرحوم	
میرزا غالب اور میرزا یوسف)	پندرہ سو روپے سالانہ

غرض میرزا غالب کو محض ساڑھے سات سو روپے سالانہ یا ساڑھے باسٹھ روپیہ ماہانہ ملتے تھے۔

ابتدا میں غالب یا ان کے عزیزوں میں سے کسی نے اِس قطع و برید کے خلاف اعتراض نہ کیا۔ اس کی کئی وجہیں ذہن میں آتی ہیں۔ مثلاً گھر میں کوئی بالغ مرد نہ تھا جو اصل مطالبے کا تعاقب کرتا۔ نواب احمد بخش خاں کے ساتھ قریبی رشتہ تھا، اس لیے ان کے خلاف مقدمہ کھڑا کرنا غیر مناسب سمجھا گیا۔ نواب موصوف مقررہ پنشن کے علاوہ بھی اِن لوگوں کو کچھ رقمیں دیتے رہتے تھے، اس لیے قانونی کارروائی خلاف تقاضائے احسان نظر آئی۔ میرزا غالب کے نانا بڑے رئیس تھے۔ ان کی زندگی میں میرزا یا اُن کے متعلقین کو روپے پیسے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ ممکن ہے اس وجہ سے بھی کوئی قدم نہ اُٹھایا گیا ہو۔ سب سے آخر میں یہ کہ پہلی رشتہ داری کی بنا پر خود میرزا کی شادی نواب احمد بخش خاں کی بھتیجی سے ہو گئی۔ اس طرح وہ احمد بخش خاں کے ہم خاندان بن گئے تھے۔

جب میرزا آگرے کو چھوڑ کر دہلی میں مقیم ہو گئے تو ان کا امیرانہ ٹھاٹھ بدستور قائم رہا لیکن آمدنی کے وسائل گھٹتے گئے، یہاں تک کہ وہ قرضدار ہو گئے۔ نیز احمد بخش خاں نے اپنی جایداد کو بیٹوں میں تقسیم کر کے کاروبارِ ریاست سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس وقت میرزا غالب کو خاندانی پنشن کے سلسلے میں چارہ جوئی کا خیال آیا۔ میرا خیال ہے کہ اس کے لیے اُن کی بیوی اور بعض دوسرے متعلقین محرک ہوئے، جنھیں نواب احمد بخش خاں کے فرزند اکبر شمس الدین خاں سے اختلاف تھا۔ شمس الدین خاں ایک فریق تھا، باقی سارا خاندان مخالف فریق تھا۔ اس میں غالب کو بھی شامل ہونا پڑا۔ اِسی پنشن کے سلسلے میں غالب نے ۱۸۲۷ء میں کلکتہ کا سفر اختیار کیا جو اس زمانے میں حکومتِ انگلشیہ

کام کرتا تھا۔ ان کا دعوٰے یہ تھا:

۱- دس ہزار روپے کی جو رقم ابتدا میں مقرر ہوئی تھی، اسے بحال کیا جائے۔

۲- خواجہ حاجی کو میرزا نصراللہ بیگ خاں کے پس ماندوں میں شامل کر کے دو ہزار روپیہ سالانہ دینے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ یہ رقم نیز پانچ ہزار سالانہ کی گھٹائی ہوئی رقم ۱۸۰۶ء سے لے کر یک مشت ادا کی جائے۔

۳- آیندہ کے لیے پنشن کو فیروزپور جھرکا کی ریاست سے متعلق نہ رکھا جائے بلکہ سرکار انگلشیہ کے خزانے سے متعلق کر دیا جائے۔

یہ دعوٰے ریاست فیروزپور جھرکہ کے خلاف تھا جس کے والی نواب احمد بخش خاں کے فرزند اکبر نواب شمس الدین احمد خاں بن گئے تھے۔ اُن کی طرف سے یہ جواب دعویٰ پیش ہُوا کہ دس ہزار روپے کی پنشن میں نصف کی تخفیف اور بقیہ رقم میں خواجہ حاجی کا شمول لارڈ لیک کے حکم سے ہُوا جو ابتدائی پنشن مقرر کرنے کے ذمہ دار تھے۔ مقدمہ خاصی دیر تک جاری رہا۔ میرزا غالب لارڈ لیک کے دوسرے حکم سے بالکل بے خبر تھے اور کہتے تھے کہ اگر یہ حکم جاری بھی ہُوا تو خلاف قاعدہ تھا اور اس کا کوئی ریکارڈ دفتر میں موجود نہیں، نہ کسی بڑے یا چھوٹے حاکم کا کوئی ذاتی حکم سرکار کے منظور شدہ حکم کا ناسخ ہو سکتا ہے۔ آخر حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ لارڈ لیک کا دوسرا حکم سر جان میلکم کے پاس بھیج کر پوچھا جائے کہ آیا اس پر مہر اور دستخط لارڈ موصوف ہی کے ہیں؟ سر جان میلکم پنشن کے تقرر کے زمانے میں لارڈ لیک کے سکرٹری تھے۔ انھوں نے مہر اور دستخط کی تصدیق کر دی تو یہ حکم صحیح تسلیم کر لیا گیا اور میرزا غالب کا دعویٰ خارج ہو گیا۔ اِس طرح انھیں ساڑھے سات سو روپے سالانہ پر قناعت کرنی پڑی۔

شادی اور دہلی میں توطن میرزا غالب کی شادی تیرہ برس کی عمر میں نواب احمد بخش خاں کے بھائی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی چھوٹی صاحبزادی امراؤ بیگم سے ہوئی۔ اِس تعلق کی بنا پر وہ پندرہ سولہ برس کی عمر میں آگرے کی سکونت چھوڑ کر دہلی میں مقیم ہو گئے اور باقی زندگی اسی

شہر میں گزاری۔ اُن کے بھائی میرزا یوسف بھی آگرے سے دہلی آگئے تھے۔ وہ دیوانے ہو گئے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں بحالتِ دیوانگی فوت ہوئے۔ بیگم کی وجہ سے نواب احمد بخش خاں کا خاندان میرزا کا اپنا خاندان بن چکا تھا۔ اس کے مختلف افراد کی اجمالی کیفیت یہ ہے:

۱۔ نواب غلام حسین خاں مسرورؔ، جو میرزا کے ہم زلف یعنی امراؤ بیگم کی بڑی بہن آبادی بیگم کے شوہر تھے۔

۲۔ میرزا زین العابدین خاں عارفؔ ابن غلام حسین مسرورؔ، جنھیں امراؤ بیگم نے اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔ وہ ۱۸۵۲ء میں بہ حالت جوانی فوت ہوئے۔

۳۔ باقر علی خاں کاملؔ اور حسین علی خاں شاداںؔ ابناء زین العابدین خاں عارفؔ۔ حسین علی خاں شاداں کو بیگم غالب بچپن ہی میں اپنے پاس لے آئی تھی۔ عارف کی وفات کے بعد باقر علی خاں بھی میرزا کے پاس آگئے۔ یہ میرزا کی زندگی میں الور میں ملازم ہو گئے تھے۔ میرزا کی وفات کے بعد ملازمت چھوڑ کر گھوڑوں کی تجارت شروع کر دی اور جوانی میں فوت ہو گئے۔ حسین علی خاں میرزا کی وفات کے بعد رام پور میں پچیس روپے کے ملازم ہو گئے تھے۔ اپنے بڑے بھائی کی وفات کے بعد یہ بھی چل بسے۔

۴۔ علی بخش خاں رنجورؔ ابن الٰہی بخش خاں معروفؔ یعنی بیگم غالب کے حقیقی بھائی۔ ابتدا میں انھیں فیروز پور جھرکا سے سو روپے پنشن ملتی تھی، جو ریاست سے ضبطی کے بعد آدھی رہ گئی۔ غدر کے بعد یہ دہلی سے باہر رہے۔ ۱۸۶۴ء میں فوت ہوئے۔ ان کے بیٹے غلام فخر الدین خاں بہادر شاہ ثانی کی جاگیر کوٹ قاسم کے منتظم تھے۔ غدر کے بعد ان پر مقدمہ چلا لیکن بری ہو گئے۔ ان کی شادی میرزا کے بھائی یوسف خاں کی اکلوتی بیٹی سے ہوئی تھی۔ ان کے بیٹے محمد سعید خاں حیدر آباد چلے گئے تھے۔ کئی برس کی ملازمت کے بعد درویشی اختیار کر لی۔ ان کے بیٹے میرزا نصر اللہ خاں بیرسٹر ایٹ لاء دولت آصفیہ میں صدر محاسب بن گئے تھے۔ معروف کے دیوان کی پہلی جلد انھیں نے شائع کی تھی۔

۵۔ نواب شمس الدین احمد خاں (نواب احمد بخش خاں کے فرزند اکبر)۔ ریاست

فیروزپور جھرکا کے والی بنے۔ وہ چھوٹے بھائیوں سے ان کا جھگڑا ہوگیا، جنھیں نواب احمد بخش خاں نے لوہارو کی جاگیر دے دی تھی۔ شمس الدین احمد خاں چاہتے تھے کہ لوہارو میں بھی ان کا انتظام ہو اور چھوٹے بھائیوں کو ایک مقررہ رقم ملتی رہے۔ انتظام ریاست سے کوئی سروکار نہ ہو۔ بھائی کہتے تھے کہ لوہارو کے علاوہ والد کی منقولہ جایداد میں سے بھی حصّہ ملنا چاہیئے۔ یہ جھگڑا دیر تک چلتا رہا۔ آخر ولیم فریزر ریزیڈنٹ دہلی کی کوشش سے لوہارو چھوٹے بھائیوں کو مل گیا۔ اس وجہ سے شمس الدین احمد خاں اور ولیم فریزر کے درمیان دشمنی پیدا ہوگئی۔ جس نے عام شہرت حاصل کرلی۔ ۱۸۳۵ء میں فریزر مارا گیا اس کے قتل کا الزام شمس الدین احمد خاں اور ان کے ایک ملازم پر لگا۔ دونوں کو پھانسی ملی اور ریاست ضبط ہوگئی۔

۶۔ امین الدین احمد خاں: نواب احمد بخش خاں کے منجھلے فرزند، جنھیں لوہارو کا والی تسلیم کیا گیا۔ یہ ۱۸۶۹ء میں فوت ہوئے۔ نواب علاء الدین احمد خاں علائی (غالب کے خلیفہ ثانی) انھیں کے فرزند اکبر اور جانشین تھے۔ علائی نے ۱۸۸۴ء میں وفات پائی اور ان کے فرزند اکبر نواب امیر الدین احمد خاں رئیس بنے۔ جن کا دوسرا نام فرخ میرزا تھا اور غالب انھیں فرخ سیر کہا کرتے تھے۔

۷۔ ضیاء الدین احمد خاں نیر: نواب احمد بخش خاں کے فرزند اصغر، جنھیں لوہارو سے حصے کی رقم ملا کرتی تھی۔ اُردو اور فارسی کے ادیب اور شاعر تھے۔ اُردو میں نیر اور فارسی میں رخشاں تخلص تھا۔ تاریخ کے یگانہ عالم تھے۔ ایلیٹ نے اپنی تاریخ مرتب کرنے وقت زیادہ تر نادر قلمی نسخے انھیں سے لیے تھے۔

۸۔ شہاب الدین احمد خاں ثاقب۔ نیر کے فرزند اکبر۔ ۱۸۶۹ء میں فوت ہوئے۔ ان کے تین بیٹے تھے: (۱) شجاع الدین احمد خاں تاباں، جن کی شادی باقر علی خاں کامل کی بڑی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ وہ لاولد فوت ہوئے (۲) سراج الدین احمد خاں سائل جن کا انتقال چند سال پیشتر ہوا۔ (۳) بہاء الدین احمد خاں۔ ان کی صرف ایک صاحبزادی تھی جن کی شادی نواب سر ذوالفقار علی خاں مرحوم رئیس مالیر کوٹلہ سے ہوئی۔ یہ صاحبزادی یعنی بیگم ذوالفقار علی خاں

بفضلِ خدا زندہ ہیں۔

۹۔ سعید الدین احمد خاں طالب: (نیر کے فرزند اصغر) لاولد فوت ہوئے۔

شغل شعر و ادب میرزا غالب نے معمول کے مطابق عربی اور فارسی کی تعلیم پائی۔ گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنے لگے۔ اردو ان کی مادری زبان تھی، اس لیے کہ ان کی والدہ ہندوستانی تھیں۔ فارسی اس عہد کی مروجہ تعلیمی زبان تھی۔ جس طرح بعد میں انگریزی تعلیمی زبان بنی۔ ترکی بھی ان کے گھر کی ایک بولی تھی۔ خواجہ حالی نے لکھا ہے کہ ان کے دادا کی زبان ترکی تھی اور ہندوستانی بہت کم سمجھتے تھے۔ والد اور چچا بھی یقیناً ترکی جانتے ہوں گے اور میرزا بھی اس سے ناواقف نہ ہوں گے۔ وہ تیرہ چودہ برس کے تھے۔ جب ایک نومسلم پارسی بطرزِ سیاحت آگرے پہنچا اور کم و بیش دو برس میرزا کے ہاں ٹھہرا رہا۔ اس کا اصل نام ہرمزد تھا، مسلمان ہونے کے بعد عبد الصمد نام اختیار کیا۔ یہ فارسی اور عربی کا اجل فاضل اور منطق و فلسفہ کا یگانہ ماہر تھا۔ خصوصاً قدیم فارسی کے حقائق و غوامض پر اسے پورا پورا عبور حاصل تھا۔ اسی عبد الصمد کی تعلیم نے میرزا کے طبعی جوہروں کو جلا دے کر روشن کر دیا۔ مروجہ تعلیم کے سوا انھوں نے جو کچھ سیکھا، عبد الصمد ہی سے سیکھا۔

شاعری کا جوہر انھیں مبدار فیاض سے ملا تھا۔ طبیعت مشکل پسند تھی۔ میرزا عبد القادر بیدلؔ کا کلام پڑھا تو اردو میں بیدلؔ ہی کے رنگ میں شعر کہنے لگے۔ اس دور کا کلام "نسخۂ حمیدیہ" کے نام سے چھپ چکا ہے، اس کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شروع میں بیدلؔ میرزا کے دل و دماغ پر بے طرح مسلّط تھا۔ انھوں نے مختلف غزلوں کے مقطعوں میں اس کا اظہار بھی کر دیا ہے جیسے جیسے طبیعت میں پختگی آتی گئی، طرزِ فکر و نظر بدلتی یا کہنا چاہیے کہ منجھتی اور صاف ہوتی گئی۔ پھر وہ فارسی گوئی پر متوجہ ہو گئے۔ یہاں تک کہ دورِ متوسط میں وہ اردو کے بجائے فارسی ہی کے شاعر سمجھے جاتے تھے۔

دہلی میں اقامت گزیں ہونے کے بعد شاعروں کے عام طریقے کے مطابق انھوں نے شاہی دربار سے بھی تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ وہ عرفی اور نظیری کے ہم پایہ تھے۔ لیکن ان کے زمانے

کا شاہی دربار مغلوں کی سطوت و شوکت کا محض ایک بے رنگ نقش رہ گیا تھا، اس لیے میرزا کا کمال شاعری جس قدر دانی و منزلت شناسی کا حقدار تھا وہ اسے نصیب نہ ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ اکبر شاہ ثانی کی مدح میں وہ ایک قصیدہ کہہ کر چپ ہو گئے۔ ۱۸۳۷ء میں ابو ظفر سراج الدین تخت نشین ہوا تو اس کی مدح میں قصیدوں پر قصیدے کہنے لگے۔ ان قصیدوں کے محرک غالباً وہ لوگ تھے جو میرزا کے دوست تھے اور دربار میں انھیں خاصا رسوخ حاصل تھا۔ انھیں میں سے شیخ نصیر الدین عرف کالے صاحب (بہادر شاہ کے پیر) اور حکیم احسن اللہ خاں کی سفارش سے ۱۸۵۰ء میں میرزا کو تیموری خاندان کی تاریخ لکھنے کا کام سونپا گیا۔ نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ خطاب ملا اور پچاس روپے مہینہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ پوری تاریخ کا نام "پرتوستان" تھا۔ اس کی دو جلدیں تجویز ہوئیں۔ جلد اول میں ابتدائے آفرینش سے ہمایوں بادشاہ تک کا حال، جلد دوم میں جلال الدین اکبر سے بہادر شاہ ثانی تک کا حال۔ پہلی جلد کا نام "مہر نیمروز" اور دوسری جلد کا نام "ماہ نیم ماہ" قرار پایا۔ میرزا نے پہلی جلد ۱۸۵۲ء میں پوری کر دی، دوسری کی تسوید و ترتیب شروع ہی نہ ہو سکی۔

دربار شاہی کے ساتھ تعلق کے زمانے میں میرزا نے اپنی اکثر بہترین اردو غزلیں کہیں۔ اس لیے کہ قلعے میں مشاعرے ہوتے تھے جن میں میرزا کو شریک ہونا پڑتا تھا۔ بہادر شاہ ویسے بھی اردو غزلیں طلب کرتے رہتے تھے جیسا کہ خود میرزا نے ۱۸۵۱ء کے ایک خط میں منشی نبی بخش حقیر کو لکھا ہے۔ مغلوں کی حکمرانی کے تمام مناصب انگریزوں کے قبضہ میں چلے گئے تھے۔ میرزا کے پاس شعر گوئی کے سوا کوئی ہنر نہ تھا۔ اس لیے انگریز حاکموں اور ملکہ وکٹوریہ کی مدح میں بھی انھوں نے قصیدے کہے۔ ایک قصیدے میں کس درد و سوز کے ساتھ کہتے ہیں:

باصیبم فتادہ کار بہ دہر علم کاویاں نے حواہم

انھوں نے چند قصیدے متفرق امرا کی مدح میں بھی کہے۔ مثلاً نصیر الدین حیدر، امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ والیان اودھ، نواب یوسف علی خاں و نواب کلب علی خاں والیان رام پور۔

سر سالار جنگ وزیرِ اعظم حیدرآباد، نواب وزیر الدولہ والیے ٹونک، راجہ شیو دھیان سنگھ مسند نشین الور، مہاراجہ نرندر سنگھ والیے پٹیالہ۔ چند قصیدے دوستوں کی مدح میں ہیں مثلاً نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ، مفتی صدرالدین آزردہ، نواب ضیاالدین احمد خاں نیر۔ ان قصیدوں کا مدعا میرزا غالب کی اصطلاح خاص میں محض "بھٹئی" نہ تھا، بلکہ قصیدہ گوئی کمالاتِ شاعری کی نمایش کا ایک متداول ذریعہ تھی۔

خاندانی پنشن کے علاوہ میرزا سات برس تک قلعے سے تنخواہ پاتے رہے۔ انھیں مختلف امرا کی طرف سے صلے ملے ہوں گے۔ نواب یوسف علی خاں والیے رام پور نے مستقل تنخواہ مقرر کر دی تھی جو اُن کے جلیل القدر فرزند نواب کلب علی خاں کے عہدِ حکومت میں بھی جاری رہی۔

قاطع برہان کا ہنگامہ اور وفات میرزا کو ہندوستان کے عام فارسی شعرا کی طرز و روش پسند نہ تھی، نہ انھیں مستند مانتے تھے۔ کلکتہ کے ایک اجتماع میں اُن کے کلام پر اعتراض ہوئے اور معترضین نے میرزا قتیل کی سند پیش کی تو میرزا نے قتیل کی سند کو بے پروائی سے ٹھکرا دیا۔ اس پر ہنگامہ بپا ہوا اور میرزا نے معذرت کے طور پر مثنوی "بادِ مخالف" لکھی۔ اس میں ایک جگہ فارسی کے مشہور اساتذہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

آنکہ طے کردہ ایں مواقف را　　　چہ شناسد قتیل و واقف را

ایک غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں:

غالب سوختہ جاں راچہ بہ گفتار آری　　　بہ دیارے کہ ندانند نظیری ز قتیل

غدر کے زمانے میں ان کے پاس فارسی لغات کی کتاب "برہان قاطع" (مؤلفہ محمد حسین تبریزی ثم دکنی) کے قلمی نسخے کے سوا کوئی کتاب نہ تھی۔ غدر کے حالات میں "دستنبو" لکھنے سے فارغ ہوئے تو "برہان قاطع" کو دیکھنے لگے۔ اس میں جو غلطیاں آئیں، اُن پر نشان لگاتے رہے۔ پھر ایک کتاب مرتب کر دی۔ جس کا نام ردِّ "برہان قاطع" کی مناسبت سے "قاطع برہان" رکھا۔ یہ فارسی کے ہندوستانی لغت نگاروں کو کھلا چیلنج تھا۔ "قاطع برہان" کے رد و اثبات میں کئی

کتابیں لکھی گئیں اور میرزا کی زندگی کے آخری دم تک تغلیط و توثیق کا ہنگامہ گرم رہا۔ "قاطع برہان" کو بعض فوائد کے اضافے کے ساتھ انھوں نے دوبارہ چھپوایا۔ تو اس کا نام "درفش کاویانی" رکھا تھا۔

تہتر برس، تین مہینے اور ۲۳ دن کی عمر پاکر۔ میرزا ۱۵۔ فروری ۱۸۶۹ء (۲ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ) کو اس خاکداں سے رہ گرائے عالمِ بقا ہوئے۔ بیگم نے پورے ایک برس بعد انتقال کیا۔

میرزا کے سات بچے ہوئے۔ لیکن کوئی پندرہ مہینے سے زیادہ زندہ نہ رہا۔ صرف ان کا کلام بقائے نام اور شہرت عام کی دستاویز رہ گیا۔

تصانیف میرزا کی تصانیف کا مختصر سا نقشہ یہ ہے:

(۱) **کلیات نظم فارسی**: اس میں قطعات، ترکیب بند، ترجیع بند، مثنویاں، قصیدے، غزلیں اور رباعیاں وغیرہ سب شامل ہیں۔

(۲) **کلیات نثر فارسی**: اس میں میرزا کی تین کتابیں شامل ہیں (۱) "پنج آہنگ" جو فارسی کے قواعد، تقریظوں اور فارسی خطوں پر مشتمل ہے (۲) "مہر نیمروز" یعنی تاریخ خاندان تیموری (۳) "دستنبوئے" جس میں غدر کے دیدہ و شنیدہ حالات درج ہیں۔ دستنبوئے خالص فارسی میں ہے اور اس میں عربی کا ایک لفظ بھی نہیں آیا۔

(۳) **دیوان اُردو**۔ اس کے تین اڈیشن صرف میرزا کی زندگی میں شائع ہو چکے تھے۔ بعد میں بیسیوں اڈیشن چھپے اور متعدد شرحیں لکھی گئیں۔

(۴) **نسخہ حمیدیہ**: میرزا کے ابتدائی اُردو کلام کا مجموعہ جسے وہ قلم انداز کر چکے تھے

(۵) **سبد چیں**: میرزا کا وہ فارسی کلام جو کلیات نظم فارسی میں شامل نہ ہو سکا یا کلیات کی طباعت کے بعد کہا گیا۔

(۶) **عودِ ہندی**: اُردو خطوط کا وہ مجموعہ جو میرزا کی وفات سے چار ماہ پیشتر میرٹھ میں چھپا تھا

(۷) **اُردوئے معلّیٰ حصہ اوّل**: اردو خطوط کا وہ مجموعہ جو میرزا کی زندگی میں مرتب ہوا۔

دہلی میں چھپ رہا تھا۔ لیکن میرزا کی وفات کے بعد مکمل ہوا۔

(۸) **اُردوئے معلیٰ حصہ دوم**: جو اُردو خطوط پہلے حصے میں شامل نہیں ہوئے تھے اُن کا ایک مجموعہ خواجہ حالی نے مرتب کر کے مطبع مجتبائی کے حوالے کر دیا تھا۔ ۱۸۹۹ء میں یہ بھی حصہ اوّل کے ساتھ شایع ہو گیا۔

(۹) **نادر خطوط غالب**: میرزا کے ستائیس اُردو مکاتیب کا مجموعہ جو کرامت حسین کرامت ہمدانی بہاری، صفیر بلگرامی اور صوفی منیری کو لکھے گئے تھے۔ میرے نزدیک اِن میں سے بعض خطوں کا مستقل وجود محل نظر ہے۔

(۱۰) **مکاتیب غالب**: میرزا کے ان خطوں کا مجموعہ جو والیان رام پور کو لکھے گئے۔

(۱۱) **متفرقات غالب**: میرزا کے فارسی نظم و نثر کے تبرکات

(۱۲) **نادرات غالب**: میرزا کے ان خطوط کا مجموعہ جو منشی نبی بخش حقیر کو لکھے گئے تھے۔

(۱۳) **انتخاب غالب**: اردو اور فارسی اشعار کا وہ انتخاب جو میرزا نے نواب کلب علی خاں والی رام پور کی فرمایش پر کیا تھا۔ یہ بھی دربار رام پور کی توجہ سے چھپ گیا ہے۔

(۱۴) **قاطع برہان**: جسے بعض فوائد کے اضافے کے ساتھ دوبارہ "درفش کاویانی" کے نام سے چھاپا گیا۔

(۱۵) **نامہ غالب**: "قاطع برہان" کی بحث کے سلسلے کا وہ طویل خط جو میرزا رحیم بیگ مولف "ساطع برہان" کے نام لکھا گیا تھا۔ الگ بھی چھپ گیا تھا۔ "اُودھ اخبار" میں بھی شایع ہوا تھا۔ "عود ہندی" میں بھی شامل ہو گیا تھا۔

(۱۶) **تیغ تیز**: "قاطع برہان" کی بحث کے سلسلے کا ایک اُردو رسالہ۔

(۱۷) **نکات و رقعات غالب**: اس میں "پنج آہنگ" سے فارسی قواعد والے حصے کا اردو ترجمہ کر کے پندرہ فارسی خطوط شامل کر دیے گئے تھے۔

(۱۸) **قادر نامہ**۔ بچّوں کے نصاب کی کتاب۔

(۱۹) **لطائفِ غیبی:** "قاطع برہان" کی بحث کے سلسلے کی ایک کتاب جو سیف الحق میاں داد خاں سیّاح کے نام سے چھپی۔

(۲۰) **سوالاتِ عبدالکریم:** یہ بھی قاطع برہان کے سلسلے کا ایک رسالہ ہے جو عبدالکریم کے نام سے چھپا لیکن دراصل میرزا نے لکھا تھا۔

(۲۱) **گلِ رعنا:** میرزا نے اپنے عزیز دوست سراج الدین احمد کی فرمائش پر اردو اور فارسی کلام کا ایک انتخاب مرتب کیا تھا۔ اس کا نام "گلِ رعنا" رکھا تھا۔ اس کا صرف ایک حصہ مولانا حسرت موہانی کے پاس تھا، جب کہ ایک مرتبہ مرحوم نے خود بتایا۔

میرزا کا مقام ادب و شعر میں

ادب و شعر میں میرزا کی رفعت و برتری اب کسی شرح کی محتاج نہیں رہی۔ جامعیت ان کی نمایاں ترین خصوصیت ہے۔ بے شائبہ ریب ہندوستان نے امیر خسرو کے بعد ان جیسا جامع شخص پیدا نہیں کیا۔ وہ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں کے یگانہ شاعر تھے۔ حافظ اور نظیری کی طرح محض غزل ہی میں نہیں، عرفی کی طرح محض غزل اور قصیدے ہی میں نہیں بلکہ تمام اصناف سخن میں ان کی رفعت مرتبت سب کے نزدیک مسلّم ہے۔ غزل، قصیدہ، رباعی، مثنوی، ترکیب بند، ترجیع بند، قطعہ، مرثیہ، نوحہ وغیرہ کوئی صنف نظم نہیں، جس میں ان کا پایہ یکساں بلند اور مختلف صناف کے مشاہیر اساتذہ کے برابر نہ ہو۔ اُردو نظم میں اگرچہ ان کا کلام تھوڑا ہے لیکن جتنا ہے ہر لحاظ سے اُردو زبان کا گراں بہا ترین سرمایہ ہے۔ پھر میرزا فارسی نثر کے یگانہ ادیب تھے۔ فارسی کلیات نثر میں ہر رنگ اور ہر انداز کی نثریں موجود ہیں۔ ابوالفضل کا سرمایہ شہرت صرف نثر نگاری تھا۔ میرزا نثر میں اس سے پیچھے نہیں ہیں اور نثر نگاری ان کے کمالات فطری کی بہار آفرینی کا محض ایک کرشمہ ہے۔ اُردو نثر میں ان کے صرف مکاتیب ہیں، یا چند تقریظیں اور دیباچے۔ لیکن حسن کلام، لطف بیان، روانی و انسجام، بے ساختگی اور دل آویزی میں نثر کا ایسا جلیل الشان مجموعہ نہیں مل سکتا۔

اگر میرزا کے خداداد جوہروں کا اندازہ اس بنا پر کیا جائے کہ زندگی میں انھیں شعر و ادب

کے ذریعہ سے کس قدر مالی منافع حاصل ہوئے یا انھوں نے کون کون سے اعزازات پائے تو لاریب خود ان کی زبان مستعار لے کر کہنا پڑے گا:

ور آں دیار کہ گوہر خریدن آئین نیست ۔۔۔ دکان کشودہ ام و قیمت گہر گویم

یا

بہ کلبہ ام گہر شب چراغ خس پوش است ۔۔۔ سخن ز تیرگی طالع ہنر گویم

لیکن اگر ان کی شہرت و ناموری اور وفات کے بعد روز افزوں قدر و منزلت کو سامنے رکھا جائے تو تسلیم کرنا چاہیے کہ علاّمہ اقبال مرحوم کو چھوڑ کر اُردو زبان کے کسی شاعر کو عقیدتِ عامہ کی ویسی گراں بہا متاع نصیب نہیں ہوئی، جو میرزا کے حصے میں آئی۔ انھوں نے خود پیشین گوئی کی تھی:

کوکبم را در عدم اوج قبولے بودہ است ۔۔۔ شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

غالب کی اُردو نثر

بلا شبہ ان کے مختصر سے اُردو دیوان کی بہت قدر ہوئی۔ جسے وہ "بے رنگ" اور "درزم بوگے زنگستان فرہنگ" کہتے تھے لیکن فارسی پر قطعاً توجہ نہ ہوئی۔ جسے وہ "نقشہائے رنگ رنگ" کا نگار خانہ قرار دے رہے تھے۔ اب فارسیت کا ذوق اتنا کم ہو گیا ہے اور ادبی فکر و نظر کا رُخ اس طرح بدل گیا ہے کہ شاید ہی میرزا کی فارسی پر توجہ کی نوبت آئے۔ لیکن کتنے افسوس کا مقام ہے کہ ان کی اُردو نثر بھی اب تک ٹھیک مرتب نہ ہو سکی۔ اُردوئے معلّٰی اور عودِ ہندی اگرچہ نصاب میں بھی شامل ہیں۔ ان کے کئی اڈیشن بھی شائع ہوئے لیکن ان رُقعات کو تاریخ وار مرتب کرنے کا خیال کسی کو نہ آیا۔

یہاں یہ بحث چھیڑنے کی ضرورت نہیں کہ غالب کے اُردو دیوان کے ساتھ بہ درجۂ غایت شغف و شیفتگی نے ملک میں شعر کا صحیح ذوق پیدا کیا یا نہیں لیکن اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کے اُردو مکاتیب نثر نگاری کا صالح اور صحیح مذاق پیدا کرنے کے لیے بے حد مفید ثابت ہو سکتے تھے۔ ان میں ہر درجے اور ہر رنگ کی تحریریں موجود تھیں۔ ایسی بھی جو بچّوں کو بے تکلف پڑھائی

جا سکتی تھیں اور ایسی بھی جو دقیق علمی اور ادبی نکات کی حامل تھیں اور صرف اہلِ علم ہی ان سے محظوظ ہو سکتے تھے۔ پھر ان میں رنگ رنگ کے مطالب بیان ہوتے تھے اور ہر قسم کی تحریروں کے نمونے ملتے تھے لیکن تعجب ہے کہ انھیں صرف رسمی خطوط سمجھ لیا گیا اور اس لحاظ سے نہ دیکھا گیا کہ ان میں صحیح مذاقِ نگارش کی پرورش کے کتنے جوہر موجود ہیں۔ وہ اگر محفوظ رہے تو زیادہ تر اس لیے کہ ایک باکمال اور شہرۂ آفاق شاعر کے تبرکات تھے، اس لیے نہیں کہ بجائے خود محفوظ رہنے اور فروغ پانے کے حقدار تھے۔

تین ضروری کام ان مکاتیب کی ترتیب و تدوین کے سلسلے میں تین کام ضروری تھے

(۱) خطوط کو نگارش کی تاریخوں کے لحاظ سے مرتب کیا جاتا تاکہ مختلف مباحث و مطالب تاریخی ترتیب پاکر زیادہ حظ انگیز اور دل پذیر بن جاتے، نیز مکتوب الیہم کے حالات اختصار کے ساتھ لکھ دیے جاتے تاکہ میرزا کے ساتھ ان کا تعلق واضح ہو جاتا۔

(۲) مکاتیب میں قدم قدم پر ایسے اشارے موجود تھے جو شرح کے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتے تھے۔ میرزا نے مکتوب الیہ کے علم و نظر کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے محض اشارے کر دینا کافی سمجھا لیکن ہمارے لیے وہ سراسر یا بیشتر مبہم بن چکے تھے۔ جب تک انھیں کھول کر نہ بیان کیا جاتا، مختلف عبارتوں کا پورا مطلب ٹھیک ٹھیک ذہن میں نہیں آسکتا تھا اور نہ خوانندہ ان سے ٹھیک ٹھیک لذت اندوز ہو سکتا تھا۔ اس بنا پر حواشی لکھنے ضروری تھے۔

(۳) تیسرے یہ کہ میرزا کی خصوصیاتِ نگارش اور لطائفِ تحریر کو تفصیلاً نہیں تو کم از کم اجمالاً بیان کر دیا جاتا۔

مدت ہوئی میں نے یہ کام شروع کر دیا تھا۔ جب معلوم ہوا کہ منشی مہیش پرشاد پروفیسر بنارس یونیورسٹی خطوطِ غالب مرتب کر رہے ہیں اور انھوں نے ارادہ کر لیا ہے کہ تمام خطوں کا مقابلہ حتی الامکان اصل خطوں سے کریں گے تو میں نے اپنا کام روک دیا۔ اس لیے کہ جو وسائلِ تحقیق و تقابل منشی صاحب کو میسّر تھے وہ مجھے میسّر نہیں تھے اور جب ایک کام بہتر طریق پر انجام پا

رہا تھا تو اسے کمتر پیمانے پر انجام دینے کے لیے وقت صرف کرنا بالکل غیر مناسب تھا۔ چنانچہ منشی صاحب کے مرتبہ خطوط کی پہلی جلد ہندوستانی اکیڈیمی نے شائع کر دی۔ پھر یہ سلسلہ غیر معلوم وجوہ کی بنا پر تعطل میں پڑ گیا۔ گویا اصل کام پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔

منشی مہیش پرشاد کا مجموعہ منشی مہیش پرشاد صاحب کی کاوش مستحق صد ستایش ہے لیکن ان کا جو مجموعہ چھپا، وہ بھی غلطیوں سے پاک نہ تھا، جیسا کہ پیش نظر مجموعے کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہو جائے گا۔ پھر ان کا مرتبہ مجموعہ مکمل نہ چھپا اور کام ادھورا رہ گیا۔ نیز منشی صاحب نے نہ حواشی لکھے، نہ مکتوب الیہم کے حالات پر توجہ فرمائی اور نہ غالب کی خصوصیات نگارش پیش کیں۔ غالباً انھوں نے یہ کام آیندہ کے لیے اُٹھا رکھے تھے۔

غرض برسوں کے انتظار کے بعد پھر یہ خیال آیا کہ اپنی سمجھ اور فہم کے مطابق جو کچھ ہو سکتا ہے کر دینا چاہیے۔ ممکن ہے زیادہ بالغ نظر اور ذی وسائل اہل علم ادھر متوجہ ہوں تو اُن کے لیے کڑی منزل میں کسی قدر سہولت پیدا ہو جائے۔ چنانچہ یہ مجموعہ مرتب کر دیا اور جتنے متفرق خطوط مل سکے وہ بھی اس مجموعے میں شامل کر دیے تاکہ غالب کی زیادہ سے زیادہ نثر یک جا ہو جائے۔ "اردوے معلّٰی" اور "عودِ ہندی" کی تقسیم میں نے توڑ دی اور سارے خطوط کو اکٹھا کر دیا۔ آخر میں "نامہ غالب" اور "تقریظیں" لگا دیں۔

مشکلاتِ کار یہ کام سخت مشکل تھا، خصوصاً میرے لیے جس کے وسائل تحقیق ویسے بھی محدود تھے اور ملک کی تقسیم کے باعث ہر مقام پر پہنچنا اور ہر ماخذ سے فائدہ اُٹھانا سہل نہیں رہا تھا۔

غالب کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ عام خطوں پر تاریخیں اہتمام کے ساتھ درج کرتے تھے بلکہ اکثر ہجری اور عیسوی دونوں تاریخیں لکھتے تھے۔ بعض اوقات دن اور وقت تک بھی درج کر دیتے تھے۔ جب خطوں کو طباعت کے لیے جمع کیا گیا تو میرا خیال ہے کہ اول مکتوب الیہم نے جیسی بے ترتیبی سے رکھ چھوڑے تھے، ویسے ہی اُٹھا کر بھیج دیے اور اسی بے ترتیبی میں وہ نقل ہو گئے۔ پھر جا معین مکاتیب نے تاریخوں کو عموماً غیر ضروری سمجھ کر حذف کر دیا یا نقل و کتابت میں برابر غلطیاں ہوتی

رہیں ۔ اس وجہ سے کچھ کم ایک صدی بعد انھیں تاریخ وار مرتب کرنا آسان نہ رہا ۔ جن خطوں میں مختلف مطالب درج ہوئے تھے، اِن کو تو غائر نظر سے دیکھنے کے بعد ہر لحاظ سے یقینی نہیں تو اقرب الی الصواب تاریخ نکال لینا ایک حد تک ممکن تھا لیکن جو خطوط سراپا علمی تھے اور ان میں کوئی ایسی بات درج نہیں ہوئی تھی جسے مقابلے کے لیے سہارا بنایا جا سکتا، ان کی تاریخیں نکالنے کی کوئی صورت نہ تھی ۔ بہ ہر حال ان مشکلات کے باوجود جو کام انجام پایا، وہ آپ کے سامنے ہے ۔ اُمید ہے کہ پورا نہیں تو بیشتر درست ہو گا ۔

عودِ ہندی جیسا کہ معلوم ہے میرزا غالب ابتدا میں اُردو خطوط کے چھاپنے کے حامی نہ تھے ۔ منشی شیو نراین آرام نے ان سے طباعت کی اجازت مانگی تو میرزا نے منع کر دیا ۔ اس خیال کو زائل کرنے کا باعث چودھری عبدالغفور سرور مارہروی ہُوے جنھوں نے اپنے نام کے خطوط مرتب کر کے ان کا نام "مہرِ غالب" رکھا اور اس مجموعہ پر ایک دیباچہ بھی لکھ دیا ۔ اس میں زیادہ تر علمی خطوط تھے، اس لیے میرزا نے ان کی اشاعت غیر مناسب نہ سمجھی ۔ پھر خیال آیا کہ اس انداز کے دوسرے خطوط بھی اس مرقع میں شامل کر دینے چاہییں ۔ چنانچہ خواجہ غلام غوث خاں بے خبر میر منشی حکومت آگرہ و اودھ کے اہتمام میں علمی خطوط فراہم ہونے لگے ۔ خود میرزا بھی علمی انداز کا جو خط لکھتے تھے، اس کی نقل خواجہ صاحب کے پاس بھیج دیتے تھے یا مکتوب الیہ کو لکھ دیتے تھے کہ اس کی نقل خواجہ صاحب کو پہنچائی جائے ۔ کئی برس میں یہ مجموعہ تیار ہُوا اور طباعت کے لیے منشی ممتاز علی خاں صاحب مالک مطبع مجتبائی کے پاس میرٹھ بھیج دیا گیا ۔ یہی مجموعہ ہے جو "عودِ ہندی" کے نام سے غالب کی وفات سے پونے چار مہینے پیشتر شایع ہُوا ۔

اُردوے معلّٰی "عودِ ہندی" کی اشاعت میں بہت دیر ہو گئی تو دہلی میں میرزا کے مخلص نیازمندوں نے "اُردوے معلّے" کے نام سے نئے مجموعے کی ترتیب شروع کر دی ۔ عودِ ہندی کی پہلی اشاعت کی کاپی کسی اناڑی کاتب نے لکھی تھی اور غلطیاں بہت رہ گئی تھیں ۔ نیز اس کی ابتدائی ترتیب صرف علمی خطوط تک محدود تھی ۔ اس کے برعکس "اردوے معلّے" میں ہر قسم کے خط جمع کرنے کی

کوشش کی گئی اور نہ خود میرزا غلطیوں کی تصحیح کے لیے موجود تھے۔ یہ مجموعہ اکمل المطابع میں چھپنا شروع ہوا جس کے مالک حکیم غلام رضا خاں تھے اور میرزا نے اُردوے معلّٰی کا حق تصنیف بھی انھیں کے حوالے کر دیا تھا لیکن طباعت میرزا کی وفات کے بعد مکمل ہوئی۔ اس کا دیباچہ میر مہدی مجروح نے اور خاتمہ میرزا قربان علی بیگ سالک نے لکھا۔ یہ صرف حصّہ اوّل تھا۔ اگر غالب زندہ رہتے تو دوسرا حصّہ بھی مرتب ہو جاتا۔ اُن کی وفات کے باعث کام التوا میں پڑ گیا۔ پھر مولوی عبدالاحد صاحب مالک مطبع مجتبائی دہلی پورا اُردوے معلّٰی چھاپنے پر آمادہ ہوئے تو ۱۸۹۹ء میں خواجہ حالی نے اپنے فراہم کردہ خطوط اُن کے حوالے کر دیے۔ اس کا نام اردوے معلّٰی حصہ دوم قرار پایا لیکن یہ الگ کتاب کی صورت میں نہ چھپا بلکہ حصّہ اوّل کے ساتھ شامل ہو گیا۔

متفرق مجموعے اس کے بعد میرزا کے متفرق خطوط بھی رسالوں میں چھپتے رہے اور مختلف مجموعے بھی شائع ہوئے مثلاً:

۱۔ **نادر خطوط غالب**: جو مولوی کرامت علی ہمدانی، صفیر بلگرامی اور صوفی منیری کے نام لکھے گئے۔ یہ کل ۲۷ خط ہیں۔

۲۔ **مکاتیب غالب**: یہ مجموعہ ان خطوط پر مشتمل ہے جو میرزا نے والیان ریاست رام پور کے نام بھیجے تھے اور ریاست کے دفتر میں محفوظ تھے۔ صدیق محترم مولانا سیّد امتیاز علی عرشی نے انھیں انتہائی اہتمام سے مرتب کیا۔ مبسوط فاضلانہ مقدمہ لکھا۔ جس میں پہلی مرتبہ غالب کے انشا کی خصوصیات منظر عام پر لائی گئیں اور ٹائپ میں بہ صرف زر کثیر چھپوایا۔ یہ کل ۱۱۷ خط ہیں۔ جن میں سے چار خط فارسی میں ہیں، باقی سب اُردو میں۔

۳۔ **نادرات غالب**: اس مجموعے میں وہ خطوط ہیں جو میرزا نے منشی نبی بخش حقیر کے نام بھیجے تھے۔ یہ کل ۴۰ ہیں۔ جن میں سے پہلا فارسی میں ہے۔

منشی مہیش پرشاد نے "خطوط غالب" کے نام سے جو مجموعہ چھاپنا شروع کیا تھا، اس کی پہلی جلد میں کئی غیر مطبوعہ رقعے شامل ہو گئے۔ بایں ہمہ نہیں کہا جا سکتا کہ میرزا نے اُردو میں

جتنے خطوط لکھے تھے وہ سب محفوظ نہ رہے یا منظرِ عام پر آگئے۔ بعض مجموعوں کا علم ہو چکا ہے۔ لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کہاں ہیں اور کن کے پاس ہیں

اُردو خطوں کی ابتدا کا مسئلہ ایک مسئلہ مدت سے اہلِ علم کے زیرِ بحث چلا آتا ہے کہ مرزا نے اُردو میں خط لکھنے کی ابتدا کب سے کی؟ خواجہ حالی نے یادگارِ غالب میں فرمایا تھا کہ قیاس چاہتا ہے کہ ”انھوں نے غالباً ۱۸۵۰ء کے بعد سے اُردو میں خط لکھنے شروع کیے“۔ میرا خیال شروع ہی سے یہ تھا کہ اس بارے میں ۱۸۵۰ء کی تعیین ٹھیک نہ ہوگی۔ اب ۱۸۴۸ء کے لکھے ہوئے خطوط بھی چھپ چکے ہیں اور ان کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پیشتر بھی مرزا صاحب ضرورتاً اُردو میں خط لکھتے رہے ہوں گے، اگرچہ وہ محفوظ نہ رہ سکے۔ بہرحال صحیح یہی ہے کہ جب تک اُردو کا رواج کم تھا، مرزا زیادہ تر فارسی میں خط و کتابت کرتے رہے، پھر جیسے جیسے اُردو کا رواج بڑھتا گیا اور فارسی کا تداول کم ہوتا گیا۔ انھوں نے بھی اُردو کو ذریعۂ مخابرت بنا لیا۔ ابتدائی دور کے عام محفوظ خطوط فارسی میں ہیں۔ آخری دور کے زیادہ تر خطوط اُردو میں ہیں نہ سارے خط فارسی کے فراہم ہوئے یا محفوظ رہے اور نہ اُردو کے۔ ”مہرِ نیمروز“ کی ترتیب میں کاوش کو بھی اس امر کی دلیل بنایا گیا ہے کہ مرزا ۱۸۵۰ء میں فارسی خط و کتابت کو چھوڑ کر اردو ذریعۂ مکاتبت بنانے پر مجبور ہولیے۔ بلاشبہ مرزا نے اس کاوش کے اظہار میں خاصی سخن گستری فرمائی ہے لیکن اس سے وہ حقیقت نہیں بدل سکتی جو میں اوپر عرض کر چکا ہوں اور جب ۱۸۴۸ء کے لکھے ہوئے اُردو خطوط موجود ہیں تو ۱۸۵۰ء پر حصر کا معاملہ خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔ پھر بحث کو طول دینے سے کیا حاصل؟ اور یہ خط ایسے شخص کو لکھے گئے جو فارسی کا بہت بڑا عالم تھا، یہاں تک کہ مرزا نے ”دستنبو“ کے سلسلے میں اس کے متعلق فرمایا تھا کہ اگر اصل میں بھی غلطی ہوگی تو وہ اسے درست کر دے گا یعنی منشی نبی بخش حقیر۔

بہرحال مرزا کے اُردو مکاتیب کو مکمل تاریخ وار مرتب کرنے اور ان پر تشریحی حواشی لکھنے کی یہ پہلی کوشش ہے۔ جا بجا قیاس سے بھی کام لینا پڑا۔ اس لیے ممکن ہے کہیں کہیں غلطیاں بھی ہوئی ہوں۔ غلطیوں کا زیادہ امکان ان خطوں میں تھا جو شروع سے آخر تک صرف علمی مباحث پر

مشتمل تھے اور ان میں کوئی ایسی بات درج نہ تھی جس سے تعین تاریخ کے لیے کوئی قرینہ ہاتھ آتا۔ مجھے امید ہے کہ اس ترتیب و تحشیہ کے بعد میرزا کے خطوط کا مطالعہ زیادہ مفید و دلچسپ بن جائے گا۔

اُردو نثر کی مجمل سرگذشت میرزا نے جب اُردو میں خط لکھنے شروع کیے تو اس سے پہلے اُردو نثر کے دو مستقل اسلوب موجود تھے۔ ایک سادہ اور عام فہم اسلوب جس کی مثال میں عام طور پر فورٹ ولیم کالج کی کتابیں پیش کی جاتی ہیں، جو ڈاکٹر گل گرائسٹ کے زیر اہتمام مرتب ہوئیں۔ لیکن اس سلسلے کی اور کتابیں بھی تھیں۔ مثلاً بائبل کا وہ اُردو ترجمہ جو سرام پور میں چھپا تھا، شاہ عبدالقادر محدث اور شاہ رفیع الدین محدث کے تراجم قرآن۔ شاہ اسمٰعیل شہید کی "تقویت الایمان" جو میرے اندازے کے مطابق ۱۸۱۸ء اور ۱۸۲۰ء کے درمیان لکھی گئی۔ پھر سید احمد شہید بریلوی کے دوسرے مریدوں اور معتقدوں نے عربی کی بعض مذہبی کتابوں کے سلیس اُردو ترجمے کیے۔ بیسیوں چھوٹے چھوٹے رسالے عام فہم زبان میں لکھے، جن کا مقصد "تقویت الایمان" کی طرح یہ تھا کہ ہر اُردو خوان استاد کی مدد کے بغیر ضروری دینی مسائل سے آگاہ ہو جائے۔ اس طرح سادہ اور عام فہم اسلوب تحریر کو خاصی تقویت پہنچی۔ ۱۸۰۷ء میں انشا نے "دریائے لطافت" لکھی۔ اس کا انداز تحریر بھی بہت سلیس تھا۔ بایں ہمہ اسے علمی انداز قرار دینے میں کسی صاحب ذوق کو ایک لمحہ کے لیے بھی تامل نہیں ہو سکتا۔

اس کے ساتھ مقفّٰی اور مغلق اسلوب تحریر بھی موجود تھا۔ عام اہل قلم کے نزدیک عالمانہ انداز یہی تھا کہ معمولی بات کو تشبیہوں اور استعاروں کے ذریعے سے مبہم اور پیچدار بنا کر پیش کیا جائے۔ یہ فارسی کے اس اسلوب نگارش کا پرتو تھا جو صدیوں سے ہندوستان میں رائج چلا آتا تھا۔ یہ لوگ تفہیم کے بجائے نمائش علمیت پر زیادہ زور دیتے تھے۔

میرزا غالب کی نثر میرزا نے اپنے خطوں میں سادہ اور سلیس انداز اختیار کیا۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ میرزا نے اس زمانے میں اُردو مکاتبت شروع کی، جب فارسی میں اُن کی

مشاقی اوج کمال پر پہنچ چکی تھی، بیان و نگارش کے محاسن اُن کے دل و دماغ میں رچ چکے تھے۔ اور یہ حقیقت اُن پر کھُل چکی تھی کہ علم و فضل کی نمائش کا یہ طریقہ نہیں کہ عبارت میں قدم قدم پر پیچ ڈالے جائیں، نئی نئی ترکیبوں اور نئے نئے استعاروں سے اسے بوجھل بنایا جائے بلکہ نفس مطلب ایسے رنگ میں پیش کرنا چاہیے کہ مخاطب بے تکلّف اسے سمجھ جائے۔ بایں ہمہ اس سے بہتر اور موزوں تر الفاظ کا انتخاب آسان اور سہل نہ ہو۔ اس طرح انھوں نے اپنے انداز کو سہل ممتنع بنا دیا۔

پھر قدرت نے انھیں نکتہ وری اور نکتہ نوازی کے خاص جوہر عطا کیے تھے۔ وہ معمولی مطالب بھی لے کر بیٹھتے تو بیان کے حسن، ابداع کی خوبی اور نکتہ آفرینی کے کمال کے باعث دلچسپی اور دلآویزی کے بدیع پہلو پیدا کر لیتے۔ سادگی اور سلاست کے باوجود انھوں نے اپنی تحریر کو ایسا پرواز دے دیا کہ گزشتہ اسی برس سے اُن کی نثر گوناگوں خوبیوں میں ممتاز چلی آتی ہے۔ اِن کے بعد ملک میں بڑے بڑے ادیب پیدا ہوئے، جن کی تصانیف ہماری زبان کا گرانبہا سرمایہ ہیں۔ ان میں سے اکثر کے مکاتیب بھی چھپ چکے ہیں۔ لیکن ان میں سے کون سا مجموعۂ مکاتیب رقعات غالب کے لطائف و نفائس کی ہمہ گیری کا مقابلہ کر سکتا ہے؟ بلکہ کس کی تصنیف میں دلچسپیوں کی وہ فراوانی مل سکتی ہے جو میرزا نے اپنے خطوں میں بے تکلّف فراہم کر دی؟

تصورِ عام کی پیروی لیکن یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ابتدا میں خود میرزا کو اپنے دل پذیر انداز کی گیرائی کا صحیح احساس نہ تھا۔ منشی شیو نرائن آرام اکبر آبادی نے نومبر ۱۸۵۸ء میں اُن کے خطوط چھاپنے کا قصد کیا تو میرزا نے منع کر دیا۔ لکھتے ہیں:

> یہ بھی زائد بات ہے۔ کوئی رقعہ ایسا ہو گا۔ جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہو گا۔ ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری سخنوری کے شکوہ کے منافی ہے۔

انھیں دنوں میں میرزا ہرگوپال تفتہ نے بھی اس بات پر زور دیا کہ اردو خطوط چھپ

جانے چاہیں۔ میرا خیال ہے کہ منشی شیو نرائن اور میرزا تفتہ نے باہم بات چیت کر کے غالب کو لکھا ہوگا۔ تفتہ کو لکھتے ہیں:

"رقعات کے چھاپنے میں ہماری خوشی نہیں ہے۔ لڑکوں کی سی ضد نہ کرو اگر تمھاری اس میں خوشی ہے تو صاحب مجھ سے نہ پوچھو، تم کو اختیار ہے۔ یہ امر میرے خلاف رائے ہے۔"

پھر کیا ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ میرزا نے اُردو نثر میں جو انداز اختیار کیا تھا، یہ اُن کے وسیع ادبی تجربات کا نچوڑ نہ تھا بلکہ اتفاقیہ اور بے ارادہ اُن کے قلم سے ٹپک پڑا؟ جب ہر طرف سے مدح وستایش ہونے لگی تو میرزا کو اس کے انوکھے پن کا یقین ہوا۔ میرے نزدیک واقعہ یہ ہے کہ شروع میں میرزا کو اپنے اُردو خطوط کی اشاعت میں صرف اس وجہ سے تامّل تھا کہ اس زمانہ میں علم وفضل کو فارسی میں یا اس کے اسالیب کی پیروی میں محدود و محصور مانا جاتا تھا۔ اُردو کی علمی حیثیت پوری طرح مسلّم نہ تھی۔ لہٰذا میرزا نے کہا کہ اُردو خطوط میری سخنوری کے "شکوہ" کی آئینہ دار نہیں ہیں۔ لیکن جب فارسی کا رواج تیزی سے کم ہو گیا اور اردو سرکاری زبان بن جانے کے باعث دفاتر ومدارس اور علمی مجامع میں عام رواج پا گئی تو میرزا کی رائے بھی بدل گئی۔ اور وہ خود اپنے مکاتیب کی فراہمی میں جامعین کے معاون بن گئے۔

اگر میری یہ ناچیز رائے مقبول نہ ہو تو پھر ماننا چاہیے کہ تاجر جب نئی جنس بازار میں لاتا ہے تو اسے پہلے ہی دن یہ یقین نہیں ہوتا کہ جنس واقعی گراں ہے اور ضرور ہے کہ قبول عام حاصل کرے یعنی گاہک دیکھتے ہی اس پر اس طرح گرنے لگیں، جس طرح مکھیاں شہد پر گرتی ہیں۔ میرزا پر بھی ابتدا میں کچھ مدت تک تذبذب کی یہ کیفیت طاری رہی ہوگی، وہ شاعر و ادیب تھے، پیغمبر نہ تھے، جنھیں پیام کی صداقت وافادیت کا یقین قدرت کی طرف سے عطا کیا جاتا ہے اگر یہ انداز اتفاقیہ اور بے ارادہ بھی ان کے قلم سے تراوش پذیر ہوا تو اسے انھیں کے چمنستان کمال کی ایک بہار ماننا جائے گا۔

انشاء غالب میرزا کو قدرت نے صرف شعر و ادب کے لیے پیدا کیا تھا۔ وہ جوہر عطا کئے تھے جو شاذ ہی ایک فرد میں جمع ہوتے ہیں۔ اُردو نثر پر متوجہ ہونے سے پہلے وہ تیس پینتیس برس تک حریم ادب فارسی کے طواف میں مشغول رہ چکے تھے۔ اِسی مشغولیت کے دوران میں اُن کے قوائے فکر و نظر نے نشو و بلوغ کی منزلیں طے کیں اور اسالیب بیان کے دقائق و معارف پر انھیں عبور حاصل ہُوا۔ فارسی کے خزینۂ ادب میں صدیوں سے حسن کلام اور لطافت ادا کے جو شہوار گوہر جمع ہوتے رہے تھے میرزا نے نہ محض انھیں دُرجِ حافظہ میں جمع کیا، بلکہ ایک بالغ نظر جوہری کی طرح ان گوہروں سے دو قرنوں تک طراز و آرایش کے نئے نئے شیوے اور نئے نئے انداز پیدا کرتے رہے۔ فارسی ادب ایشیا بھر میں وقت کا بہترین ادب مانا جاتا تھا اور یہی ادب تھا جو ایران، ترکستان، افغانستان اور ہندوستان کا مشترکہ علمی سرمایہ تھا۔ میرزا اس کی پوری دولت سمیٹ لینے کے بعد اُردو کی فضا میں ابرِ گہر بن کر نمودار ہوئے۔ زبان کی لطافت، الفاظ کی موزونی، بیان کے حسن اور تراکیب کی دلآویزی کے اسرار ان پر روشن ہو چکے تھے۔ معانی کے دریا کو عبارت کے کوزے میں بند کرنے کے ہنر میں وہ کمال بہم پہنچا چکے تھے۔ ادب میں یہ مقام بلند ہر صاحب تحریر اور ہر اہل قلم کو میسّر نہیں آتا۔ لفظوں کو جوڑ کر فقرے تیار کر لینا یا پیش نظر مطالب کو الفاظ کا لباس پہنا دینا آسان ہے، لیکن لفظوں کی معنویت کے دقائق کا صحیح اندازہ کرتے ہوئے ان سے موقع اور محل پر کام لینا سہل نہیں۔ اِس بارے میں میرزا نے کیا خوب فرمایا ہے:-

نے ہر ترانہ سنج نکیسا نوا بود	نے ہر سخن سرائے بہ سحبان برابر است
نے ہر شتر سوار بہ صالحؑ بود ہماں	نے ہر شباں بہ موسیٔ عمراں برابر است
نے ہر کہ گنج یافت زپرویز گوے برد	نے ہر کہ باغ ساخت بہ خواں برابر است
گفتی کہ این و آں بود از نطق مایہ ور	این در شمار شیوہ نہ با آں برابر است
گیرم کہ ہر گیہ برد از ابر و باد فیض	خم زہرہ کے بہ سنبل و ریحاں برابر است

بے تکلفی اور سادگی میرزا کے اندازِ نگارش کی ممتاز ترین خصوصیت یہ ہے کہ وہ جو کچھ لکھتے تھے، بے تکلف لکھتے تھے۔ ان کے خطوط کا مطالعہ کرتے وقت شاید ہی کہیں یہ احساس ہو کہ الفاظ کے انتخاب یا مطالب کی تلاش و جستجو میں انھیں کاوش کرنی پڑی۔ برابر یہ محسوس ہوتا ہے کہ مطالب دلکش الفاظ کا جامہ پہن کر اسی طرح بہے چلے آ رہے ہیں جس طرح فوارے کا مُنہ کھُل جانے سے پانی خود بخود اُچھلا چلا آتا ہے۔ عام ادبی بول چال کا سہارا لے کر کہہ سکتے ہیں کہ میرزا کے اُردو خطوط سراسر "آمد" تھے، "آورد" سے ان کا دامن یکقلم پاک تھا۔ وہ خود لکھتے ہیں:

"ہنجارِ من در نگارش این است کہ چو کلک و ورق بہ کف گیرم، مکتوب الیہ را بہ لفظے کہ در خورِ حالت اوست در ہر آغازِ صفحہ آواز دہم و زمزمہ سنجِ مدعا گردم۔ القاب و آداب و خیریت گوئی و عافیت جوئی حشو و زوائد است و نخستگان حشو را دفع نہند"

اس بے تکلفی اور رسم و راہِ عام سے علیحدگی کا جامع ترین مرقع ان کے اُردو خطوط ہیں۔ اگر مثالیں دی جائیں تو مکاتیب کے بڑے حصے کو یہاں دہرانا پڑے۔ تاہم چند نمونے ملاحظہ فرمالیجیے:

(۱) منشی شیونراین آرام سے ارسال جواب میں تاخیر ہوئی۔ فرماتے ہیں:

"بھائی، یہ بات تو کچھ نہیں کہ تم خط کا جواب نہیں لکھتے۔ خیر دیر سے لکھو، اگر شتاب نہیں لکھتے۔"

(۲) میرزا تفتہ نے خط لکھنے میں دیر کر دی تو فرماتے ہیں:

"کیوں صاحب، کیا یہ آئین جاری ہوا ہے کہ سکندر آباد کے رہنے والے دلی کے خاک نشینوں کو خط نہ لکھیں؟ اگر یہ حکم ہُوا ہوتا تو یہاں بھی اشتہار ہو جاتا کہ زنہار کوئی خط سکندر آباد کی ڈاک میں نہ جائے۔

(۳) انور الدولہ شفق نے قصیدہ بغرض اصلاح بھیجا۔ میرزا نے درستی کے بعد اسے

واپس کر دیا۔ شفق نے کٹے ہوئے اشعار کی قباحت پوچھی، میرزا نے بتا دی - ایک رقعہ کسی صاحب کے نام بھیجا تھا، میرزا نے اس کا جواب لے کر ارسال کر دیا۔ پھر شکایت کی فرماتے ہیں۔

"پیر و مرشد، بارہ بجے تھے، میں ننگا پلنگ پہ لیٹا ہوا حقہ پی رہا تھا کہ ایک آدمی نے آ کر خط دیا۔ میں نے کھولا، پڑھا۔ بھلے کو انگرکھا یا کرتا گلے میں نہ تھا اگر ہوتا تو میں گریبان پھاڑ ڈالتا - حضرت کا کیا جاتا؟ میرا نقصان ہوتا -

(۴) میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں:

"ہاں صاحب! تم کیا چاہتے ہو؟ مجتہد العصر کے مسودے کو اصلاح دے کر بھیج دیا۔ اب اور کیا لکھوں؟ تم میرے ہم عمر نہیں جو سلام لکھوں۔ میں فقیر نہیں جو دعا لکھوں۔ تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ لفافے کو گرید اکرو، مسودے کو بار بار دیکھا کرو، پاؤ گے کیا؟

(۵) مجروح کے نام ایک اور خط اس طرح شروع ہوتا ہے:

"او میاں سید زادہ آزادہ، دلی کے عاشق دلدادہ، ڈھیے ہوئے اردو بازار کے رہنے والے، حسد سے لکھنؤ کو برا کہنے والے۔ نہ دل میں مہر و آزرم، نہ آنکھ میں حیا و شرم

جدّت جدت میرزا کے پورے کلام نظم و نثر کی جان ہے - وہ کوئی بات بھی عام اور فرسودہ انداز میں نہیں کہتے۔ بلکہ انتہا یہ ہے کہ تقریباً ہر خط میں مکتوب الیہ کو نئے طریق پر خطاب کرتے ہیں۔ مثلاً میر مہدی مجروح کے نام کے بعض خطوں کی ابتدائی عبارتیں ملاحظہ فرمایئے

(۱) بھائی، تم سچ کہتے ہو: بر سر فرزند آدم ہر چہ آید بگزرد

(۲) نور چشم میر مہدی کو بعد دعا کے معلوم ہو کہ کلیات فارسی کا پہنچنا مجھ کو معلوم ہوا -

(۳) برخوردار کامگار میر مہدی دہلوی، اردو بازار کے مولوی، صاحب لوائے ولائے مرتضوی پر علم عباسؓ ابن علیؓ کا سایہ۔

(۴) صاحب، دو خط تمہارے بہ سبیل ڈاک آئے۔ کل دوپہر ڈھلے ایک صاحب اجنبی، سانولے سلونے، ڈاڑھی منڈے، بڑی بڑی آنکھوں والے تشریف لائے۔ تمہارا خط دیا۔

(۵) میاں، تم کو پنشن کی کیا جلدی ہے ؟ ہر بار پنشن کو کیوں پوچھتے ہو؟ پنشن جاری ہو اور میں تم کو اطلاع نہ دوں ؟

(۶) میر مہدی تم میری عادات کو بھول گئے ، ماہ مبارک رمضان میں کبھی مسجد جامع کی تراویح ناغہ ہوئی ہے؟ میں اس مہینے میں رام پور میں کیوں رہتا !

(۷) جو یائے حال دہلی والو اسلام لو۔ مسجد جامع واگذاشت ہو گئی - چتلی قبر کی سیڑھیوں پر کبابیوں نے دُکانیں بنالیں - انڈا، مرغی، کبوتر بکنے لگا -

(۸) لو صاحب ، یہ تماشا دیکھو- میں تم سے پوچھتا ہوں کہ میر سرفراز حسین اور میر نصیر الدین کہاں ہیں - حالانکہ میر نصیر الدین شہر میں ہیں اور مجھ سے نہیں ملے میر سرفراز حسین آئے ہیں اور میرے ہاں نہیں اُترے -

(۹) میاں لڑکے ، کہاں پھر رہے ہو؟ ادھر آؤ، خبریں سُنو -

(۱۰) اہاہا ، میرا پیارا میر مہدی آیا - آؤ بھائی مزاج تو اچھا ہے

(۱۱) آہیے جناب میر مہدی صاحب دہلوی ، بہت دنوں میں آئے - کہاں تھے؟ بارے آپ کا مزاج تو خوش ہے ؟

(۱۲) میری جان ، خط نہ بھیجو اور میرے خط کا انتظار کرو - اِس کی وجہ میں نہیں سمجھا -

(۱۳) مار ڈالا یار تیری جواب طلبی نے - اِس چرخ کج رفتار کا بُرا ہو - ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا ؟

لطف یہ کہ جس قسم کے مطالب پیش نظر ہوتے ہیں، اسی رنگ کا خطاب ہوتا ہے عام خطوں کی کیفیت یہی ہے -

میر مہدی کے نام ایک خط لکھا جس کی ابتدا یوں ہے ،

میرن صاحب " السلام علیکم"

" حضرت ! آداب "

"کہو صاحب، آج اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی؟"

غرض اسی طرح میرن صاحب سے مکالمہ چلا جاتا ہے۔ بادی النظر میں خط میرن کے نام معلوم ہوگا۔ لیکن ہے میر مہدی کے نام۔

اسی طرح نواب علاؤ الدین خاں کے چند خطابات ملاحظہ فرمایئے:

(۱) جانا جانانا

(۲) میرزا علائی؟

(۳) علائی مولائی

(۴) میری جان علائی ہمہ دان۔

(۵) جان غالب مگر جسم سے نکلی ہوئی جان

اپنا نام لکھنے کے طریقے طرزِ خطاب کے نئے نئے رنگ آپ نے دیکھ لیے۔ اپنا نام بھی وہ اکثر عجیب و غریب انداز میں ظاہر کرتے ہیں مثلاً:

(۱) خواجہ غوث غوث خاں بے خبر کے نام!

قبلہ! کبھی آپ کو یہ بھی خیال آتا ہے کہ کوئی ہمارا دوست، جو غالب کہلاتا ہے، وہ کیا کھاتا پیتا ہے اور کیونکر جیتا ہے؟

(۲) انور الدولہ شفق کے نام!

واہ! کیا ہوشمندی ہے کہ قبلہ ارباب ہوش کو خط لکھتا ہوں، نہ القاب، نہ آداب، نہ بندگی، نہ تسلیم۔ سن غالب، ہم تجھ سے کہتے ہیں مصاحب نہ بن۔

(۳) علاؤ الدین احمد خاں علائی کے نام:

دن، تاریخ صدر میں لکھ آیا ہوں۔ کاتب کا نام غالب ہے کہ دستخط سے پہچان جاؤ۔

(۴) علائی کے نام!

تاریخ اوپر لکھ آیا ہوں، نام اپنا بدل کر مغلوب لکھ دیا ہے۔

پھر کہیں فقیری کا رنگ اختیار کر کے اپنے آپ کو "غالب علی شاہ" لکھتے ہیں۔ اکثر "نجات کا طالب غالب" تحریر فرماتے ہیں۔

اندازِ مکالمت میرزا کے مکاتیب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اُنھوں نے تحریر میں مکالمت کا رنگ پیدا کر دیا تھا۔ میرزا حاتم علی بیگ مہرؔ کو لکھتے ہیں:

میرزا صاحب، میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔

تفتہؔ کو بھی لکھتے ہیں: "بھائی تم میں مجھ میں نامہ نگاری کا ہے کو ہے، مکالمہ ہے" غلام نجف خاں، انورالدولہ شفقؔ، خواجہ غلام غوث خاں بےخبرؔ وغیرہ کے خطوں میں بھی اس قسم کے اشارے موجود ہیں:

اوّل ان کے خطوں کا عام انداز ہی مکالمے اور بات چیت کا ہے۔ کہیں کہیں باقاعدہ مکالمے بھی لکھے ہیں مثلاً:

(۱) مجروحؔ کو لکھتے وقت، آغاز میرن صاحب کے ساتھ مکالمے سے کیا ہے اور پوری بات چیت لکھ دی ہے:

"اے میرن صاحب! السلام علیکم"

"حضرت! آداب"

"کہو صاحب، آج اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی؟"

"حضور! میں کیا منع کرتا ہوں، مگر میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دُعا لکھ دیتا ہوں، پھر آپ کیوں تکلیف کریں؟"

"نہیں میرن صاحب! اس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں۔ وہ خفا ہوا ہوگا۔ جواب لکھنا ضرور ہے"۔

"حضرت! وہ آپ کے فرزند ہیں، آپ سے خفا کیا ہوں گے؟"

"بھائی! آخر کوئی وجہ تو بتلاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو؟"
"سبحان اللہ! اسے لو حضرت! آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے"

"اچھا، تم باز نہیں رکھتے، مگر یہ کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میر مہدی کو خط لکھوں؟"
"کیا عرض کروں؟ سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سنتا اور حظ اُٹھاتا۔ اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ آپ کا خط جاوے"

(۲) علائی کو یہ اطلاع دینا چاہتے ہیں کہ اُن کی والدہ، بیگم اور فرزند روانہ ہونے والے ہیں۔ فرماتے ہیں:

میرا منتظر سرراہ ہے۔ وہاں بیٹھا ہُوا خط لکھ رہا ہوں۔ محمد علی بیگ ادھر سے نکلا
"بھئی محمد علی بیگ! لوہارو کی سواریاں روانہ ہو گئیں؟"
"حضرت! ابھی نہیں"
"کیا آج نہ جائیں گی؟"
"آج ضرور جائیں گی۔ تیاری ہو رہی ہے"

ان باقاعدہ مکالموں کے علاوہ بھی بیسیوں مثالیں مل جائیں گی۔ جن میں ایسا انداز اختیار کیا گیا ہے کہ گویا مکتوب الیہ سامنے بیٹھا ہے اور اس سے بے تکلف باتیں کر رہے ہیں مثلاً

(۱) میر مجروح کے نام:

میاں، کیوں ناسپاسی و ناحق شناسی کرتے ہو؟ چشم بیمار ایسی چیز ہے کہ کوئی شکایت کرے؟ تمھارا مُنہ چشم بیمار کے لائق کہاں؟ چشم بیمار میرن صاحب قبلہ کی آنکھ کو کہتے ہیں، جس کو اچھے اچھے عارف دیکھتے رہتے ہیں۔ تم گنوار چشم بیمار کو کیا جانو؟

(۲) میر مجروح کے نام

اہاہا، میرا پیارا میر مہدی آیا۔ آؤ بھائی، مزاج تو اچھا ہے، بیٹھو یہ رام پور

ہے یہ دارالسرور ہے۔ جو لطف یہاں ہے وہ اور کہاں ہے؟

(۳) تفتہ کے نام:

"کیوں مہاراج، کول میں آنا اور جناب منشی نبی بخش صاحب کے ساتھ غزل خوانی کرنی اور ہم کو یاد نہ لانا، مجھ سے پوچھو کہ میں نے کیوں کر جانا؟ تم مجھ کو بھول گئے۔ کول میں آئے اور مجھ کو اپنے آنے کی اطلاع نہ دی۔ نہ لکھا کہ کیوں کر آیا ہوں اور کب آیا ہوں اور کب تک رہوں گا اور کب جاؤں گا اور بابو صاحب سے کہاں جا ملوں گا؟

ایسی مثالیں آپ کو مکاتیب میں جا بجا ملیں گی۔ مکاتیب میں حسن تحریر کا کمال یہی ہے کہ ان میں باقاعدہ گفتگو کی شان پیدا کر دی جائے۔ میرزا اس وصف میں سب سے منزلوں آگے نکل گئے۔

ذات اور ماحول میرزا کا ایک کمال یہ ہے کہ وہ اثنائے تحریر میں ذاتی حالات اور ماحول کی جزئیات اس بے ساختگی سے بیان کر جاتے ہیں کہ دوران مطالعہ میں شاید یہ محسوس نہ ہو کہ اپنے متعلق کیا کچھ لکھ دیا۔ لیکن پورے مکاتیب کو سامنے رکھ کر حیات غالب کا مکمل نقشہ تیار کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ کب اور کہاں پیدا ہوئے۔ خاندان کی کیفیت کیا تھی، وسائل معاش کیا کیا تھے، کہاں کہاں سے پیسے ملتے رہے، کن کن مکانوں میں رہے، کن کن لوگوں سے کس کس قسم کے تعلقات تھے، قلیے کب جاتے تھے، کھاتے پیتے کیا تھے، رات دن کی مشغولیت کا کیا حال تھا، کن کن بیماریوں سے سابقہ پڑا، آخری عمر میں ضعف کس رفتار سے ترقی کرتا رہا، نظم و نثر کی اصلاح کا طریقہ کیا تھا، اخلاق کیسے تھے، کن کن مقامات کے سفر کئے۔ غرض ان کی زندگی کا شاید ہی کوئی پہلو ایسا ہو، جس کے متعلق ان کے قلم سے معلومات کا گراں بہا ذخیرہ فراہم نہ ہوا ہو۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ذاتی حالات کی تسوید ان کے پیش نظر نہ تھی۔

اسی طرح دہلی اور بعض دوسرے مقامات کے حالات ان کے خطوں میں بہ کثرت موجود ہیں عام ملکی حالات کے متعلق بھی خاصی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ انھوں نے غدر کے نتائج و

عواقب پر بیسیوں خطوں میں بحث کی ہے اور جو نقشہ پیش کر دیا ہے وہ کسی دوسری جگہ نہیں مِل سکتا۔

نواب میر غلام بابا خاں نے جشن کے سلسلے میں سورت آنے کی دعوت دی۔ جواب میں لکھتے ہیں:

"رقعہ گلگوں نے بہار کی سیر دکھلائی، بہ سواری ریل روانہ ہونے کی لہر دل میں آئی۔ پاؤں سے اپاہج، کانوں سے بہرا، ضعف بصارت، ضعف دماغ، ضعف دل، ضعف معدہ، اِن سب ضعفوں پر ضعف طالع۔ کیوں کر قصد سفر کروں؟ تین چار شبانہ روز قفس میں کس طرح بسر کروں؟"

اِس طرح بیان کر گئے کہ ۱۸۶۶ء میں ریل کے ذریعے سے سورت پہنچنے میں تین چار دن صرف ہوتے تھے۔ ایک اور خط میں رام پور سے لکھتے ہیں:

"میں حسب الطلب نواب صاحب کے دوستانہ آیا ہوں اور اپنی صفائی بذریعہ ان کے گورنمنٹ سے چاہتا ہوں۔ دیکھوں کیا ہوتا ہے۔ کتاب (دستنبو) اور عرضی اواسط ماہ جنوری (سنہ ۱۸۶۰ء) میں ولایت کو روانہ کر کے یہاں آیا ہوں۔ چھ ہفتے میں جہاز پہنچتا ہے۔ یقین ہے کہ پارسل ولایت پہنچ گیا ہوگا"

اِس طرح بتا دیا کہ سنہ ۱۸۶۰ء میں جہاز ڈیڑھ مہینے میں ہندوستان سے ولایت پہنچتا تھا ایسی معلومات ان کے مکاتیب سے بہ کثرت نکالی جا سکتی ہیں۔

منظر کشی میرزا کا ایک کمال یہ ہے کہ وہ جو کچھ بیان کرتے ہیں۔ اس کی تصویر لفظوں میں اس طرح کھینچ دیتے ہیں کہ شاید رنگ و روغن کی تصویر میں نہ وہ جزئیات سما سکتی ہیں اور نہ اس میں وہ روح تاثیر پیدا ہو سکتی ہے۔ اس کی مثالیں بھی بہت زیادہ ہیں۔ میں صرف چند پر اکتفا کروں گا:

(۱) میر مہدی مجروح کے نام:

برسات کا حال نہ پوچھو، خدا کا قہر ہے۔ قاسم جان کی گلی سعادت خاں کی نہر ہے۔ میں جس مکان میں رہتا ہوں، عالم بیگ کے کٹڑے کی طرف کا دروازہ گر گیا۔ مسجد کی طرف کے دالان کو جو دروازہ تھا، گر گیا۔ سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں۔ صبح کے بیٹھنے کا حجرہ جھک رہا ہے چھتیں چھلنی ہو گئی ہیں۔ مینہ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے۔

(۳) میرزا حاتم علی بیگ مہؔر کے نام:

تمھارا حلیہ دیکھ کر تمھارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا، کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔ تمھارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا، کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستایش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھ کو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے۔ ہاں مجھ کو رشک آیا اور میں نے خونِ جگر کھایا تو اس بات پر کہ ڈاڑھی گھٹی ہوئی ہے وہ مزے یاد آ گئے۔ کیا کہوں، جی پہ کیا گزری، بقول شیخ علی حزیں:

تا دسترسم بود زدم چاک گریباں — شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

جب ڈاڑھی مونچھ میں بال سفید آ گئے، تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پہ نظر آنے لگے، اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے، ناچار مسی بھی چھوڑ دی اور ڈاڑھی بھی۔ مگر یاد رکھیے، اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام۔ ملا، حافظ، بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقا، بھٹیارہ، جولاہا، کنجڑا، منہ پر ڈاڑھی سر پر بال، فقیر نے جس دن ڈاڑھی رکھی، اسی دن سر منڈایا۔

(۴) ہرگوپال تفتہؔ کو لکھتے ہیں کہ میں کرایے کے جس مکان میں رہتا تھا، مالک نے وہ بیچ ڈالا:

جس نے لیا۔ اس نے مجھ پر پیام بلکہ ابرام کیا کہ مکان خالی کر دو۔ مکان کہیں ملے تو میں اُٹھوں۔ بے درد نے مجھ کو عاجز کیا اور معاد لگا دی۔ وہ صحن بالاخانے کا جس کا دو گز

کا عرض اور دس گز کا طول ہے اس میں باڑ بندھ گئی۔ رات کو وہیں سویا۔ گرمی کی شدت، باڑ کا قرب، گمان یہ گزرتا تھا کہ یہ کٹکہ ہے اور صبح کو مجھے پھانسی ملے گی۔

(۴) میر مہدی مجروح کے نام:

برسات کا نام آگیا، سو پہلے تو مجملاً سنو۔ ایک غدر کالوں کا، ایک ہنگامہ گوروں کا، ایک فتنہ انہدام مکانات کا، ایک آفت وبا کی، ایک مصیبت کال کی، اب یہ برسات جمیع حالات کی جامع ہے۔ آج اکیسواں دن ہے۔ آفتاب اس طرح نظر آجاتا ہے جس طرح بجلی چمک جاتی ہے۔ رات کو کبھی کبھی اگر تارے دکھائی دیتے ہیں تو لوگ ان کو جگنو سمجھ لیتے ہیں ... مبالغہ نہ سمجھنا۔ ہزارہا مکان گر گئے سیکڑوں آدمی جا بجا دب کر مر گئے۔ گلی گلی ندی بہہ رہی ہے۔ قصہ مختصر وہ "ان کال" تھا کہ مینہ نہ برسا، اناج نہ پیدا ہوا۔ "یہ پن کال" ہے کہ پانی ایسا برسا کہ بوئے ہوئے دانے بہ گئے، جنھوں نے ابھی نہیں بویا تھا وہ بونے سے رہ گئے۔ سن لیا دلی کا حال؟۔

جزئیات نگاری میرزا کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ جزئیات کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ مفصل بیانات عموماً بے لطف ہو جاتے ہیں۔ لیکن میرزا جزئیات کو اس ڈھنگ سے پیش کرتے ہیں کہ تحریر بے مزہ ہونے کے بجائے زیادہ پُرلطف بن جاتی ہے۔ اس کی مثالیں بے شمار ہیں۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں:

(۱) غدر کے بعد نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ قید سے رہا ہوئے۔ میرزا میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں:

میں بہ مجرد استماع اس خبر کے ڈاک میں بیٹھ کر میرٹھ گیا۔ ان کو دیکھا۔ چار دن وہاں رہا۔ پھر ڈاک میں اپنے گھر آیا۔ تاریخ آنے جانے کی یاد نہیں۔ مگر ہفتے کو گیا، منگل کو آیا۔ آج بدھ دوم فروری ہے۔ مجھ کو آئے ہوئے نواں دن ہے۔

(۲) اس خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

میرٹھ سے آکر دیکھا کہ یہاں بڑی شدت ہے اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں ہے۔ لاہوری دروازے کا تھانے دار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھتا ہے، جو باہر کے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے ہاں پانچ پانچ بید لگتے ہیں یا دو روپے جرمانہ لیا جاتا ہے۔ آٹھ دن قید رہتا ہے۔

۲، شہاب الدین احمد خاں ثاقب کے نام بہ سلسلہ سفر رام پور:

دو تین گھڑی دن چڑھے احباب کو رخصت کر کے راہی ہوا۔ قصد یہ تھا کہ پلکھوے رہوں وہاں قافلے کی گنجائش نہ پائی۔ ہاپوڑ کو روانہ ہوا۔ دونوں برخوردار (باقر علی اور حسین علی) گھوڑوں پر سوار پہلے چل دیے۔ چار گھڑی دن رہے میں ہاپوڑ کی سرائے میں پہنچا۔ دونوں بھائیوں کو بیٹھے ہوئے اور گھوڑوں کو ٹہلتے ہوئے پایا۔ گھڑی بھر دن رہے قافلہ آیا۔ میں نے چھٹانک بھر گھی داغ کیا۔ دو شامی کباب اس میں ڈال دیے۔ رات ہو گئی تھی۔ شراب پی لی۔ کباب کھا لیے۔ لڑکوں نے ماہر کی کھچڑی پکوائی۔ خوب گھی ڈال کر آپ بھی کھائی اور سب آدمیوں کو بھی کھلائی۔ دن کے واسطے سادہ سالن پکوا لیا۔ ترکاری نہ ڈلوائی۔ چار پانچ بجے کے عمل میں ہاپوڑ سے چل دیا۔ سورج نکلے بابوگڑھ کی سرائے میں آپہنچا۔ چارپائی بچھائی۔ اس پر بچھونا بچھا کر حقہ پی رہا ہوں اور یہ خط لکھ رہا ہوں

ظاہر ہے کہ ان جزئیات نے ان کے خط کو ایک زندہ اور جاندار شے بنا دیا۔ گویا ان کا خط سینما کا پردہ تھا۔ جس پر ثاقب نے میرزا کے سفر کو اس رنگ میں دیکھ لیا کہ گویا وہ ساتھ تھا۔

نکتہ آفرینی میرزا ہر بات میں سے دلچسپ اور لطیف نکتے پیدا کر لیتے ہیں مثلاً:

(۱) چودھری عبدالغفور سرور مارہروی بیمار ہو گئے۔ صاحب عالم مارہروی نے اپنے خط میں ان کی علالت کا حال لکھا۔ میرزا چودھری صاحب کو لکھتے ہیں:

"آپ نے مزاج کی ناسازی کا حال کچھ نہ لکھا۔ اگر پیر و مرشد بھی نہ لکھتے تو میں کیونکر

اطلاع پاتا ہوں؛ اور اگر اطلاع نہ پاتا تو حصولِ صحت کی دعا کیوں کر مانگتا؟ کل سے وقتِ خاص میں دعا مانگ رہا ہوں۔ یقین ہے پہلے تم تندرست ہو جاؤ گے، زاں بعد یہ خط پاؤ گے۔

(۲) چودھری عبدالغفور سرور کے نام:

"غم ہائے روزگار نے مجھ کو گھیر لیا ہے۔ سانس نہیں لے سکتا۔ اتنا تنگ کر دیا ہے۔ ہر بات سو طرح سے خیال میں آئی پر دل نے کبھی تسلی نہ پائی۔ اب دو باتیں سوچا ہوں۔ ایک تو یہ کہ جب تک جیتا ہوں یوں ہی رویا کروں گا۔ دوسری یہ کہ آخر ایک نہ ایک دن مروں گا۔ یہ صغرٰے و کبرٰے دل نشین ہے، نتیجہ اس کا تسکین ہے"۔

(۳) میرزا نے چالیس پنتالیس برس کی عمر میں اپنی وفات کے متعلق ایک قطعہ کہا تھا جس سے ۱۲۷۷ھ تاریخ نکلتی تھی۔ غدر کے بعد مصائب نے انھیں گھیر لیا تو مختلف دوستوں کو لکھا کہ تھوڑی سی زندگی اور ہے ۱۲۷۷ھ میں مر جاؤں گا۔ لیکن موت کسی شاعر کے قطعۂ وفات کی پابند نہیں ہو سکتی۔ وہ نہ مرے۔ اتفاق سے اسی سال دہلی میں ہیضہ پھیلا۔ فرماتے ہیں وبائے عام میں مرنا میرے لیے باعثِ کسرِ شان تھا۔ صاحب عالم مارہروی نے ان کی مدح میں شعر کہے۔ انھیں لکھتے ہیں:

"خدا کی بندہ نوازیاں ہیں کہ مجھ ننگِ آفرینش کو خاصانِ درگاہ سے بھلا کہلواتا ہے۔ ظاہرا میرے مقدر میں یہ سعادتِ عظمٰے تھی کہ میں اس وبائے عام میں جیتا بچا۔ اللہ اللہ! ایسے کشتنی و سوختنی کو یوں بچا یا اور پھر اس رتبے کو پہنچایا۔ واسطے خدا کے اور اشعار نہ فرمایئے گا ورنہ بندہ دعوئے خدائی کرنے میں محابا نہ کرے گا۔

(۴) میر سرفراز حسین کے نام:

"تمھارے دستخطی خط نے میرے ساتھ وہ کیا جو بوئے پیرہن۔ نے یعقوبؑ کے ساتھ کیا۔ میاں یہ ہم تم بوڑھے ہیں یا جوان ہیں، توانا ہیں یا ناتوان ہیں، بڑے بیش قیمت ہیں۔ یعنی بہر حال غنیمت ہیں۔ کوئی جلا بھنا کہتا ہے:۔

یادگار زمانہ ہیں ہم لوگ   یاد رکھنا فسانہ ہیں ہم لوگ

وہی بالاخانہ ہے اور وہی میں ہوں۔ سیڑھیوں پر نظر ہے کہ وہ میر مہدی آئے، وہ میر سرفراز حسین آئے، وہ میرن آئے، وہ یوسف علی خاں آئے۔ مرے ہوؤں کا نام نہیں لیتا۔ بچھڑے ہوؤں میں سے کچھ گنتے ہیں۔ اللہ اللہ ہزاروں کا میں ماتم دار ہوں۔ میں مروں گا تو مجھ کو کون روئے گا؟

(۵) نواب علاءُ الدین خاں علائی کے نام:

"دو جانے میں میرا انتظار اور میرے آنے کا تقریب شادی پر مدار، یہ بھی شعبہ ہے انھیں ظنون کا، جن سے تمھارے چچا (ضیاءالدین احمد خاں نیر) کو گمان ہے مجھ پر جنون کا۔ جاگیر دار میں نہ تھا کہ ایک جاگیردار مجھ کو بلاتا۔ گویا میں نہ تھا کہ اپنا ساز و سامان لے کر چلا جاتا۔ دو جانے جاکر شادی گماؤں اور پھر اس فصل میں کہ دنیا کرہ نار ہو۔ لوہار، بھائی کے دیکھنے کو نہ جاؤں اور پھر اس موسم میں کہ جاڑے کی گرمی بازار ہو"۔

(۶) نواب علائی کے نام:

"استاد میر جان کو اس راہ سے کہ میری پھوپی ان کی چچی تھیں اور یہ مجھ سے عمر میں چھوٹے ہیں۔ دعا! اور اس وجہ سے کہ دوست ہیں اور دوستی میں کمی بیشی سن و سال کی رعایت نہیں کرتے، سلام! اور اس سبب سے کہ استاد کہلاتے ہیں، بندگی! اور اس نظر سے کہ یہ سید ہیں، درود! اور موافق اس مصرع کے "سوی اللہ و اللہ مافی الوجود"، سجود۔

شکوہ اور معذرت (۱) میرزا حاتم علی بیگ مہر کے نام:

"بندہ پرور! فقیر شکوے سے برا نہیں مانتا مگر شکوے کے فن کو سوائے میرے کوئی نہیں جانتا۔ شکوے کی خوبی یہ ہے کہ راہ راست سے منہ نہ موڑے اور معہذا دوسرے کے واسطے جواب کی گنجایش نہ چھوڑے۔

سوچیے کہ شکوے کی تعریف اس سے بہتر کیا ہو سکتی ہے؟ شکوہ حقیقتہً یہی ہے، محض دوسرے پر الزام دھرنے کے اضطراب کو "شکوہ" قرار دینا بالکل غلط ہوگا۔

(۲) بعض اوقات شکایت کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں ابھی شکایت نہیں کرتا۔ مثلاً حاتم علی بیگ مہر کو دو ایک کاموں کے لیے لکھا تھا جو مشکل نہ تھے۔ وہ نہ ہو سکے تو اُن کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ابھی شکایت نہیں کرتا۔ پوچھتا ہوں کہ یہ امور مقتضی شکایت ہیں یا نہیں؟"

(۳) شکایت کا ایک لطیف طریقہ میرزا نے تفتہ کے نام ایک خط میں اختیار کیا۔ جے پور سے ان کے لیے پانسو روپے مع خلعت تجویز ہو چکے تھے متوسط نے اطلاع بھیجی کہ ہولی کے بعد لے کر چلوں گا۔ یہ وعدہ پُورا نہ ہُوا۔ میرزا کو روپے کی ضرورت تھی۔ تفتہ کو جو متوسط کے دوست تھے، لکھتے ہیں:

"پھاگن، چیت، بیساکھ نہیں معلوم ہولی کس مہینے میں ہوتی ہے۔ آگے تو پھاگن میں ہوتی تھی۔"

(۴) میرزا تاریخیں کہنے سے بہت گھبراتے تھے۔ ایک مرتبہ نواب علاء الدین احمد خاں کو لکھا:

"میں مادۂ تاریخ نکالنے میں عاجز ہوں۔ لوگوں کے مادے دیے ہوئے نظم کر دیتا ہوں اور جو مادہ اپنی طبیعت سے پیدا کرتا ہوں وہ بیشتر لچر ہوا کرتا ہے۔"

نواب موصوف نے ایک مرتبہ اپنے نومولود فرزند کا تاریخی نام تجویز کرنے اور تاریخ ولادت کہنے کی فرمائش کی۔ میرزا معذرت کرنا چاہتے تھے، اس کے لیے بالکل نیا طریقہ اختیار کیا۔

"شیر اپنے بچوں کو شکار کا گوشت کھلاتا ہے، طریق صید افگنی سکھاتا ہے۔ جب وہ جوان ہو جاتے ہیں تو آپ شکار کر کھاتے ہیں۔ تم سخنور ہو گئے۔ حُسنِ طبع خداداد رکھتے ہو۔

ولادت فرزند کی تاریخ کیوں نہ کہو؟ اسم تاریخی کیوں نہ نکال لو کہ مجھ پیر غم زدہ "دل مردہ کو تکلیف دو؟ علاؤ الدین خاں، تیری جان کی قسم، میں نے پہلے لڑکے کا اسم تاریخی نظم کر دیا تھا اور وہ لڑکا نہ جیا۔ مجھ کو اس وہم نے گھیرا ہے کہ میری نحوست طالع کی تاثیر سے میرا ممدوح جیتا نہیں۔ نصیر الدین حیدر اور امجد علی شاہ (والیان اودھ) ایک ایک قصیدے میں چل دیے۔ واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے، پھر سنبھل نہ سکے۔ جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے، وہ عدم سے بھی پرے پہنچا۔ صاحب! دہائی خدا کی۔ میں نہ تاریخ ولادت کہوں گا، نہ تاریخی نام ڈھونڈوں گا۔ حق تعالیٰ تم کو اور تمھاری اولاد کو سلامت رکھے اور عمر و دولت اور اقبال عطا کرے۔"

تاریخی پرواز میرزا کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ بعض اوقات حرفِ مطلب کو تاریخی پرواز دے کر بے حد پُر تاثیر بنا دیتے ہیں۔ مثلاً:

(۱) نواب علاؤ الدین خاں علائی زمانۂ ولی عہدی میں لوہارو میں تھے اور اپنے والد کے اذن و اجازت کے بغیر دہلی نہیں آ سکتے تھے۔ سخت پریشان تھے۔ اس لیے کہ لوہارو میں دہلی کی رنگین اور دل آویز صحبتیں میسّر نہیں آ سکتی تھیں۔ میرزا لکھتے ہیں:

"تمھارے حال میں غور کی اور چاہا کہ اس کی نظیر بہم پہنچاؤں۔ واقعۂ کربلا سے نسبت نہیں دے سکتا۔ لیکن واللہ تمھارا حال اس ریگستان میں بعینہٖ ایسا ہے جیسا مسلمؒ ابن عقیل کا حال کوفے میں تھا۔"

اس طرح تاریخی پرواز نے علائی کی مصیبتوں کا جو نقشہ پیش کر دیا، اُسے کوئی تفصیل زیادہ جامع اور پُر تاثیر نہیں بنا سکتی۔

(۲) اسی طرح ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "تمھارے دستخطی خط نے میرے ساتھ وہ کیا جو پیرہن نے یعقوب کے ساتھ کیا۔"

(۳) علاؤ الدین خاں علائی کے نام:

"کل تمہارے خط میں دو بار یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دلی بڑا شہر ہے ہر قسم کے آدمی وہاں ہوں گے۔ اے میری جان، یہ وہ دلّی نہیں جس میں تم پیدا ہوئے۔ وہ دلی نہیں، جس میں تم نے علم حاصل کیا۔ وہ دلی نہیں، جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آیا کرتے تھے وہ دلّی نہیں جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں۔ ایک کیمپ ہے مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ، باقی سراسر ہنود۔

دیکھیے کس طرح دلّی کی عظمت کے معروف ادوار کی نفی کر کے حقیقت حال نہایت موثر انداز میں مکتوب الیہ پر واضح کر دی۔ نفی کے بعد جو اثباتی پہلو پیش کیے، وہ بھی احسن طریق پر موضح مدعا ہوئے کیمپ عرف عام میں فوجیوں کی قیامگاہ یا چھاؤنی کو کہتے ہیں۔ دلّی اس زمانے میں یقیناً کیمپ تھا۔ مسلمانوں کی عظمت و عزت دلی کی خصوصیت تھی۔ وہ جاتی رہی۔ مسلمان امرا مٹ گئے۔ باقی صرف اہل حرفہ رہ گئے یا چپراسی، جمعدار، خانسامے وغیرہ۔

مزاح و ظرافت میرزا کے مزاج میں شوخی اور ظرافت اس درجہ تھی کہ خواجہ حالی نے فرمایا: انھیں بجائے "حیوان ناطق" کے "حیوان ظریف" کہنا بجا ہے۔ یہ شوخی اور ظرافت خطوں میں بھی جا بجا موجود ہے مثلاً

(۱) بعض مقامات پر محض نقالی سے لطف ظرافت پیدا کر لیتے ہیں حسین علی خاں (ابن زین العابدین عارف)، بچہ تھا اور بچوں کی زبان بول چال میں صاف نہیں ہوتی۔ میرزا نے اپنے خط میں حسین علی خاں کا ذکر کیا تو ساتھ ہی لکھا:

"وہ حسین علی خاں جس کا روزمرہ ہے کھلونے منگا دو، میں بھی بجار (بازار) جاؤں گا"

(۲) ان کی ایک ملازمہ تھی "بی وفادار" جسے بیگم غالب نے "وفادار بیگ" خطاب دے دیا تھا۔ میرزا غالب نے ایک خط میں اس کے عادات کا نقشہ کھینچا ہے:

"باہر نکلتی ہیں، سودا تو کیا لائیں گی، مگر خلیق اور ملنسار ہیں۔ رستہ چلتوں سے باتیں کرتی پھرتی ہیں۔ جب وہ محل سے نکلیں گی تو ممکن نہیں کہ اطراف نہر کی سیر نہ کریں۔ ممکن نہیں دروازے کے سپاہیوں سے باتیں نہ کریں، ممکن نہیں کہ پھول نہ توڑیں اور بی بی کو لے جا کر نہ دکھائیں اور نہ کہیں کہ "یہ پھول تمھارے چچا کے بیٹے کی کیائی کے ہیں" (تمھارے چچا کے بیٹے کی کیاری کے ہیں)"

مراد ہے امین الدین احمد خاں والی لوہارو سے جو بیگم غالب کے چچیرے بھائی تھے۔

(۳) بعض اوقات موقع اور موضوع کی مناسبت کو پیش نظر رکھتے ہوئے موزوں نام تراش لیتے ہیں، جو بے حد مزا دیتے ہیں اور باوجود بے معنی ہونے کے میرزا کے مطلب کو بھی ٹھیک ٹھیک ادا کرتے ہیں۔ مثلاً فارسی کے ایک قطعہ میں اپنے متعلق کہتے ہیں:

چوں نہ من ساقیم نہ محتسبم — زبہ ریزم، نہ مے بہ کاس کنم
نہ بواجب زسعی و امانم — نہ بہ ہر حال مدعا مکاس کنم
بو مدارا اگر مدارا نہم — کاخ الفت قوی اساس کنم
لیک ناید ز من کہ در گفتار
مدحت لالہ سورداس کنم

لالہ سورداس کے نام سے دماغ میں جیسی شخصیت کا تصور ابھر سکتا ہے، اس کی تفصیل میں دفتر سیاہ کر دیجیے۔ لیکن یہ نام جن اوصاف و محاسن کا جامع ہے، ان کی پوری تصویر کبھی نہیں اتر سکے گی اور نہ اس میں وہ لطف پیدا ہوگا۔ جو ان تین لفظوں کی موجودہ ترتیب میں ہے:

(۱) اسی طرح انور الدولہ شفق کو لکھتے ہیں:

"ڈاک کا ہرکارہ جو بلی ماراں کے خطوط پہنچاتا ہے، ان دنوں میں ایک بنیا،

پڑھا لکھا، حرف شناس کوئی فلاں ناتھ ڈھمک داس ہے"۔

ہرکارے کی حرف ناشناسی کی جو تصویر "فلاں ناتھ" "ڈھمک داس" میں کھینچ دی گئی ہے وہ کسی توضیح کی محتاج نہیں۔

(۲) جب انھیں کوئی دلچسپ واقعہ مل جاتا تھا تو اپنے خاص انداز میں بیان کر کے اسے بے حد پُر لطف بنا دیتے تھے۔ مثلاً جس ہرکارے کا ذکر اُوپر آ چکا ہے۔ اسی کے متعلق لکھتے ہیں:

"میں بالاخانے پر رہتا ہوں۔ حویلی میں آ کر اس نے داروغے کو خط دے کر مجھ سے کہا کہ ڈاک کا ہرکارہ بندگی عرض کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مبارک ہو آپ کو جیسا کہ دلی کے بادشاہ نے نوابی کا خطاب دیا تھا، اب کالپی سے خطاب کپتانی کا ملا۔ حیران، کہ یہ کیا بکتا ہے۔ سرنامے کو غور سے دیکھا۔ کہیں قبل از اسم "مخدوم نیاز کیشاں" لکھا تھا۔ اس قرمساق نے اور الفاظ سے قطع نظر کر کے "کیشاں" کو "کپتان" پڑھا۔

(۳) بعض اوقات اپنی مصیبتوں اور پریشانیوں کا نقشہ اس انداز میں کھینچتے ہیں کہ پڑھتے ہی بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے۔ مثلاً قربان علی بیگ سالک کو لکھتے ہیں:

"آپ اپنا تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلّت سے خوش ہوتا ہوں یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصوّر کیا ہے۔ جو دُکھ مجھے پہنچتا ہے۔ کہتا ہوں کہ لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی دان ہوں۔ آج دُور دُور تک میرا جواب نہیں لے اب تو قرضداروں کو جواب دے سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا، بڑا کافر مرا۔ ہم نے ازراہِ تعظیم جیسا بادشاہوں کے بعد جنت آرامگاہ و عرش نشیمن خطاب دیتے ہیں، چونکہ یہ اپنے آپ کو شہنشاہ قلمرو سخن جانتا تھا۔ "سقر مقر" اور "زاویہ ہاویہ" خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ "آئیے نجم الدولہ بہادر" ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرضدار بھوگ سُنا رہا ہے میں ان سے پوچھ رہا ہوں: "اجی حضرت نواب صاحب! نواب صاحب کیسے اوغلان

صاحب! آپ سلجوقی و افراسیابی ہیں یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے۔ کچھ تو بولو، کچھ تو کہو"
بولے کیا بے حیا، بے غیرت، کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا،
میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لیے جاتا تھا۔ یہ بھی تو سوچا ہوتا کہ کہاں
سے دوں گا؟

مقفیٰ عبارت میرزا کے زمانے میں عالمانہ انداز بیان کی ایک نمایاں خصوصیت یہ
سمجھی جاتی تھی کہ پوری عبارت مقفیٰ ہو۔ چنانچہ خود میرزا نے بھی تقریظوں اور دیباچوں میں
یہی ڈھنگ اختیار کیا ہے اور اہل ذوق کی خدمت میں یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ کہ
تقریظیں اور دیباچے کتنے ہی "عالمانہ" ہوں۔ لیکن انھیں میرزا کے معروف انداز نگارش
سے کوئی مناسبت نہیں۔ خطوط میں بھی میرزا نے کہیں کہیں مقفیٰ عبارت لکھی ہے۔ لیکن اس
طرح نہیں کہ فقروں کے خواتیم میں قافیے کا التزام کر لیا بلکہ بے تکلف لکھتے لکھتے خود بخود قافیے
پیدا ہو گئے۔ وہ اتنے خوشنما معلوم ہوتے ہیں کہ گویا سونے کی انگوٹھی میں بیش قیمت ہیرے
جڑ دیے۔ مثلاً

(۱) منشی شیو نراین آرام نے اکبرآباد سے لکھا کہ اخبار کے کچھ خریدار بنانے کی سعی
فرمایے۔ جواب میں لکھتے ہیں:

"یہاں آدمی کہاں ہے کہ اخبار کا خریدار ہو! مہاجن لوگ جو یہاں بستے ہیں، یہ
ڈھونڈھتے ہیں کہ گیہوں کہاں سستے ہیں۔ بہت سخی ہوں گے تو جنس پوری تول دیں گے
کاغذ روپے مہینے کا کیوں مول لیں گے؟"

(۲) میر مہدی مجروح کے نام:

"او میاں سید زادۂ آزادہ، دلی کے عاشق دلدادہ، ڈھے ہوئے اردو بازار کے
رہنے والے، حسد سے لکھنؤ کو برا کہنے والے، نہ دل میں مہر و آزرم، نہ آنکھوں میں حیا و
شرم۔ نظام الدین ممنون کہاں؟ ذوق کہاں؟ مومن خاں کہاں؟ ایک آزردہ سو خاموش

دوسرے غالب، وہ بے خود و مدہوش۔ نہ سخنوری رہی نہ سخندانی، کس برتے پر تتا پانی۔ ہائے دلی! وائے دلی، بھاڑ میں جائے دلی۔

(۳) مجروح کے نام:

"سید صاحب، نہ تم مجرم، نہ میں گنہ گار، تم مجبور میں لاچار۔ لو اب میری کہانی سنو۔ میری سرگذشت میری زبانی سنو"۔

(۴) مجروح کے نام:

"بھائی تم اردو کے میرزا قتیل بن گئے ، اردو بازار میں نہر کے کنارے رہتے رہتے رود نیل بن گئے کیسا قتیل کیسا رود نیل، یہ سب ہنسی کی باتیں ہیں۔ لو سنو، اب تمھاری دلی کی باتیں ہیں"

کمال حسن تحریر یہ میرزا کے اسلوب نگارش کے چند نمایاں پہلو تھے۔ انھوں نے مکاتیب کے مختصر سے مجموعے میں جو تحریری کمالات دکھائے، اُن کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔ اس بارے میں خاص طور پر قابلِ ذکر و توجّہ امر یہ ہے کہ ان کی تحریر میں سے ایک لفظ کو آگے پیچھے کرنے یا بدلنے یا حشو و زوائد قرار دینے کی گنجایش نہیں نکل سکتی۔ جو کچھ لفظوں میں اور جس ترتیب کے ساتھ بیان کر گئے ہیں، اس مضمون کے لیے اس سے بہتر الفاظ اور پیرایہ بیان اختیار کرنا ممکن نہیں۔ مثلاً:

(۱) میرزا غدر کے بعد شدید مصیبتوں میں مبتلا تھے۔ صاحب عالم مارہروی نے لکھا کہ والیِ حیدرآباد کے لیے قصیدہ کہیے تو اسے ایک متوسل کے ذریعہ سے پیش کر دیا جائے گا جواب میں لکھتے ہیں:

"میں پانچ برس کا تھا کہ میرا باپ مرا، نو برس کا تھا کہ چچا مرا۔ اس کی جاگیر کے عوض میرے اور میرے شرکائے حقیقی کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں دس ہزار روپے سال مقرر ہوئے۔ انھوں نے نہ دیے مگر تین ہزار روپے سال۔ اس میں خاص میری ذات

کا حصہ ساڑھے سات سو روپے سال۔ میں نے سرکار انگریزی میں یہ غبن ظاہر کیا۔ کول بروک صاحب ریذیڈنٹ دہلی اور اسٹرلنگ صاحب بہادر سکرٹر گورنمنٹ کلکتہ متفق ہوئے میرا حق دلانے پر۔ ریذیڈنٹ معزول ہوئے۔ سکرٹر گورنمنٹ بمرگ ناگاہ مر گئے۔ بعد ایک زمانے کے پادشاہ دہلی نے پچاس روپے مہینہ مقرر کیا، اُن کے ولی عہد نے چار سو روپے سال۔ ولی عہد اس تقرر کے دو برس بعد مر گئے۔ واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے بہ صلہ مدح گستری پانچ سو روپے سال مقرر ہوئے۔ وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جئے۔ یعنی اگرچہ اب تک جیتے ہیں، مگر سلطنت جاتی رہی اور تباہی سلطنت بعد دو ہی برس میں ہوئی۔ دلی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی۔ سات برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی۔ ایسے طالع مربی کش اور محسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ اب میں جو والیِ دکن کی طرف رجوع کروں، یاد رہے کہ متوسط یا مر جائے گا یا معزول ہو جائے گا اور اگر یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے تو کوشش اس کی ضائع ہو جائے گی اور والیِ شہر مجھ کو کچھ نہ دے گا۔ اور اگر احیاناً اس نے سلوک کیا تو ریاست خاک میں مل جائے گی اور ملک میں گدھے کے ہل پھر جائیں گے۔ اے خداوند بندہ پرور! یہ سب باتیں وقوعی اور واقعی ہیں۔"

(۲) میر مجروح کے نام:

"بھائی، کیا پوچھتے ہو؟ کیا لکھوں؟ دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع بازار مسجد جامع کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں۔ پھر کہو دلی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔"

پھر گورنر جنرل کے دربار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ پہلے دربار میں سات جاگیردار تھے کہ ان کا دربار الگ الگ تھا:

چار معدوم محض ہیں جو باقی رہے ان میں سے دوجانہ اور لوہارو تحت حکومت ہانسی، حصار، پاٹودی حاضر۔ اگر ہانسی حصار کے صاحب کمشنر بہادر ان دونوں کو یہاں لے آئے تو تین رئیس ورنہ ایک رئیس ۔ دربار عام والے مہاجن لوگ سب موجود۔ اہل اسلام میں سے صرف تین آدمی باقی ہیں:

میرٹھ میں مصطفےٰ خاں، سلطان جی میں مولوی صدرالدین خاں، بلی ماروں میں سگ دنیا موسوم بہ اسد۔ تینوں مردود، مطرود، محروم، مغموم:

توڑ بیٹھے جبکہ ہم جام و سبو، پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گو برسا کرے"

(۳) رام پور پہنچ کر لکھتے ہیں:

"غذا میرے بھی خلاف طبع نہیں۔ پانی کا شکر کس منہ سے ادا کروں؟ ایک دریا ہے کوسی، سبحان اللہ اتنا میٹھا پانی کہ پینے والا گمان کرے کہ یہ پھیکا شربت ہے۔ صاف، سبک، گوارا، سریع النفوذ۔"

پانی کی مٹھاس کے لیے "پھیکے شربت" کی تعبیر کتنی عمدہ اور دل نشیں ہے! دو لفظوں میں اس سے بہتر تعبیر کیا ہو سکتی ہے جو مٹھاس کے متعلق تاثر کی ٹھیک ٹھیک آئینہ دار بن سکے؟

(۴) خواجہ غلام غوث خاں بے خبر کے نام:

"آپ جانتے ہیں کہ کمال یاس مقتضی استغنا ہے۔ بس اب اس سے زیادہ یاس کیا ہو گی کہ بہ امید مرگ جیتا ہوں۔ اس راہ سے کچھ مستغنی ہو چلا ہوں۔ دو ڈھائی برس کی زندگی اور ہے۔ ہر طرح گزر جائے گی۔ جانتا ہوں کہ تم کو ہنسی آئے گی کہ یہ کیا بکتا ہے۔ مرنے کا زمانہ کون بتا سکتا ہے؟ چاہے الہام سمجھیے، چاہے اوہام سمجھیے۔ بیس برس سے یہ قطعہ لکھ رکھا ہے:

من کہ باشم کہ جاوداں باشم | چوں نظیری نہ ماند و طالب مرد
در بہ پرسند در کدام سالی | مرد غالب؟ بگو کہ "غالب مرد"

اب بارہ سو چھتر ہیں اور "غالب مرد" کے بارہ سو ستتر ہیں۔ اس عرصے میں جو کچھ مسرت پہنچنی ہو پہنچ لے۔ ورنہ پھر ہم کہاں"

(۵) انور الدولہ شفق کے نام:

"سال گزشتہ مجھ پر بہت سخت گزرا۔ بارہ تیرہ مہینے صاحب فراش رہا۔ اُٹھنا بیٹھنا دشوار تھا چلنا پھرنا کیسا؟ نہ تپ، نہ کھانسی نہ اسہال، نہ فالج، نہ لقوہ۔ ان سب سے بد تر ایک صورت پر کدورت یعنی احتراق کا مرض۔ مختصر یہ کہ سر سے پاؤں تک بارہ پھوڑے، ہر پھوڑے پر ایک زخم، ہر زخم ایک غار، ہر روز بارہ تیرہ پھاہے اور پاؤ بھر مرہم درکار۔ نو دس مہینے سے بے خور و خواب رہا ہوں اور شب و روز بے تاب۔ راتیں یوں گزری ہیں کہ اگر کبھی آنکھ لگ گئی، دو گھڑی غافل رہا ہوں گا کہ ایک آدھ پھوڑا میں ٹیس اٹھی جاگ اُٹھا، تڑپا کیا، پھر سو گیا۔ پھر ہوشیار ہو گیا۔ سال بھر میں تین حصّے یوں گزرے، پھر تخفیف ہونے لگی۔ دو تین مہینے میں لوٹ پوٹ کر اچھا ہو گیا۔ نئے سرے سے روح قالب میں آئی۔ اجل نے میری سخت جانی کی قسم کھائی۔ اب اگرچہ تندرست ہوں، ناتوان و سست ہوں۔ حواس کھو بیٹھا، حافظہ کو رو بیٹھا۔ اگر اُٹھتا ہوں تو اتنی دیر میں اٹھتا ہوں کہ جتنی دیر میں قد آدم دیوار اُٹھے۔ آپ کی پرسش کے کیوں نہ قربان جاؤں کہ جب تک میرا مرنا نہ سُنا، میری خبر نہ لی۔ میری مرگ کے مخبر کی تقریر اور یہ میری تحریر، آدھی سچ اور آدھی جھوٹ۔ در صورت مرگ نیم مُردہ اور حالت حیات نیم زندہ ہوں۔"

(۶) امین الدین احمد خاں والی لوہارو نے بلایا۔ میرزا ضعف کے باعث جا نہیں سکتے تھے۔ لکھتے ہیں:

"واللہ نہیں آسکتا۔ باللہ نہیں آسکتا۔ دل کی جگہ میرے پہلو میں پتھر بھی تو نہیں، دوست نہ سہی، دشمن بھی تو نہ ہوں گا۔ محبت نہ سہی، عداوت بھی تو نہ ہوگی۔ آج تم دونوں بھائی (امین الدین خاں اور ضیاء الدین خاں)، اس خاندان میں شرف الدولہ اور فخر الدولہ

ہو، میں لم یلد ولم یولد ہوں - میری زوجہ تمہاری بہن، میرے بچے تمہارے بچے ہیں۔ خود جو میری بھتیجی ہے - اس کی اولاد بھی تمہاری اولاد ہے - نہ تمہارے واسطے بلکہ ان بیکسوں کے واسطے تمہارا دعاگو ہوں اور تمہاری سلامتی چاہتا ہوں - تمنا یہ ہے اور انشاءاللہ تعالیٰ ایسا ہی ہوگا کہ تم جیتے رہو اور میں تم دونوں کے سامنے مر جاؤں تاکہ اس قافلے کو اگر روٹی نہ دو گے تو چنے تو دو گے - اگر چنے بھی نہ دو گے اور بات نہ پوچھو گے تو میری بلا سے - میں تو موافق اپنے تصور کے مرتے وقت ان فلک زدوں کے غم میں نہ الجھوں گا"

(۷) علاؤالدین احمد خاں علائی کے نام:

" اگرچہ یک فنہ ہوں، مگر مجھے اپنے ایمان کی قسم، میں نے اپنی نظم ونثر کی داد بہ اندازۂ بایست پائی نہیں - آپ ہی کہا اور آپ ہی سمجھا - قلندری و آزادگی و ایثار وکرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیئے، ان میں سے بقدر ہزار ایک ظہور میں نہ آئے - نہ وہ طاقت جسمانی کہ لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ٹین کا ایک لوٹا مع، سوت کی رسّی کے، لٹکا لوں اور پیادہ پا چل دوں - کبھی شیراز جا نکلا، کبھی مصر میں جا ٹھہرا، کبھی نجف جا پہنچا - نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں - اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے تو نہ سہی جس شہر میں رہوں - اس میں بھوکا ننگا تو نظر نہ آئے ..... خدا کا مقہور، خلق کا مردود، بوڑھا، ناتواں، بیمار، فقیر، نکہت میں گرفتار"

(۸) امین الدین احمد خاں نے حاجی جان محمد قدسی کی ایک غزل پر غزل کہنے کی فرمائش کی - علائی کو لکھتے ہیں:

" بھائی، تمہارا باپ بدگمان ہے - مجھ کو زندہ سمجھتا ہے - میرا سلام کہو اور میرا یہ شعر پڑھ سناؤ:

گمان زیست بود برمنت ز بے دردی بد است مرگ، ولے بدتر از گمان تو نیست

مجھے کافور و کفن کی فکر پڑ رہی ہے اور وہ ستمگر شعر وسخن کا طالب ہے"

(۹) علائی نے مکان کا پتہ بہ اصرار پوچھا۔ جواب میں لکھتے ہیں:

"قسم شرعی کھا کر کہتا ہوں کہ ایک شخص ہے کہ اس کی عزت اور نام آوری جمہور کے نزدیک ثابت اور مستحق ہے اور صاحب، تم بھی جانتے ہو۔ مگر جب تک اس سے قطع نظر نہ کرو اور اس مسخرے کو گمنام و ذلیل نہ سمجھ لو۔ تم کو چین نہ آئے گا۔ پچاس برس سے دلی میں رہتا ہوں۔ ہزارہا خط اطراف و جوانب سے آتے ہیں۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلہ نہیں لکھتے۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلہ سابق کا نام لکھ دیتے ہیں۔ حکام کے خطوط فارسی و انگریزی یہاں تک کہ ولایت کے آئے ہوئے، صرف شہر کا نام اور میرا نام۔ یہ سب مراتب تم جانتے ہو اور ان خطوط کو دیکھ چکے ہو اور پھر مجھ سے پوچھتے کہ اپنا مسکن بتا۔ اگر میں تمھارے نزدیک امیر نہیں نہ سہی، اہل حرفہ میں سے بھی نہیں ہوں کہ جب تک محلہ اور تھانہ نہ لکھا جائے، ہرکارہ میرا پتہ نہ پائے۔"

تعزیتی خطوط مرزا کے کمال تحریر کا ایک نمونہ تعزیتی خطوط میں دیکھا جا سکتا ہے امین الدین احمد خاں والی لوہارو کی والدہ فوت ہو گئیں۔ انھیں لکھتے ہیں:

"بھائی صاحب، آج تک سوچتا رہا کہ بیگم صاحبہ قبلہ کے انتقال کے باب میں تم کو کیا لکھوں؟ تعزیت کے واسطے تین باتیں ہیں: اظہار غم، تلقین صبر، دعائے مغفرت۔ سو بھائی اظہار غم تکلف محض ہے۔ جو غم تم کو ہوا، ممکن نہیں دوسرے کو ہوا ہو۔ تلقین صبر بے دردی ہے۔ یہ سانحہ عظیم ایسا ہے جس نے غم رحلت نواب مغفور (احمد بخش خاں) کو تازہ کر دیا۔ پس ایسے موقع پر صبر کی تلقین کیا کی جائے؟ رہی مغفرت، میں کیا اور میری دعا کیا؟ مگر چونکہ وہ میری مربیہ اور محسنہ تھیں، دل سے دعا نکلتی ہے۔"

یوسف مرزا کی والدہ کی وفات پر:

"یوسف مرزا کیونکر تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ مر گیا اور اگر لکھوں بھی تو آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو، مگر صبر؟ یہ ایک شیوہ فرسودہ ابنائے روزگار کا ہے۔ تعزیت

یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے ہیں کہ صبر کرو۔ ہائے، ایک کا کلیجہ کٹ گیا اور لوگ اسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ۔ بھلا کیوں کر نہ تڑپے گا؟ صلاح اس میں نہیں بتائی جاتی، دعا کو دخل نہیں، دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا مرا، پھر باپ مرا۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سر و پا کس کو کہتے ہیں؟ تو میں کہوں گا کہ یوسف میرزا کو۔ تمھاری دادی لکھتی ہیں کہ رہائی کا حکم ہو چکا تھا (یعنی قید فرنگ سے بعد از غدر) یہ بات سچ ہے؟ اگر سچ ہے تو جوانمرد ایک بار دونوں قیدوں سے چھوٹ گیا، نہ قید حیات رہی، نہ قید فرنگ۔"

نواب یوسف علی خاں فرمانروائے رام پور کے نام اُن کی والدہ کی وفات پر:

"نواب میرزا (داغ دہلوی) نے دلّی آکر پہلے نوید بزم آرائی سنائی۔ چاہتا تھا کہ اس کی تہنیت لکھوں۔ کل اس نے از روئے خط آمدہ رام پور حضرت جناب عالیہ کے انتقال کی خبر سُنائی۔ کیا کہوں، کیا غم واندوہ کا ہجوم ہوا۔ حضرت کے غمگین ہونے کا تصوّر کرکے اور زیادہ مغموم ہُوا۔ بے درد نہیں ہوں کہ ایسے مقام میں بہ طریق انشاپردازی عبارت آرائی کروں۔ نادان نہیں ہوں کہ آپ جیسے دانا دل دیدہ ور کو تلقین صبر و شکیبائی کروں:

از دست گدائے بے نوا ناید ہیچ   جز آں کہ بہ صدق دل دعائے بہ کند"

میرزا کی شخصیت اور خطوط کے آئینے میں

میں نے میرزا کے اسلوب نگارش کی بعض نمایاں خصوصیات واضح کر دیں اور اس امر کی طرف شروع میں اشارہ کر چکا ہوں کہ ان چند سو خطوط میں میرزا نے اپنی شخصیت کے مختلف پہلو اس تفصیل کے ساتھ واضح کر دیئے ہیں کہ تنہا ان ہی کو سامنے رکھ کر ان کی زندگی کا جامع اور مکمل نقشہ تیار کیا جا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کے اوضاع و اطوار اور اخلاق و عادات کا کوئی پہلو بھی اس سے باہر نہ رہے گا۔ بے شائبہ مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ خطوط

محض اس وجہ سے بیش بہا نہیں ہیں۔ کہ غالب کے خطوط ہیں۔ بلکہ ان کی بیش بہائی کے دوسرے وجوہ بھی ہیں۔ مثلاً:

(۱) ان کے آئینے میں غالب کی شخصیت ایسے رنگ میں جلوہ گر نظر آتی ہے کہ اکثر اصحاب کو زندگی میں بھی اسے اس تفصیل سے دیکھنے کا موقع شاید ہی ملا ہو۔

(۲) یہ خطوط اُردو زبان میں گوناگوں اسالیب بیان کا ایک نہایت نادر اور دلکش مرقع ہیں۔

(۳) ان میں غالب کے سوانح حیات کا زیادہ سے زیادہ سرمایہ موجود ہے۔

(۴) ان میں غالب کے دل و دماغ کی مکمّل تصویر خود ان کے موقلم سے تیار ہو کر سامنے آگئی ہے اور یہ تصویر اس جامعیت کے ساتھ نہ ان کے کلیات نظم فارسی میں ملتی ہے نہ کلیات نثر فارسی میں اور نہ اُردو دیوان میں، جو ہمارے ہاں ان کی یگانہ شہرت کا شہپرِ پرواز ہے۔

غالب سے پہلے بھی بعض اکابرِ علم و فضل کے مکاتیب ترتیب پا کر شائع ہو چکے ہیں۔ انکے بعد بھی مشاہیر ادب اُردو کے خطوط عقیدت مندوں نے مرتب کر کے چھاپ دیئے۔ لیکن اس حقیقت کے اعتراف میں غالباً کسی صاحب فہم و نظر کو بھی تامّل نہ ہوگا کہ غالب نے اپنی سرسری تحریرات میں ذات و ماحول کے متعلق معلومات کا جو گراں قدر ذخیرہ بے قصد و ارادہ فراہم کر دیا ہے اس کا عشر عشیر بھی کسی دوسرے مجموعے میں نظر نہ آئے گا، اور اسلوب فکر و نگارش میں ابداع کی جو فراوانی غالب کے ہاں موجود ہے، اس کی مثالیں تو شاید ہی مل سکیں۔ گویا مکاتیب نگاری کے دائرے میں بھی غالب کی انفرادیت و یکتائی محتاجِ شرح و بیان نہیں کاش ان مکاتیب پر پوری توجہ فرمائی جائے اور غالب کے فارسی کلام کی طرح یہ شکوہ سنج بے اعتنائی نہ رہیں۔

مسلم ٹاؤن۔ لاہور۔ ۴ مئی ۱۹۵۱ء

مہر
مسلم ٹاؤن۔ لاہور

خاندانِ لوہارو

خاندانِ لوہارو کے حالات مختصراً یہ ہیں:

اٹھارھویں صدی کے وسط میں سمرقند سے تین بھائی پنجاب آئے: قاسم جان، عالم جان اور عارف جان۔ قاسم جان سب سے بڑے تھے۔ نواب معین الملک عرف میر منّو ناظمِ پنجاب نے بڑی قدر و منزلت کی۔ اِس لیے کہ میر منّو کے اجداد بھی تورانی تھے۔ چنانچہ ان بھائیوں نے کچھ مدّت لاہور میں میر منّو کے پاس گزاری۔ اس کی وفات پر نظامت پنجاب کا کارخانہ درہم برہم ہو گیا تو قاسم جان اپنے بھائیوں اور رفیقوں سمیت پنجاب سے آگے بڑھ گئے تاکہ کسی دوسری جگہ قسمت آزمائیں۔ اس زمانے میں شہزادہ عالی گوہر کو (جو بعد میں شاہ عالم ثانی کے لقب سے بادشاہ بنا) بہار میں تجربہ کار اور باتدبیر آدمیوں کی ضرورت تھی۔ قاسم جان بہار کی طرف روانہ ہو گئے۔ شہزادے کے پاس پہنچنے سے پہلے میر جعفر ناظم بنگال کے بیٹے میر صادق عرف میرن کا ایک قافلہ مل گیا جو شہزادے کی مخالف فوج کے لیے سامانِ رسد لیے جا رہا تھا۔ قاسم جان نے اس پر حملہ کر کے سارا سامان چھین لیا۔ شہزادے نے اس خدمت پر خوش ہو کر قاسم جان کو شرف الدولہ کا خطاب دیا اور اپنے رفقاءِ خاص میں داخل کر لیا۔

شہزادہ اپنے والد عزیز الدین عالمگیر ثانی کے قتل پر بادشاہ بن گیا۔ لیکن گیارہ بارہ برس اس نے پورب ہی میں گزار دیے۔ قاسم جان نے یہ مدّت غالباً پورب ہی میں بسر کی۔ جب ۱۷۷۱ء میں بادشاہ دہلی آیا تو قاسم جان بھی ساتھ آئے۔ انھیں کی وساطت سے نجف خاں ملازمت شاہی میں داخل ہوا اور ذوالفقار الدولہ خطاب پایا۔ اپنی وفات تک (۱۷۸۲ء) وہ سلطنت کا مختارِ عام بنا رہا۔ اس زمانہ میں قاسم جان اور ان کے

بھائیوں کی سکونت غالباً اسی محلہ میں رہی جو بعد میں گلی قاسم جان کے نام سے مشہور ہوا اور اب تک اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ میرزا غالب کے دادا میرزا قوقان بیگ بھی قاسم جان ہی کے ساتھ ہندوستان آئے تھے اور غالباً قاسم جان کے خاندان کے ساتھ اُن کی قرابت بھی تھی جس کا سلسلہ بعد میں بھی جاری رہا۔

ذوالفقار الدولہ نجف خاں کے انتقال پر دربارِ دہلی کا رنگ بگڑ گیا، یہاں تک کہ غلام قادر خاں روہیلے کے مختصر سے دورِ عروج میں شاہی خاندان پر ہولناک آفتیں نازل ہوئیں۔ شاہ عالم کو اندھا کر دیا گیا اور اُسے کہنا پڑا:

چشمِ من کندہ شد از جورِ فلک بہتر شد - تا نہ بینم کہ کند غیر جہانداری ما

اس زمانے میں قاسم جان دہلی سے دل برداشتہ ہو کر لکھنؤ چلے گئے اور آصف الدولہ کے پاس ملازمت کر لی۔ غالباً انھیں کے ساتھ میرزا غالب کے والد میرزا عبداللہ بیگ خاں بھی لکھنؤ گئے تھے۔ لکھنؤ ہی میں قاسم جان نے وفات پائی۔ ان کے اقربا اور متوسلین وہاں سے چلے آئے۔ عبداللہ بیگ خاں کے خاندان نے آگرے میں سکونت اختیار کر لی تھی اور وہ ملازمت کی غرض سے حیدرآباد چلے گئے۔ قاسم جان کا خاندان پہلے کی طرح دہلی میں مقیم ہو گیا۔

قاسم جان کے کتنے بیٹے تھے؟ تحقیقی طور پر معلوم نہیں لیکن دو کے نام ہم جانتے ہیں: ایک شرف الدولہ فیض اللہ بیگ خاں، دوسرے قدرت اللہ بیگ خاں۔ فیض اللہ بیگ خاں کے دو بیٹے تھے: اوّل غلام حسین خاں سرورؔ جو غالبؔ کے ہم زلف اور زین العابدین خاں عارفؔ کے باپ تھے۔ دوسرے غلام حسن خاں محوؔ۔ قدرت اللہ خاں کے دو بیٹوں اور ایک بیٹی کا ہمیں علم ہے۔ بڑے بیٹے معین الدین حسین خاں تھے جنھوں نے غدر کا روزنامچہ اُردو میں لکھا تھا۔ بھبو فلس مٹکاف نے اسے انگریزی میں چھاپا اور خواجہ

حسن نظامی نے اس کا ترجمہ اُردو میں چھپوایا۔ دوسرے بیٹے کا نام محمد حسین خاں تھا ان دونوں کا ذکر غالب کے خطوط میں آیا ہے۔ قدرت اللہ بیگ خاں کی بیٹی نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر کی بیگم تھی۔

قاسم جان کے بھائی عالم جان یا اس کی اولاد کا حال معلوم نہیں ہو سکا غالباً قربان علی بیگ سالک اور شمشاد علی بیگ رضوان اسی کے خاندان میں سے تھے۔

تیسرے بھائی عارف جان کے چار بیٹے تھے: فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش۔ نواب الٰہی بخش خاں معروف، محمد علی خاں اور نبی بخش خاں۔ احمد بخش خاں آخری دور کے امرائیں ممتاز فرد تھے۔ اپنی ذاتی قابلیت سے فیروز پور جھرکا (ضلع گوڑگانوہ) کی ریاست اور لوہارو کی جاگیر حاصل کی۔ ان کی دو بیگمیں تھیں: ایک میواتی الاصل اور دوسری ہم قوم۔ پہلی کے بطن سے نواب شمس الدین احمد خاں تھے۔ ہم قوم کے بطن سے نواب امین الدین خاں والی لوہارو اور نواب ضیاء الدین احمد خاں نیرؔ۔ اہل خاندان شمس الدین احمد خاں کو نسلاً اپنا ہم رتبہ نہیں سمجھتے تھے۔ اس وجہ سے خاندان میں مناقشت پیدا ہوئی جس نے انجام کار یہ شکل اختیار کر لی کہ شمس الدین احمد خاں ایک فریق بن گئے، باقی سارے خاندان نے ان کے خلاف جتھا بنا لیا

احمد بخش خاں نے اِن مناقشات کو روکنے کی غرض سے ریاست دو حصّوں میں بانٹ دی۔ فیروز پور جھرکا شمس الدین احمد خاں کے حوالے کر دیا۔ لوہارو کی جاگیر چھوٹے بیٹوں کو دے دی۔ ۱۸۲۶ء میں وہ اپنی حویلی واقع قطب صاحب میں گوشہ نشین ہو گئے۔ ۱۸۲۷ء میں وفات پائی۔

لیکن تقسیم کے باوجود جھگڑے قائم رہے۔ امین الدین احمد خاں اور ضیاالدین احمد خاں نے باپ کی جایداد منقولہ میں سے اپنے حصّے کا مطالبہ پیش کر دیا۔ شمس الدین احمد خاں لوہارو کے دعوے دار بن گئے۔ یہ کشاکش کئی برس تک جاری رہی۔ آخر لوہارو امین الدین احمد خاں

اور ضیاء الدین احمد خاں کو مل گیا۔ یہ فیصلہ چونکہ ولیم فریزر ریزیڈنٹ دہلی کی کوشش سے ہوا تھا، اس وجہ سے شمس الدین احمد خاں اور ولیم فریزر کے درمیان عداوت پیدا ہو گئی۔ ۱۸۳۵ء میں فریزر مارا گیا۔ اس سلسلے میں شمس الدین احمد خاں اور ان کا ایک سپاہی ماخوذ ہوئے۔ ان کو پھانسی کی سزا ملی اور فیروز پور جھرکہ کی ریاست ضبط کر لی گئی۔ شمس الدین احمد خاں کے نرینہ اولاد نہ تھی۔ صرف دو لڑکیاں تھیں۔ مشہور ہے کہ فصیح الملک میرزا داغ دہلوی شمس الدین احمد خاں کے صاحبزادے تھے، اگرچہ شمس الدین احمد خاں کی جایداد وغیرہ کے جو دعوے وارثوں کی طرف سے ہوئے تھے ان میں داغ کا کوئی ذکر نہیں۔

نواب امین الدین احمد خاں رئیس لوہارو قرار پائے اور ۱۸۶۹ء میں فوت ہوئے۔ اُن کے بڑے صاحبزادے اور وارث ریاست نواب علاؤالدین احمد خاں علائی تھے جنھیں میرزا غالب نے اپنا خلیفہ ثانی بنایا تھا۔ عربی اور فارسی کے بہت بڑے عالم اور خوش ذوق شاعر تھے۔ ترکی بھی بہت اچھی جانتے تھے۔ ترکی زبان کی ایک لغت بھی لکھی تھی۔ ۱۸۸۴ء میں فوت ہوئے۔ ان کے جانشین نواب سر امیر الدین احمد خاں تھے۔ جو ابتدا میں "فرخ میرزا" کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ بڑے خوش مذاق، علم دوست اور مجلس آرا بزرگ تھے۔ امین الدین احمد خاں، علاؤالدین احمد خاں اور امیر الدین احمد خاں تینوں کے نام غالب کے خطوط موجود ہیں۔

نواب امین الدین احمد خاں کے چھوٹے بھائی نواب ضیاء الدین احمد خاں کو منصبِ ریاست حاصل نہ تھا البتہ حصے کی رقم ملتی تھی۔ وہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ علم تاریخ میں اپنے عہد کے یگانہ ماہر سمجھے جاتے تھے۔ تاریخی کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کیا تھا۔ ایلیٹ نے انھیں سے نادر قلمی نسخے لے کر اپنی مشہور تاریخ انگریزی میں لکھی تھی۔ وہ اردو میں نیر اور فارسی میں رخشاں تخلص کرتے تھے۔ غالب نے انھیں اپنا خلیفہ اوّل بنایا تھا۔ غالب کے فارسی کلیات میں ایک قصیدہ ان کی مدح میں ہے۔ اس میں فرماتے ہیں

منم خزینۂ راز و وہ خزینۂ راز - ضیاے دینِ محمد کہیں برادرِ من
بہ دین و دانش و دولت یگانۂ آفاق - بہ عمر کہتر و از روے رتبہ بہتر من

عارف کے مرثیہ میں بھی ان کا ذکر آیا ہے:

ہم سے تھیں نفرت سہی نیّر سے لڑائی — بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

ان کا منتخب کلام "صحیفۂ زرّیں" کے نام سے چھپا تھا - آج کل کمیاب ہے ۱۸۸۵ء میں وفات پائی -

نیّر کے دو صاحبزادے تھے: شہاب الدین احمد خاں ثاقب اور سعید الدین احمد خاں طالب - دونوں علم و فضل میں خاندانی روایات کے حامل تھے - ثاقب نے ۶. محرم الحرام ۱۲۸۶ھ (مطابق ۹ اپریل ۱۸۶۹ء) کو یعنی غالب سے تقریباً دو ماہ بعد بعارضۂ تپ و اسہال وفات پائی اور حسب وصیت درگاہ قدم شریف میں اپنے عمِ محترم نواب شمس الدین احمد خاں کے پہلو میں دفن ہوئے - قربان علی بیگ سالک نے تاریخ کہی:

از صدمۂ مرگ ثاقبِ والا جاہ — ہر سو ست صداے نالہ ہاے جانکاہ
تاریخ وفاتِ او چنیں سالک گفت — روزِ ششم ماہِ محرم صد آہ

ان کے چار بیٹے تھے، جن میں سے تین کے نام معلوم ہو سکے - شجاع الدین احمد خاں تاباں - سراج الدین احمد خاں سائل اور بہاؤ الدین احمد خاں - تاباں اور سائل بوڑھے ہو کر فوت ہوئے - بہاؤ الدین احمد خاں کا انتقال جوانی ہی میں ہو گیا تھا - ان کی صرف ایک صاحبزادی تھی، جس کی شادی نواب سر ذو الفقار علی خاں مرحوم رئیس مالیر کوٹلہ سے ہوئی - وہ خدا کے فضل سے زندہ ہیں - تاباں کے کوئی اولاد نہ تھی - نواب سعید الدین احمد خاں طالب بھی لاولد فوت ہوئے -

نواب الٰہی بخش خاں معروف ابتدا ہی میں مولانا فخر الدین فخرِ عالم کے مرید بن گئے اور انھوں نے ساری عمر گوشہ نشینی میں گزار دی ان کے ایک بیٹا اور دو بیٹیاں تھیں

بیٹیوں میں سے بڑی یعنی آبادی بیگم کی شادی نواب غلام حسین خاں مسرور سے ہوئی - خدا نے دو بیٹے دیئے: زین العابدین خاں عارف اور حیدر حسن خاں چھوٹی یعنی امراؤ بیگم کی شادی میرزا غالب سے ہوئی - امراؤ بیگم کے اولاد نہ تھی - اس نے پہلے عارف کو اپنا بیٹا بنا لیا - عارف کی وفات پر اس کے دونوں بیٹوں باقر علی خاں کامل اور حسین علی خاں شاداں کو بیٹوں کی طرح پالا - باقر علی خاں پہلے الور میں ملازم ہو گئے تھے - پھر ملازمت چھوڑ کر گھوڑوں کی تجارت شروع کر دی - یکم جمادی الاوّل ۱۲۹۳ھ (مطابق ۲۵ مئی ۱۸۷۶ء) کو ساڑھے اٹھائیس برس کی عمر میں فوت ہوئے - ان کی تین بیٹیاں تھیں: بڑی محمد سلطان بیگم عرف جندو بیگم کی شادی شجاع الدین احمد خاں تاباں سے ہوئی، دوسری فاطمہ سلطان بیگم عرف بندو بیگم کی شادی نواب علاؤالدین احمد خاں رئیس لوہارو کے صاحبزادے مرزا بشیرالدین احمد خاں سے تیسری رقیہ بیگم کرنیل ذوالنور احمد خاں سے بیاہی گئی -

حسین علی خاں شاداں - غالب کی وفات کے بعد ریاست رام پور میں پچیس روپے کے ملازم ہو گئے تھے - بڑے بھائی کی وفات پر ملازمت چھوڑ کر دہلی چلے آئے - یکم شوال ۱۲۹۷ھ (۷ ستمبر ۱۸۸۰ء) کو وفات پائی -

عارف کے بھائی حیدر حسن خاں کے بیٹے کا نام ضمیرالدین میرزا عرف خضر میرزا تھا - وہ تحصیلدار تھے - پنشن لے کر قطب صاحب میں گوشہ نشین ہو گئے تھے - بڑی عمر پائی - غالب کو دیکھا تھا اور اس عہد کی دلکش باتیں سنایا کرتے تھے - ان کا بھی انتقال ہو چکا ہے - رحمہ اللہ تعالیٰ

الٰہی بخش خاں معروف کے بیٹے میرزا علی بخش خاں رنجور تھے - ۱۸۶۴ء میں فوت ہوئے - اُن کے فرزند غلام فخرالدین کی شادی غالب کی بھتیجی (میرزا یوسف خاں دیوانہ کی بیٹی) سے ہوئی تھی - یہ شاہی ملازم تھے - غدر کے بعد ان پر مقدمہ چلا، لیکن کوئی جرم ثابت نہ ہوا اور بری ہو گئے - ان کے بیٹے میرزا محمد سعید خاں حیدر آباد

چلے گئے تھے۔ پہلے ملازم رہے، پھر درویش بن گئے اور بیس بائیس برس یادِ الٰہی میں گزار کر وہیں فوت ہوئے۔ مستعد پورہ میں دفن ہیں۔ اُن کے صاحبزادے میرزا نصراللہ خاں بیرسٹرایٹ لا، سرکار آصفیہ میں صدر محاسب (اکوٹنٹ جنرل) بن گئے تھے۔ نواب الٰہی بخش خاں معروفؔ کے دیوان کی پہلی جلد انھیں کی توجہ سے شائع ہوئی۔

میرزا قربان علی بیگ خاں سالکؔ اور میرزا شمشاد علی بیگ خاں رضوانؔ میرزا عالم بیگ خاں کے صاحبزادے تھے۔ دونوں اُردو کے اچھے شاعر مانے جاتے تھے۔ سالکؔ حیدرآباد میں پیدا ہوئے اور دہلی میں نشو و نما پائی۔ بڑے خوش مزاج، شگفتہ رو اور ذکی آدمی تھے۔ غدر کے بعد الور میں وکالت کا عہدہ پایا۔ پھر حیدرآباد چلے گئے، جہاں ان کے چچا نواب تار بن کے خانہ داماد بن گئے تھے۔ محکمہ تعلیم میں سررشتہ داری کا عہدہ مل گیا۔ نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی کی سرپرستی میں ایک رسالہ "مخزن الفوائد" کے نام سے نکالا، جس میں تاریخی مضامین چھپتے تھے۔ شطرنج کھیلنے میں خاص مہارت تھی۔ حیدرآباد ہی میں سنہ ۱۲۹۱ھ (۱۸۷۴ء) میں فوت ہوئے۔ بھائی کے غم میں رضوانؔ بھی کچھ مدت بعد چل بسے۔

اس خاندان کے جن افراد کے نام غالبؔ کے خطوط موجود ہیں۔ ان کی فہرست مع تعداد مکاتیب ذیل میں درج ہے:

مکتوب الیہ	تعداد مکاتیب
نواب امین الدین احمد خاں	۶
نواب علاؤ الدین احمد خاں علائیؔ	۵۶
نواب سر امیر الدین احمد خاں	۱
نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّرؔ	۱
شہاب الدین احمد خاں ثاقبؔ	۹

قربان علی بیگ خاں سالک	۲
شمشاد علی بیگ خاں رضواں	۲
باقر علی خاں کامل	۳
	۸۰

یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ محض اتنے ہی خطوط لکھے گئے۔ بعض خط یقیناً ضائع ہو گئے ہوں گے۔ خطوں کو محفوظ رکھنے کا اہتمام سب سے بڑھ کر علائی نے کیا تھا۔ نواب سر امیرالدین احمد خاں، غالب کی وفات کے وقت زیادہ سے زیادہ آٹھ برس کے ہوں گے۔ ان کے نام صرف ایک خط ہے۔ وہ خود فرماتے تھے کہ خط چھپ رہے تھے۔ مجھ سے کہا گیا کہ ایک خط تم بھی اپنے نام لکھوا لو۔ چنانچہ میں نے جا کر عرض کیا کہ دادا جان! ایک خط ہمارے نام بھی لکھ دیجیے۔ اس طرح وہ خط لکھا گیا۔ نیر، ثاقب، سالک، رضواں اور کامل کے نام اِس وجہ سے بھی خط کم ہیں کہ یہ لوگ عموماً دہلی میں رہتے تھے اور روزانہ غالب سے ملتے تھے، اس لیے ان کے نام خط لکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ کامل کو خط اس زمانے میں لکھے گئے، جب وہ الور میں ملازم ہو گئے تھے۔

نواب امین الدین احمد خاں

(۱)

بھائی صاحب!

ساٹھ برس سے ہمارے تمہارے بزرگوں میں قرابتیں بہم پہنچیں۔ بیچ کا میرا تمہارا معاملہ یہ کہ پچاس برس سے میں تم کو چاہتا ہوں، بے اس کے کہ چاہت تمہاری طرف سے بھی ہو۔ چالیس برس سے محبت کا ظہور طرفین سے ہوا۔ میں تمہیں چاہتا رہا،

تم مجھے چاہتے رہے - وہ امر عام اور یہ امر خاص کیا مقتضی اس کا نہیں کہ مجھ میں تم میں حقیقی بھائیوں کا سا اخلاص پیدا ہو جائے ؟ وہ قرابت اور یہ مودت کیا پیوندِ خون سے کم ہے ؟ تمھارا یہ حال سنوں اور بے تاب نہ ہو جاؤں اور وہاں نہ آؤں ؟ مگر کیا کروں، مبالغہ نہ سمجھو، میں ایک قالبِ بے رُوح ہوں:

یکے مردہ شخصم بمردی رواں

اضمحلال روح کا روز افزوں ہے - صبح کو تبرید، قریب دوپہر کے روٹی، شام کو شراب - اگر اس میں سے جس دن ایک چیز اپنے وقت پر نہ ملی، میں مر گیا - واللہ نہیں آسکتا، باللہ نہیں آسکتا - دل کی جگہ میرے پہلو میں پتھر بھی تو نہیں - دوست نہ سہی، دشمن بھی تو نہ ہوں گا - محبت نہ سہی، عداوت بھی تو نہ ہوگی - آج تم دونوں بھائی[1] اس خاندان میں شرف الدولہ اور فخر الدولہ[2] کی جگہ ہو - میں لم یلد و لم یولد[3] ہوں - میری زوجہ تمھاری بہن، میرے بچے[4] تمھارے بچے ہیں - خود جو میری حقیقی بھتیجی ہے، اس کی اولاد بھی تمھاری ہی اولاد[5] ہے - نہ تمھارے واسطے بلکہ ان بیکسوں کے واسطے تمھارا دعا گو ہوں اور تمھاری سلامتی چاہتا ہوں - تمنا یہ ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ ایسا ہی ہوگا، کہ تم جیتے رہو اور تم دونوں کے سامنے میں مر جاؤں، تاکہ اس قافلہ کو، اگر روٹی نہ دو گے، تو چنے دو گے اور اگر چنے

---

[1] یعنی امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں

[2] شرف الدولہ قاسم جان اور فخر الدولہ احمد بخش خاں

[3] مطلب یہ ہے کہ میرے کوئی اولاد نہیں -

[4] بچوں سے مراد میرزا کے اپنے بچے نہیں بلکہ عارف کے بچے ہیں جو میرزا کی تحویل میں تھے -

[5] غالب کی بھتیجی یعنی میرزا یوسف خاں کی لڑکی جو علی بخش خاں رنجور ابن الٰہی بخش خاں معروف (غالب کے خسر) کے لڑکے غلام فخر الدین سے بیاہی گئی تھی

بھی نہ دو گے اور بات نہ پوچھو گے، تو میری بلا سے۔ میں تو موافق اپنے تصور کے مرتے وقت اِن فلک زدوں کے غم میں نہ اُلجھوں گا۔[۱]

جناب والدہ ماجدہ تمھاری یہاں آنا چاہتی ہیں اور ضیاء الدین احمد خاں اسی واسطے وہاں پہنچتے ہیں۔ سنو، بعد تبدیل آب و ہوا دو فائدے اور بھی بہت بڑے ہیں کثرتِ اطبا، صحبتِ احبا۔[۲] تنہائی سے نہ ملول رہو گے، حرف و حکایت میں مشغول رہو گے۔ آؤ آؤ، شتاب آؤ بھائی۔

مرزا علاؤالدین خاں، تم کو کیا لکھوں جو وہاں تمھارے دِل پہ گذرتی ہوگی یہاں میری نظر میں ہے۔ خیر دعائے مزید عمر و دولت۔ نجات کا طالب غالبؔ

(۲)

اخ مکرم کے خدام کرام کی خدمت میں بعد اہدا سلام مسنون ملتمس ہوں، تمھارا شہر میں رہنا موجب تقویت دِل تھا۔ گو نہ مِلتے تھے، پر ایک شہر میں تو رہتے تھے۔

بھائی! ایک سیر دیکھ رہا ہوں۔ کئی آدمی طیور آشیاں گم کردہ کی طرح ہر طرف اُڑتے پھرتے ہیں۔ ان میں سے دو چار بھولے بھٹکے کبھی یہاں بھی آجاتے ہیں۔ لو صاحب اب وعدہ کب وفا کرو گے؟ علائی کو کب بھیجو گے؟ ابھی تو شب کے چِلنے اور دن کے آرام کرنے کے دِن ہیں، بارش شروع ہو جائے گی تو آپ کی اجازت بھی کام نہ آئے گی۔

---

[۱] انسان کو غم صرف زندگی تک ہوتا ہے، مرنے کے بعد غم یا خوشی اس کے لیے بے معنی ہو جاتے ہیں۔ میرزا کا مطلب یہ ہے کہ بیوی بچّوں کو تمھارے حوالے کر کے میں اطمینان سے مر جاؤں گا۔ اس لیے تصور میں یہ بات ہوگی کہ تم ان کی کفالت کرو گے۔ اگر اس فرض کو پورا نہ کرو گے تو میری بلا سے، میری تو نجات اطمینان کی ہوگی۔

[۲] یعنی دہلی آجاؤ گے تو اوّل آب و ہوا بدل جائے گی، اس سے صحت کو فائدہ پہنچے گا۔ دوسرے دہلی میں طبیب بکثرت موجود ہیں۔ ان سے طبی مشورے لیے جا سکیں گے اور علاج کا انتظام بہتر ہو جائے گا۔ تیسرے دوستوں اور محبوبوں سے صحبتیں رہیں گی اور لوہارو میں یہ بات میسّر نہیں آ سکتی۔

چلنے والا کہے گا! میں رہروِ چالاک ہوں، تیراک نہیں[1]۔ لوہارو سے دہلی تک کشتی بغیر کیونکر جاؤں، دخانی جہاز کہاں سے لاؤں؟

اے ز فرصت بیخبر در ہر چہ باشی زود باش

استاد میر جان صاحب کو سلام۔

یوم الخمیس، ۱۷ محرم سنہ ۱۲۸۱ھ | علائی کے دیدار کا طالب، غالب

(۲۲ جون سنہ ۱۸۶۴ء)

(۳)

برادر صاحب جمیل المناقب عمیم الاحسان، سلامت

تمہاری تفریح طبع کے واسطے ایک غزل نئی لکھ کر بھیجی ہے، خدا کرے پسند آئے اور مطرب کو سکھائی جائے۔

آج شہر کے اخبار لکھتا ہوں۔ سوانح لیل و نہار لکھتا ہوں۔ کل پنجشنبہ ۲۵ مئی کو اوّلِ روز بڑے زور کی آندھی آئی۔ پھر خوب مینہ برسا۔ وہ جاڑا پڑا کہ شہر کرۂ زمہریر ہو گیا۔ بڑے دریبہ کا دروازہ ڈھایا گیا۔ قابل عطار کے کوچے کا بقیہ مٹایا گیا۔ کشمیری کٹرے کی مسجد زمین کا پیوند ہو گئی۔ سڑک کی وسعت دوچند ہو گئی۔ اللہ، اللہ گنبد مسجدوں کے ڈھائے جاتے ہیں اور ہنود کی ڈیوڑھیوں کی جھنڈیوں کے پرچم لہراتے ہیں۔ ایک شیر زور آور اور پلٹن بند پیدا ہوا ہے۔ مکانات جا بجا ڈھاتا پھرتا ہے۔ فیض اللہ خاں بنگش کی حویلی پر جو گلدستے ہیں جن کو عوام گمزٹی[2] کہتے ہیں، ان میں سے ہلا ہلا کر ایک ایک کی بنیاد ڈھا دی۔

---

[1] اس زمانے میں لوہارو جانے کے لیے ریل نہ تھی۔ گرمی کے موسم میں سفر عام طور پر رات کو کرتے تھے اور دن کے وقت آرام لیتے تھے۔ میرزا کا مطلب یہ ہے کہ اگر برسات شروع ہو جائیگی تو پھر راستوں میں پانی بھر جائے گا۔ اُس وقت علائی کو دہلی آنے کی اجازت دینا بالکل بے نتیجہ ہو گا۔ وہ آ نہیں سکے گا۔ [2] گنبد کی تصغیر۔

اینٹ سے اینٹ بجادی - واہ رے بندر، یہ زیادتی اور پھر شہر کے اندر! ریگستان کے ملک سے ایک سردار زادہ کثیر العیالِ عسیر الحال عربی، فارسی، انگریزی تین زبانوں کا عالم دلّی میں وارد ہوا ہے، بلیماروں کے محلے میں ٹھہرا ہے، بحسب ضرورت حکّام شہر سے مِل لیتا ہے، باقی گھر کا دروازہ بند کیے بیٹھا رہتا ہے - گاہ گاہ مانہ ہر شام ویگاہ، غالب علی شاہ درویش کے تکیہ پر آجاتا ہے - اہلِ شہر حیران ہیں کہ کھاتا کہاں سے ہے - گر کوئی کہتا ہے کہ یہ باپ سے پھر گیا ہے، میں جانتا ہوں کہ بے سبب باپ کی نظر سے گر گیا ہے - دیکھیے انجام کار کیا ہو - غالب علی شاہ کا قول یہ ہے کہ کُل کا بھلا ہو -

جمعہ ۲۶ - مئی ۱۸۶۵ء

(۴)

برادر صاحب جمیل المناقب عمیم الاحسان سلامت

بعد سلام مسنون و دُعاے بقاے دولت روز افزوں عرض کیا جاتا ہے کہ عطوفت نامہ کے رو سے فارسی دو غزلوں کی رسید معلوم ہوئی - تیسری غزل "گوہر نتواں گفت" "اختر نتواں گفت" جو تمھارے حسب الطلب بھیجی گئی ہے، کیا نہیں پہنچی؟ بے شبہ پہنچی ہوگی - تم بھول گئے ہو گئے - وکیل حاضر باش دربار اسد اللّٰہی یعنی علائی[1] مولائی نے اپنے موکّل کی خوشنودی کے واسطے فقیر کی گردن پر سوار ہو کر ایک اردو کی غزل لکھوائی - اگر پسند آئے تو مطرب کو سکھائی جائے - جھنجوٹی کے اونچے سروں میں راہ رکھوائی جائے - اگر جیتا رہا تو جاڑوں میں آ کر میں بھی سُن لوں گا -

والسلام مع الاکرام

چہار شنبہ ۲ ربیع الاول ۱۲۸۲ھ

مطابق ۲۶ - جولائی ۱۸۶۵ء (نجات کا طالب غالب)

---

[1] یعنی خود مرزا کے مکان پر -

غزل

میں ہوں مشتاقِ جفا، مجھ پہ جفا اور سہی
تم ہو بیداد سے خوش، اس سے سوا اور سہی

غیر کی مرگ کا غم کس لیے اے غیرتِ ماہ
ہیں ہوس پیشہ بہت، وہ نہ ہوا اور سہی

تم ہو بت، پھر تمھیں پندارِ خدائی کیوں ہے؟
تم خداوند ہی کہلاؤ، خدا اور سہی

حُسن میں حُور سے بڑھ کر نہیں ہونے کے کبھی
آپ کا شیوۂ انداز و ادا اور سہی

تیرے کوچے کا ہے مائل دلِ مضطر میرا
کعبہ اک اور سہی، قبلہ نما اور سہی

کوئی دنیا میں مگر باغ نہیں ہے واعظ
خلد بھی باغ ہے، خیر آب و ہوا اور سہی

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یارب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

مجھ کو وہ دو کہ جسے کھا کے نہ پانی مانگوں
زہر کچھ اور سہی، آبِ بقا اور سہی

مجھ سے غالب یہ علائی نے غزل لکھوائی
ایک بیداد گرِ رنج فزا اور سہی

(۵)

بھائی صاحب

آج تک سوچتا رہا کہ بیگم صاحبہ قبلہ[1] کے انتقال کے باب میں تم کو کیا لکھوں۔ تعزیت کے واسطے تین باتیں ہیں: اظہارِ غم، تلقینِ صبر، دُعائے مغفرت۔ سو بھائی۔ اظہارِ غم تکلف محض ہے۔ جو غم تم کو ہوا ہے ممکن نہیں کہ دوسرے کو ہوا ہو۔ تلقینِ صبر بے دردی ہے۔ یہ سانحۂ عظیم ایسا ہے جس نے غمِ رحلت نواب[2] مغفور کو تازہ کیا۔ پس ایسے موقع پر صبر کی تلقین کیا کی جائے۔ رہی دعائے مغفرت، میں کیا اور میری دُعا کیا، مگر چونکہ وہ میری مربیہ و محسنہ تھیں، دل سے دعا نکلتی ہے۔ معہذا تمھارا یہاں آنا سُنا جاتا تھا، اس واسطے خط نہ لکھا۔ اب جو معلوم ہوا کہ دُشمنوں کی طبیعت ناساز ہے اور اس سبب سے آنا نہ ہُوا، یہ چند سطریں لکھی گئیں۔ حق تعالےٰ

---

[1] والدہ صاحبہ امین الدین احمد خان [2] یعنی نواب احمد بخش خان والد مکتوب الیہ۔

تم کو سلامت اور تندرست اور خوش رکھے۔

۱۵- نومبر ۱۸۶۶ء   تمھاری خوشی کا طالب غالبؔ

(۶)

جمیل المناقب عمیم الاحسان سلامت

بعد سلام مسنون و دعاے بقاے دولت روزافزوں عرض کیا جاتا ہے کہ استاد میر جان آئے اور اُن کی زبانی تمھاری خیر و عافیت معلوم ہوئی۔ خدا تم کو زندہ و تندرست و شاد و شاداں رکھے۔

یہاں کا حال کیا لکھوں؟ بقول سعدی علیہ الرحمہ: نہ ماند آب جز چشم دو یتیم شب و روز آگ برستی ہے یا خاک۔ نہ دن کو سورج نظر آتا ہے، نہ رات کو تارے۔ زمین سے اُٹھتے ہیں شعلے، آسمان سے گرتے ہیں شرارے۔ چاہا تھا کہ کچھ گرمی کا حال لکھوں۔ عقل نے کہا کہ دیکھ نادان! قلم انگریزی دیا سلائی کی طرح جل اُٹھے گی اور کاغذ کو جلا دے گی۔ بھائی، ہوا کی گرمی تو بڑی بلا ہے، گاہ گاہ جو ہوا بند ہو جاتی ہے۔ وہ اور بھی جانگزا ہے۔

خیر اب فصل سے قطع نظر ایک کودک غریب الوطن کے اختلاط کی گرمی کا ذکر کرتا ہوں کہ وہ جانسوز نہیں بلکہ دل افروز ہے۔ پرسوں فرخ مرزا[1] آیا۔ اس کا باپ بھی اس کے ساتھ تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیوں صاحب، میں تمھارا کون ہوں اور تم میرے کون ہو؟ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا کہ حضرت آپ میرے دادا ہیں اور میں آپ کا پوتا ہوں۔ پھر میں نے پوچھا کہ "تمھاری تنخواہ آئی؟" کہا "جناب عالی، آغا[2] جان کی تنخواہ آگئی ہے، میری نہیں آئی۔" میں نے کہا "تو لوہارو جائے تو تنخواہ پائے"۔ کہا

---

[1] میرزا امیرالدین احمد خان عرف فرخ مرزا ابن نواب علاؤالدین احمد خاں ابن نواب امین الدین احمد خاں مکتوب الیہ۔

[2] ترکی میں "آغا" بڑے بھائی کو کہتے ہیں۔ بول چال میں یہ لفظ والد کے لیے استعمال ہونے لگا جس طرح آپا جان والدہ کے لیے۔ یعنی علاؤالدین خاں۔

"حضرت میں تو آ کا جان سے روز کہتا ہوں کہ لوہارو چلو، اپنی حکومت چھوڑ کر دلی کی رعیّت میں کیوں رل گئے ؟"

سبحان اللہ! بالشت بھر کا لڑکا اور یہ فہم درست اور طبع سلیم۔ میں اس خوبیٔ خو اور فرخی سیرت پہ اس کو فرخ سیر کہتا ہوں۔ مصاحب بے بدل ہے۔ تم اس کو بلا کیوں نہیں بھیجتے ؟ مگر بھائی غلام حسین خاں[۱] مرحوم کے متبع ہو کہ زین العابدین و حیدر حسن اور ان کی اولاد کو کبھی مُنہ نہ لگایا۔ علاؤالدین خاں جیسا ہوشمند و ہمہ داں بیٹا، فرخ سیر جیسا دانشور، بذلہ سنج اور شیریں سخن پوتا، یہ دو عطیۂ عظمےٰ و موہبت کبرے ہیں تمھارے واسطے من جانب اللہ:

اگر دریافتی بر دانشت بوس　　　　وگر غافل شدی افسوس افسوس

آج ۲۲ جون کی ہے آفتاب سرطان میں آگیا۔ نقطہ انقلاب صیفی[۲] میں دن گھٹنے لگا۔ چاہیے کہ تمھارا غیظ و غضب ہر روز کم ہوتا جائے[۳]۔　　　　نجات کا طالب غالب

---

[۱] غلام حسین خاں مسرور جو میرزا غالب کے ہم زلف اور زین العابدین خاں عارف کے والد تھے۔ انھوں نے اپنی بیوی بنیادی بیگم اور اس کے بچوں کو بالکل چھوڑ رکھا تھا۔ میرزا کہتے ہیں کہ امین الدین احمد خاں بھی مسرور کے متبع ہو گئے کہ اپنے بچوں کو چھوڑ دیا۔

[۲] گرمیوں میں سب سے بڑا دن ۲۱ جون کا ہوتا ہے پھر دن گھٹنے لگتا ہے اور رات بڑھنے لگتی ہے اس لحاظ سے ۲۲ جون نقطہ انقلاب صیفی ہوا، جس طرح ۲۱ دسمبر نقطہ انقلاب شتائی ہے۔

[۳] میرا اندازہ ہے کہ یہ خط جون ۱۸۶۷ء کا ہوگا۔ اس میں امین الدین احمد خاں عرف فرخ میرزا سے گفتگو کا مفاد درج کیا ہے ان کی پیدائش غالباً ۱۸۶۰ء میں ہوئی۔ انھیں بالشت بھر کا لڑکا بتایا گیا ہے

علاؤ الدین احمد خاں علائیؔ[1]

(۱)

میرزا نسیمی[2] کو دعا پہنچے

آنکھ کی گھاجنی جب خود پک کر پھوٹ گئی تھی اور پیپ نکل گئی تھی تو نشتر کیوں کھایا؟ مگر یہ کہ بطریق خوشامد طبیب سے رجوع کی۔ جب اس نے نشتر تجویز کیا، خواہی نخواہی امتثال امر کرنا پڑا اور شاید یوں نہ ہو، کچھ مادہ باقی ہو۔ بہرحال حق تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے شفا بخشے:

قطعہ

بسکہ فعّالِ ما یرید[2] ہے آج — ہر سلحشور[3] انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے — زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک[4] جس کو کہیں، وہ مقتل ہے — گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہرِ دہلی کا ذرّہ ذرّہ خاک — تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک — آدمی واں نہ جاسکے، یاں کا
میں نے مانا کہ مِل گئے پھر کیا — وہی رونا تن و دِل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ — سوزشِ داغہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم — ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا
اِس طرح کے وصال سے یارب — کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا[5] ۱۸۵۸ء

[1] علائی کا تخلص پہلے نسیمی تھا [2] یعنی جو چاہے کرنے والا مطلق العنان [3] ہتھیار استعمال کرنے والا یعنی سپاہی [4] چوک سے یہاں بظاہر چاندنی چوک مراد ہے جو دہلی کا سب سے بڑا اور مشہور بازار ہے۔
[5] یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ قطعہ ان حالات سے متاثر ہو کر لکھا گیا جو غدر کے بعد دہلی میں پیدا ہو گئے تھے اسی لیے کہا کہ انگریزوں کے سپاہی مطلق العنان ہیں جو چاہتے ہیں کرتے ہیں، کسی کو گھر سے بازار تک جانے کا حوصلہ نہیں۔ چوک مقتل بنا ہوا ہے اور دہلی کی خاک کا ایک، ایک ذرہ مسلمانوں کے خون کا پیاسا ہے۔

(۲)

آج بُدھ کے دِن ۲۷-رمضان کو پہر دن چڑھے، کہ جس وقت میں کھانا کھا کر باہر آیا تھا، ڈاک کا ہرکارہ تمھارا خط اور شہاب الدین خاں[1] کا خط معاً لایا۔ مضمون دونوں کا ایک۔ واہ کیا مضمون! اِن دنوں میں کہ سب طرح کے رنج و عذاب فراہم ہیں، ایک داغ جگر سوز یہ بھی ضرور تھا۔ سبحان اللہ میں نے اس کی صورت بھی نہیں دیکھی یا ولادت کی تاریخ سنی یا اب رحلت کی تاریخ لکھنی پڑی[2]۔ پروردگار تم کو جیتا رکھے اور نعم البدل عطا کرے۔ میاں، اس کو سب جانتے ہیں کہ میں مادہ تاریخ نکالنے میں عاجز ہوں۔ لوگوں کے دیے ہوئے مادّے نظم کر دیتا ہوں، اور جو مادہ اپنی طبیعت سے پیدا کرتا ہوں، وہ بیشتر بجر ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ اپنے بھائی[3] کی رحلت کا مادہ "دریغ دیوانہ" نکالا پھر اُس میں سے "آہے" کے عدد گھٹائے۔

تمام دوپہر اسی فکر میں رہا۔ یہ نہ سمجھنا کہ مادہ ڈھونڈا، تمھارے نکالے ہوئے دو لفظوں کو تاکا کیا کہ کسی طرح سات اس پر بڑھاؤں۔ بارے، ایک قطعہ درست ہوا، مگر تمھاری زبان سے، یعنی گویا تم نے کہا ہے۔ پانچ شعر ہیں تین شعر زائد، دو موضح[4] مدعا،

۱؎ شہاب الدین احمد خاں ثاقب ابن ضیاء الدین خاں نیّر

۲؎ علائی کے بچّے کی وفات کا ذکر ہے، جس کا نام یحییٰ تھا۔

۳؎ میرزا یوسف جس نے غدر کے دوران میں ۲۹ صفر ۱۲۷۴ھ (۱۹ اکتوبر ۱۸۵۷ء) کو دہلی میں بہ حالت دیوانگی وفات پائی۔ غالب نے تاریخ وفات کہی تھی:

زسال مرگ ستم دیدہ میرزا یوسف — کہ زیستے بہ جہاں در، ز خویش بیگانہ
یکے در انجمن از من ہمے پژوہش کرد — کشیدم آہے و گفتم "دریغ دیوانہ"

۴؎ مدعا کو واضح کرنے والے۔

لیکن میں نہیں جانتا کہ تعمیہ[1] اچھا ہے یا بُرا ہے۔ ہاں انغلاق[2] تو البتہ ہے۔ تامل سے سمجھ میں آتا ہے اور شاید لوحِ مزار پر کھدوانے کے قابل نہ ہو۔

قطعہ

درگریہ اگر دعوی ہم چشمی ما کرد | بینی کہ شود ابرِ بہاری خجل از ما
ناچار بگریم شب و روز کہ ایں سیل | باشد کہ برد کالبدِ آب و گل از ما
گفتی کہ نگہدار دل از کشمکشِ غم | خود گرد بر آورد غمِ جاں گسل از ما
بیچیدہ شد و از شعلۂ سوزِ غمِ ہجرش | چوں شمع دو دود بسر متصل از ما
غم دیدۂ تسلیمی بیچارہ ز رنجِ دفاتش | بنوشت کہ وہ داغ بسر رفت دل از ما

"ما" کے عدد ۴۱ "دل" کے عدد ۳۴۔ "ما" میں سے "دل" گیا، گویا ۴۱ میں سے ۳۴ گئے، باقی رہے سات۔ وہ "داغ پسر" پہ بڑھائے، ۱۲۷۴ ہاتھ آئے۔

(۳)

خاک بُنا کم و تو باد بہار | نہ توانی مرا ز جا بردار
ہاں "لبیہ" ز من چہ می خواہی | زحمتِ خویشتن چہ می خواہی[3]

خوشی مجھ میں تم میں مشترک ہے۔ تم نے مجھے تہنیت دی تو مبارک اور میں نے تمھیں تہنیت دی تو مناسب۔ للہ الحمد للہ الشکر۔

---

[1] تعمیہ۔ اصطلاحاً اصل مادّے میں اعداد بڑھانے اور شامل کرنے کو کہتے ہیں تفصیل خود اس خط کے آخر میں درج ہے۔ [2] اغلاق۔ یعنی پیچیدگی۔

[3] یہ مثنوی کے شعر ہیں لیکن تمام نسخوں میں "جا بردار" کے بجائے "جا بردن" چھپا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ منشی مہیش پرشاد صاحب نے بھی اسی طرح چھاپا۔ لیکن ذرا غور کرنے سے غلطی واضح ہو جاتی ہے غالب قادر الکلام شاعر تھا اور غیر ممکن تھا کہ وہ دو شعر متصل لکھتا جو نہ رباعی کے تھے اور نہ قطعہ کے، صحیح "جا بردن" نہیں "جا بردار" ہی ہو سکتا ہے۔ اس مصرع کا ایک نسخہ یہ بھی ہے: کہ توانی مرا ز جا بردار۔

بھائی، سچ تو یہ ہے کہ اِن دنوں میں میرے پاس ٹکٹ نہیں۔ اگر بیرنگ بھیجوں تو کہار ماندہ اُٹھ نہیں سکتا، ڈاک گھر تک جائے کون؟ اپنا مقصود تمھارے والد ماجد[1] سے اور تمھاری جدۂ ماجدہ اور تمھارے عمِ عالی مقدار[2] سے کہہ چکا ہوں۔ خلاصہ یہ کہ میری بی بی اور بچوں[3] کو کہ یہ تمھاری قوم کے ہیں، مجھ سے لے لو کہ میں اب اس بوجھ کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ اُنھوں نے بھی، بشرطِ ان لوگوں کے لوہارو جانے کے، اس خواہش کو قبول کیا۔ میرا قصد سیاحت کا ہے۔ پنسن[4] اگر کھل جائے گا، تو وہ اپنے صرف میں لایا کروں گا۔ جہاں جی لگا، وہاں رہ گیا، جہاں سے دل اُکھڑا، چل دیا۔

تا در میانہ خواستۂ کردگار چیست

دوشنبہ ۱۲ محرم ۱۲۷۵ھ غالبؔ
(مطابق ۲۳۔ اگست ۱۸۵۸ء)

(۴)

سبحان اللہ! ہزار برس تک نہ پیام بھیجنا، نہ خط لکھنا، اور پھر لکھنا تو سراسر غلط لکھنا۔ مجھ سے کتاب مستعار مانگتے ہو! یاد کرو کہ تم کو لکھ چکا ہوں کہ دساتیر[5] اور

---

۱ نواب امین الدین احمد خاں والیِ لوہارو

۲ نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر

۳ بی بی امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کے سگے چچا کی بیٹی تھی۔ دو بچے باقر علی خاں اور حسین علی خاں، زین العابدین خاں عارف کے بیٹے تھے۔ عارف نواب غلام حسین خاں مسرور کا فرزند تھا۔ مسرور امین الدین احمد خاں کا ہم خاندان تھا۔ نیز اس کی شادی بیگم غالب کی سگی بہن سے ہوئی تھی۔ گویا بچوں کے ساتھ خاندانِ لوہارو کا دوہرا رشتہ تھا۔

۴ ظاہر ہے کہ یہ خط اس زمانے میں لکھا گیا، جب غدر کے بعد غالب کی خاندانی پنشن بند ہو گئی تھی۔ "پنسن" اصل میں پنشن ہے۔ لیکن غالبؔ کا املا پنسن ہی تھا۔

۵ پارسیوں کی مذہبی کتابیں۔

"برہان قاطع[1]" کے سوا کوئی کتاب میرے پاس نہیں۔ از انجملہ برہان قاطع تم کو دے چکا ہوں۔ دساتیر میرا ایمان و حرز جان ہے۔ اشعار تازہ مانگتے ہو، کہاں سے لاؤں؟ عاشقانہ اشعار سے مجھ کو وہ بُعد ہے جو ایمان سے کفر کو۔ گورنمنٹ کا بھاٹ تھا، بھٹئی کرتا تھا، خلعت پاتا تھا۔ خلعت موقوف، بھٹئی متروک۔ نہ غزل، نہ مدح۔ ہزل و ہجو میرا آئین نہیں۔ پھر کہو کیا لکھوں؟ بوڑھے پہلوان کے سے پیچ بتانے کو رہ گیا ہوں، اکثر اطراف و جوانب سے اشعار آجاتے ہیں، اصلاح پا جاتے ہیں۔ باور رکھنا اور مطابق واقعہ سمجھنا۔

تمہارے دیکھنے کو دل بہت چاہتا ہے اور دیکھنا تمہارا موقوف اس پر ہے کہ تم یہاں آؤ۔ کاش! اپنے والد ماجد کے ساتھ چلے آتے اور مجھ کو دیکھ جاتے! اردو کا دیوان رام پور سے لایا ہوں اور وہ آگرہ گیا ہے۔ وہاں منطبع ہوگا۔ ایک نسخہ تمہارے پاس بھی پہنچ جائے گا۔

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

مرقومہ روز دوشنبہ ۲۔ جولائی سنہ ۱۸۶۰ء۔ غالبؔ

(۵)

صاحب: میری داستان سنیے۔ پنسن بے کم و کاست جاری ہوا۔ زرِ مجتمعہ سہ سالہ[2] یکمشت مل گیا۔ بعد ادائے حقوق[3] چار سو روپے دینے باقی رہے اور ستاسی روپے گیارہ آنے مجھے بچے۔ مئی کا مہینا بدستور ملا۔ آخر جون میں حکم ہو گیا کہ پنسن دار علی العموم ششماہی پایا کریں۔ ماہ بماہ پنسن تقسیم نہ ہوا کرے۔

---

[1] "برہان قاطع" فارسی لغت کی مشہور کتاب مؤلفہ محمد حسین تبریزی دکنی جس کے رد میں غالب نے "قاطع برہان" لکھی تھی اور اس پر رد و کد کا ایک وسیع ہنگامہ بپا ہوا تھا۔

[2] از ابتدا مئی ۱۸۵۷ء تا اواخر اپریل ۱۸۶۰ء [3] مراد ہے واجبات و قرض

میں دس بارہ برس سے حکیم محمد حسن خاں کی حویلی میں رہتا ہوں۔ اب وہ حویلی غلام اللہ خاں نے مول لے لی۔ آخر جون میں مجھ سے کہا کہ حویلی خالی کر دو۔ اب مجھے فکر پڑی کہ کہیں دو حویلیاں قریب ہم دگر ایسی ملیں کہ ایک محلسرا اور ایک دیوان خانہ ہو۔ نہ ملیں۔ ناچار یہ چاہا کہ بلیماروں[1] میں ایک مکان ایسا ملے کہ جس میں جا رہوں۔ نہ ملا۔ تمھاری چھوٹی پھوپی نے بیکس نوازی کی، کٹڑا والی حویلی مجھ کو رہنے کو دی۔ ہر چند وہ رعایت مرعی نہ رہی کہ محلسرا سے قریب ہو۔ مگر خیر، بہت دور بھی نہیں۔ کل یا پرسوں وہاں جا رہوں گا۔ ایک پانو زمین پہ ہے، ایک پانو رکاب میں۔ توشے کا وہ حال، گوشے کی یہ صورت[2]۔

کل شنبہ ۷، ذی الحجہ کی اور ۷۔ جولائی کی[3]، پہر دن چڑھے تمھارا خط پہنچا۔ دو گھڑی بعد سنا گیا کہ امین الدین خاں صاحب نے اپنی کوٹھی میں نزول اجلال کیا۔ پہر دن رہے ازراہ مہربانی ناگاہ میرے ہاں تشریف لائے۔ میں نے ان کو دبلا اور افسردہ پایا۔ دل کڑھا۔ علی حسین خاں[4] بھی آیا، اس سے بھی ملا۔ میں نے تمھیں پوچھا کہ وہ کیوں نہیں آئے۔ بھائی صاحب[5] بولے کہ جب میں یہاں آیا، تو کوئی وہاں بھی تو رہے اور اس سے علاوہ وہ[6] اپنے بیٹے کو بہت چاہتے ہیں۔ میں نے کہا اتنا ہی جتنا تم اس کو

---

[1] دلی کا مشہور محلہ جس میں غالب نے زندگی کے بیشتر اوقات گزارے۔ اسی محلہ میں شریف خانی خاندان کے مکان ہیں۔

[2] توشہ و گوشہ سے مراد معاش و مکان ہیں۔

[3] یہاں عام نسخوں میں "۷۔ جون کی" درج ہے جو غلط ہے اس لیے کہ ۲۰ جون سے ذی الحجہ کا مہینہ شروع ہو گیا تھا۔ لہٰذا "۷۔ جولائی کی" صحیح ہے یہ یا تو غالب سے سہو ہوا یا بعد میں نقل کرنے والوں نے غلطی کی۔

[4] علائی کا چھوٹا بھائی [5] امین الدین احمد خاں

[6] وہ سے مراد علاؤ الدین احمد خاں مکتوب الیہ ہیں اور یہ کلام امین الدین احمد خاں کا ہے۔

چاہتے تھے۔ ہنسنے لگے۔ غرض کہ میں نے بظاہر ان کو تم سے اچھا پایا۔ آگے تم لوگوں کے دلوں کا مالک اللہ ہے۔

نگاشتہ و رواں داشتہ یک شنبہ بین الظہر و العصر راقم غالب

۱۸ ذی الحجہ ۱۲۷۶ھ۔ (۸۔ جولائی ۱۸۶۰ء)

(۶)

مولانا نسیمی،

کیوں خفا ہوتے ہو؟ ہمیشہ سے اسلاف و اخلاف ہوتے چلے آئے ہیں۔ اگر نیّر[1] خلیفہ اوّل ہے، تم خلیفہ ثانی ہو۔ اس کو عمر میں تم پر تقدم زمانی[2] ہے جانشین دونوں، مگر ایک اول ہے اور ایک ثانی ہے۔

شیر اپنے بچوں کو شکار کا گوشت کھلاتا ہے، طریق صید افگنی سکھاتا ہے، جب وہ جوان ہو جاتے ہیں، آپ شکار کر کھاتے ہیں۔ تم سخنور ہو گئے حسن طبع خداداد رکھتے ہو۔ ولادت فرزند کی تاریخ کیوں نہ کہو؟ اسم تاریخی کیوں نہ نکال لو کہ مجھ پیر غمزدہ دل کو تکلیف دو؟ علاء الدین خاں تیری جان کی قسم میں نے پہلے لڑکے کا اسم تاریخی نظم کر دیا تھا اور وہ لڑکا نہ جیا۔ مجھ کو اس وہم نے گھیرا ہے کہ میری نحوست طالع کی تاثیر تھی۔ میرا ممدوح جیتا نہیں۔ نصیر الدین حیدر اور امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چل دیے۔ واجد علی شاہ[3] تین قصیدوں کے متحمل ہوئے، پھر نہ سنبھل[4] سکے

---

[1] ضیاء الدین احمد خاں ہیں

[2] یعنی مکتوب الیہ۔ عمر میں چھوٹا اور نیر بڑا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ نے اس بات پر خفگی کا اظہار کیا تھا کہ نیر کو کیوں جانشین بنایا۔

[3] نصیر الدین حیدر شاہ اودھ تھے۔ ان کے بعد محمد علی شاہ تخت نشین ہوئے۔ پھر امجد علی شاہ، اُن کے بعد واجد علی شاہ۔ [4] یعنی معزول ہو گئے اور سلطنت چھن گئی۔

جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے وہ عدم سے بھی پرے پہنچا۔ نہ صاحب، دہائی خدا کی، میں نہ تاریخ ولادت کہوں گا، نہ نام تاریخی ڈھونڈوں گا۔ حق تعالیٰ تم کو اور تمھاری اولاد کو سلامت رکھے اور عمر و دولت و اقبال عطا کرے۔

سنو صاحب، حُسن پرستوں کا ایک قاعدہ ہے، وہ امرد کو دو چار برس گھٹا کر دیکھتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ جوان ہے، لیکن بچہ سمجھتے ہیں۔ یہ حال تمھاری قوم کا ہے۔ قسم شرعی کھا کر کہتا ہوں کہ ایک شخص ہے کہ اس کی عزت اور نام آوری جمہور کے نزدیک ثابت اور متحقق ہے اور صاحب تم بھی جانتے ہو، مگر جب تک اس سے قطع نظر نہ کرو اور اس مسخرے کو گمنام و ذلیل نہ سمجھ لو تم کو چین نہ آوے گا۔ پچاس برس سے دلّی میں رہتا ہوں۔ ہزارہا خط اطراف و جوانب سے آتے ہیں۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلہ نہیں لکھتے۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلّہ سابق کا نام لکھ دیتے ہیں۔ حکام کے خطوط فارسی و انگریزی، یہاں تک کہ ولایت کے آئے ہوئے، صرف شہر کا نام اور میرا نام۔ یہ سب مراتب تم جانتے ہو اور ان خطوط کو دیکھ چکے ہو اور پھر مجھ سے پوچھتے ہو کہ اپنا مسکن بتا۔ اگر میں تمھارے نزدیک امیر نہیں، نہ سہی، اہلِ حرفہ میں سے بھی نہیں ہوں کہ جب تک محلہ اور تھانہ نہ لکھا جائے، ہرکارہ میرا پتہ نہ پائے۔ آپ صرف دہلی لکھ کر میرا نام لکھ دیا کیجیے، خط کے پہنچنے کا میں ضامن[۱]۔

پنجشنبہ۔ ۴ ماہ اپریل سنہ ۱۸۶۱ء غالب

(۷)

میری جان، تخلص تمھارا بہت پاکیزہ اور میرے پسند ہے "نیشی" گو بہ تکلف

---

[۱] عبارت سے ظاہر ہے کہ علائی نے غالب سے محلے کا پتہ پوچھا تھا۔ اس سے میرزا کے احساسِ شہرت و عظمت کو ٹھیس لگی اور نہایت دلچسپ انداز میں اس کا اظہار کیا۔

اس کا مصحّف[1] کیوں ٹھہراؤ؟ یہ میدان تو بہت فراخ ہے۔ خدا کی خے کو جیم فارسی سے بدل دو۔ نبی کو بتقدیم موحدہ علی النون[2] لکھو[3]۔ یہ وسواس دل سے دور کرو۔ "رہرو" ایک اچھا تخلص ہے۔ "رہرو" اس کی تجنیس موجود ہے۔ "شیون" اچھا تخلص ہے۔ "ستون" اس کی تصحیف ہے۔ تمھارے واسطے بمناسبت اسم عالی تخلص خوب تھا، مگر اس تخلص کا ایک شاعر بہت بڑا نامی گزر چکا[4] ہے۔ ہاں "نامی" "سامی" یہ دو تخلص بھی اچھے ہیں۔ مولانا فائق کی پیروی کرو۔ مولانا "لائق" کہلاؤ۔ اگر کہو گے کہ اس ترکیب سے لفظ نالائق پیدا ہوتا ہے۔ مولانا "شائق" بن جاؤ۔

ہنسی کی باتیں ہو چکیں۔ اب حقیقت واجبی سنو۔ "نسیمی" تخلص، خماسی[5]، بروزن "ظہوری" و "نظیری" اچھا ہے۔ اگر بدلنا منظور ہے تو "نامی" "سامی" "رہرو" "شیون" یہ چار تخلص رباعی[6] بروزن "عرفی" و "غالب" اچھے ہیں۔ ان میں سے ایک تخلص قرار دو۔ میرے نزدیک سب سے بہتر تمھارے واسطے خاص "فخری" تخلص ہے۔ کہو گے کہ آزاد پور کے باغ میں ایک آم کا نام "فخری" ہے حاصل کلام دو دن کی فکر میں جو تخلص میرے خیال میں آئے، وہ آج لکھ بھیجتا ہوں۔ بھائی "موبد" تخلص نیا ہے۔ اگر یہ پسند آ جائے تو یہ رکھو۔

صبح یک شنبہ۔ ۱۲۔ مئی ۱۸۶۱ء نجات کا طالب۔ غالب

---

[1] تصحیف کا مطلب ہے نقطے بدل کر دوسرا لفظ بنا لینا۔ جیسے "نسیمی" سے "تشیمی"۔ مصحف یعنی تصحیف شدہ۔

[2] یعنی خدا کو جدا بنایا جا سکتا ہے [3] نبی کی "ب" کو "ن" پر مقدم کرو تو بنی بن جائے گا۔

[4] اشارہ ہے نعمت خاں عالی کی طرف جو عالمگیر اعظم کا خان ساماں تھا اور مشہور شاعر ہونے کے علاوہ فارسی کا عالی پایہ نثر نگار تھا "وقائع" "حسن و عشق" اور "جنگ نامہ" اس کی متداول کتابیں ہیں۔

[5] یعنی پنج حرفی [6] چار حرفی

(۸)

میری جان علائی ہمہ دان

اس دفع دخل مقدر[1] کا کیا کہنا ہے۔ "فرہنگ لغات دساتیر" تمھارے پاس ہے میں چاہتا تھا کہ اس کی نقل تم سے منگاؤں۔ تم نے "دساتیر" مجھ سے مانگی۔ اسی صحیفۂ مقدس کی قسم کہ وہ میرے پاس نہیں ہے۔ جی میں کہو گے کہ اگر "دساتیر" نہیں تو "فرہنگ" کی خواہش کیوں ہے؟ حق یوں ہے کہ بعض لغات کے اعراب یاد نہیں، اس واسطے فرہنگ کی خواہش ہے۔ اگر اس "فرہنگ" کی نقل بھیج دوگے تو مجھ پر احسان کروگے۔ "دساتیر" میرے پاس موجود ہوتی تو آج اس خط کے ساتھ اس کا بھی پارسل بھیج دیتا۔ ہاں صاحب، اگر "دساتیر" ہوتی اور میں بھیج دیتا، تو البتہ بھائی[2] صاحب کا مشکور رہتا۔ دین و دنیا میں کیوں ماجور ہوتا؟ ارسال اہدا[3] پر حصول اجر کیوں مترتب ہو گیا؟ بھائی وہ مذہب اختیار کیا چاہتے ہیں، اور تم اس مذہب کو حق جانتے ہو کہ میں جو واسطہ اس کے اعلان و شیوع کا ہوتا تو عنداللہ مجھ کو استحقاق اجر پانے کا پیدا ہوتا۔ اپنے باپ کو سمجھاؤ اور ایک شعر میرا اور ایک شعر حافظ کا اور ایک شعر مولوی روم کا سُناؤ:

غالب:

دولت بہ غلط نبود از سعی پشیماں شو کافر نتوانی شد، ناچار مسلماں شو

حافظ:

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ چوں ندید ند حقیقت رہِ افسانہ زدند

---

[1] "دفع دخل مقدر" سے مراد ہے کہ جو اعتراض ہو سکتا ہے اس کا دروازہ پہلے ہی بند کر دینا۔

[2] امین الدین احمد خان والد علائی [3] ہدیہ بھیجنا۔

مولانا روم

مذہب عاشق ز مذہبہا جدا ست عاشقاں را مذہب و ملت خدا ست

رات کو خوب مینہ برسا ہے۔ صبح کو تھم گیا ہے۔ ہوا سرد چل رہی ہے۔ ابر تنک چھا رہا ہے۔ یقین ہے کہ تمہاری جدّہ ماجدہ معہ اپنی بہو اور پوتے کے روانۂ لوہارو ہوں۔ کل آج کی روانگی کی خبر تھی۔ یہ لڑکا سعید ازلی ہے۔ ابر کا محیط ہونا اور ہوا کا سرد ہو جانا خاص اس کی آسایش کے واسطے ہے۔ میرا منظر سرِ راہ ہے، وہاں بیٹھا ہوا یہ خط لکھ رہا ہوں۔ محمد علی بیگ اُدھر سے نکلا۔

بھئی محمد علی بیگ، لوہارو کی سواریاں روانہ ہو گئیں؟

حضرت، ابھی نہیں۔

کیا آج نہ جائیں گی؟

آج ضرور جائیں گی، تیاری ہو رہی ہے۔

مرقومہ شنبہ پنجم جون وقت ۶ بجے، کے عمل میں ۱۸۶۱ء غالب

(۹)

جانِ غالب،

یاد آتا ہے کہ تمہارے عمِ نامدار[۱] سے سُنا تھا کہ لغات "دساتیر" کی فرہنگ وہاں ہے۔ اگر ہوتی تو کیوں نہ تم بھیج دیتے۔ خیر:

آنچہ ما در کار داریم اکثرے درکار نیست

تم ثمرِ نورس ہو اس نہال کے کہ جس نے میری آنکھوں کے سامنے نشو و نما پائی ہے اور میں ہوا خواہ و سایہ نشیں اس نہال کا رہا ہوں۔ کیونکر تم مجھ کو عزیز نہ ہو گے؟ رہی دید وا دید، اس کی دو صورتیں ہیں: تم دِلّی میں آؤ یا میں لوہارو آؤں۔ تم مجبور، میں معذور۔ خود کہتا ہوں کہ میرا عذر زِنہار مسموع نہ ہو۔ جب تک نہ سمجھ لو کہ میں کون

---

[۱] ضیاء الدین احمد خاں نیّر

ہوں اور ماجرا کیا ہے۔

سنو، عالم دو ہیں: ایک عالم ارواح اور ایک عالم آب و گل۔ حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے جو خود فرماتا ہے: لِمَنِ المُلکُ الیَوم؟ اور پھر آپ جواب دیتا ہے لِلّٰہِ الوَاحِدِ القَہَّار۔ ہر چند قاعدۂ عام یہ ہے کہ عالم آب و گل کے مجرم عالمِ ارواح میں سزا پاتے ہیں، لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہ گار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا[1]۔ تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ۷۔ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا[2]۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلّی شہر کو زندان مقرر کیا اور مجھے اس زنداں میں ڈال دیا۔ فکر نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد میں جیل خانہ سے بھاگا۔ تین برس بلاد شرقیہ میں پھرتا رہا[3]۔ پایانِ کار مجھے کلکتہ سے پکڑ لائے اور پھر اسی مجلس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے، دو ہتکڑیاں اور بڑھا دیں[4]۔ پانو بیڑی سے فگار، ہاتھ ہتکڑیوں سے زخم دار، مشقت مقرری اور مشکل ہو گئی، طاقت یک قلم زائل ہو گئی، بے حیا ہوں۔ سال گزشتہ بیڑی کو زاویۂ زنداں میں چھوڑ مع دونوں ہتکڑیوں کے بھاگا[5]۔ میرٹھ، مراد آباد ہوتا ہوا رام پور پہنچا۔ کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا۔ اب عہد کیا کہ

---

[1] یعنی پیدا ہوا

[2] یعنی شادی ہوئی۔ بیڑی سے مراد بیوی ہے۔

[3] اس سے مراد کلکتہ کا سفر ہے، جس میں غالب نے دو مہینے سات ماہ گزارے۔

[4] ہتکڑیوں سے مراد عارف کے بچے باقر علی خاں اور حسین علی خاں ہیں جنھیں غالب، عارف اور اس کی بیوی اور والدہ کی وفات کے بعد اپنے گھر لے آئے تھے۔

[5] پہلے سفر رام پور کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی بیوی کو دلّی میں چھوڑا اور بچوں کو ساتھ لے گیا۔

پھر نہ بھاگوں گا - بھاگوں کیا؟ بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی - حکمِ رہائی[1] دیکھئے کب صادر ہو - ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اس ماہ ذی الحجہ ۱۲۷۷ھ میں چھوٹ جاؤں - بہر تقدیر بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا، میں بھی بعد نجات سیدھا عالمِ ارواح کو چلا جاؤں گا :

فرخ آں روز کہ از خانۂ زنداں بروم
سوئے شہرِ خود ازیں وادیِ ویراں بروم

گانے میں غزل کے سات شعر کافی ہوتے ہیں - دو فارسی غزلیں، دو اردو غزلیں اپنے حافظہ کی تحویل میں بھیجتا ہوں، بھائی صاحب کی نذر :

از جسم بجاں نقاب تا کے؟ — این گنج دریں خراب تا کے؟
این گوہرِ شب فروغ یا رب ! — آلودۂ خاک و آب تا کے؟
این راہروِ سالکِ قدس — واماندۂ خورد و خواب تا کے؟
بیتابیِ برق جز دمے نیست — ما دیں ہمہ اضطراب تا کے؟
جاں در طلبِ نجات تا چند؟ — دل در تعب عتاب تا کے؟
پرسش ز تو بے حساب باید — غم ہائے مرا حساب تا کے؟

غالب بہ چنیں کشاکش اندر
با حضرتِ بوتراب[2] تا کے؟

—— ✻ ——

دوش از گردش بختم گلہ بر روئے تو بود — چشم سوئے فلک و روئے سخن سوئے تو بود
آنچہ شب شمع گماں کردی و رفتی بہ عتاب — نفسم پردہ کشائے اثرِ خوئے تو بود

---

[1] یعنی دیکھئے موت کب آئے -

[2] یہ غزل غالب کے فارسی کلیات میں شامل نہ ہوئی - "سبد چیں" میں چھپی -

چہ عجب، صانع اگر نقش دہانت گم کرد؟ کاں خود از حیرتیانِ رُخِ نیکوے تو بود
بکفِ بادِ صبا داد ایں ہمہ رسوائی دل کاخر از پردگیانِ شکنِ موے تو بود
مردن و جاں بہ تمنّاے شہادت دادن ہم از اندیشۂ آزردنِ بازوے تو بود
دوست دارم گرہے را کہ بکارم زدہ اند کایں ہماں است کہ پیوستہ در ابروے تو بود
لالہ و گل دمد از طرفِ مزارش پس مرگ
تا چہا در دلِ غالب ہوس روے تو بود[1]

ہے بسکہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور کرتے ہیں محبّت تو گزرتا ہے گماں اور
لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا ہر روز دِکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور
ہے خونِ جگر جوش میں دل کھول کے روتا ہوتے جو کئی دیدۂ خوں نابہ فشاں اور
یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور
تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اُٹھیں گے لے آئیں گے بازار سے جاکر دل و جاں اور
مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اُڑ جائے جلّاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ "ہاں اور"
ہیں اور بھی دُنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور[2] ۲ دیکھو صفحہ ۳۰

---

[1] یہ غزل کلیاتِ فارسی میں موجود ہے۔ لیکن اس کے بارہ شعر ہیں بقیہ شعر یہ ہیں۔
چرخ کج باخت بہ من، در خمِ دامِ تو فگند نعل در آذرِ بلا حلقۂ گیسوے تو بود
شب چہ دانی ز تو در بزم بہ خوباں چہ گذشت خاصہ بر صدر نشینے کہ بہ پہلوے تو بود
خلد را از نفسِ شعلہ فشاں مے سوزم تا ندانند حریفاں کہ سرِ کوے تو بود
روشِ بادِ بہاری بہ گمانم افگند کایں گل و غنچہ پئے قافلہ بوے تو بود
ہم از آں پیش کہ مشاطہ بد آموز شود نقش ہر شیوہ در آئینۂ زانوے تو بود

۲ دیکھو صفحہ ۳۰

اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے — بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہُوا کیے
ضد کی ہے اور بات مگر خُو بُری نہیں — بھولے سے اس نے سیکڑوں وعدے وفا کیے
صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو — دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے
رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہنِ مے — مدت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کیے
کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو — کِس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے

غالب تمھیں کہو کہ ملے گا جواب کیا
مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سُنا کیے[1]

ذی الحجہ ۱۲۷۷ھ (جون ۱۸۶۱ء)

(۱۰)

علائی مولائی -

اس وقت تمھارا خط پہنچا - اُدھر پڑھا اِدھر جواب لکھا - واہ ، کیا کہنا ہے !
رام پور کے علاقہ کو گاؤ شنگ[2] اور مجھ کو بیل یا اُس پیوند کے طعنے کو تازیانہ اور

---

[2] بقیہ صفحہ ۲۹ - اُردو دیوان میں اس غزل کے گیارہ شعر ہیں - باقی چار یہ ہیں :

ابرو کو ہے کیا اس نگہ ناز سے پیوند — ہے تیر مقرر مگر اس کی ہے کماں اور
ہر چند سبک دست ہوئے بُت شکنی میں — ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگ گراں اور
لیتا ، نہ اگر دل تمھیں دیتا ، کوئی دم چین — کرتا ، جو نہ مرتا کوئی دن ، آہ و فغاں اور
پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے — رُکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

[1] اس غزل کے باقی شعر یہ ہیں :

دل ہی تو ہے سیاستِ دوباں سے ڈر گیا — میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کیے
بے صرفہ ہی گزرتی ہے ، ہو گرچہ عمرِ خضر — حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کیے
مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم — تونے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کیے

[2] صفحہ ۳۱ دیکھو)

مجھ کو گھوڑا بنایا۔ وہ علاقہ اور وہ پیوند لوہارو کے سفر کا مانع و مزاحم کیوں ہو؟ رئیس کی طرف سے بطریقِ وکیل محکمہ کمشنری میں معین نہیں ہوں۔ جس طرح امرا واسطے فقرا کے وجہ معاش مقرر کر دیتے ہیں، اسی طرح اس سرکار[1] سے میرے واسطے مقرر ہے۔ ہاں، فقیر سے دعائے خیر اور مجھ سے اصلاحِ نظم مطلوب ہے۔ چاہوں دلّی رہوں، چاہوں اکبر آباد، چاہوں لاہور، چاہوں لوہارو۔ ایک گاڑی کپڑوں کے واسطے کروں، کپڑوں کے صندوق میں آدھی درجن شراب دھروں، آٹھ کہار ٹھیکے کے لوں۔ چار آدمی رکھتا ہوں، دو یہاں چھوڑوں، دو ساتھ لوں، چل دوں۔ رام پور سے جو لفافہ آیا کرے گا، لڑکوں کا حافظ لوہارو بھجوایا کرے گا۔ گاڑی ہو سکتی ہے، شراب مل سکتی ہے، کہار بہم پہنچ سکتے ہیں، طاقت کہاں سے لاؤں؟ روٹی کھانے کو باہر کے مکان میں سے محلسرا میں، کہ وہ بہت قریب ہے، جب جاتا ہوں تو ہندوستانی گھڑی بھر میں دم ٹھہرتا ہے اور یہی حال دیوان خانے میں آکر ہوتا ہے۔ والیِ رام پور نے بھی تو مرشد زادہ کی شادی میں بلایا تھا، یہی لکھا گیا کہ میں اب معدومِ محض ہوں۔ تمھارا اقبال تمھارے کلام کو اصلاح دیتا ہے۔ اس سے بڑھ کر مجھ سے خدمت نہ چاہو۔

بھائی[2] کے اور تمھارے دیکھنے کو جی بہت چاہتا ہے، پر کیا کروں؟ عقرب و قوس کے آفتاب یعنی نومبر دسمبر میں قصد تو کروں گا، کاش لوہارو کی جگہ گوڑ گانوہ ہوتا یا بادشاہ پور ہوتا۔ کہو گے کہ رام پور کیا نزدیک ہے؟ وہاں گئے کو دو برس ہو گئے۔ یہاں انحطاط و اضمحلال روز افزوں۔ نہ تم یہاں آسکتے ہو، نہ مجھ میں ہاں

(صفحہ گذشتہ) گاؤ شنگ ہندی میں "آر" کو کہتے ہیں۔ یعنی بیلوں کو ہانکنے کی لکڑی کے سرے پر جو لوہے کی سوئی سی لگا لیتے ہیں۔ وہ سوئی بیلوں کے چبھوئی جائے تو وہ تیز چلتے ہیں۔

[1] یعنی سرکارِ رام پور [2] امین الدین احمد خاں والیِ لوہارو

آنے کا دم۔ بس اگر نومبر دسمبر میں میرا اخیر حملہ چل گیا، بہتر، ورنہ:

اے وائے زمحرومی دیدار دوگر ہیچ

چہار شنبہ ۲۵ ستمبر ۱۸۶۱ء[1] ہنگام نیمروز غالب

(۱۱)

میری جان، کیا کہتے ہو؟ کیا چاہتے ہو؟ ہوا ٹھنڈی ہو گئی۔ پانی ٹھنڈا ہو گیا۔ فصل اچھی ہو گئی۔ اناج بہت پیدا ہو گیا۔ توقیع جانشینی[2] مجھ سے تم کو پہنچا۔ خبر نہ پایا۔ سبحہ و سجادہ کا یہاں پتہ نہیں، ورنہ وہ بھی عزیز نہ رکھتا۔ اِس سے بڑھ کر یہ کہ بھائی نے شفا پائی۔ استاد میر جان پہنچ گئے۔ آخر اکتوبر میں یا آغاز نومبر میں نیر رخشاں کو بھی وہیں لو۔ پھر عقرب و قوس کے آفتاب کا کیا ذکر، آبان ماہ و آذر ماہ سے کیا غرض؟

بسے تیر و دے ماہ وار دی بہشت بر آید کہ ما خاک باشیم و خشت

استاد میر جان کو، اس راہ سے کہ میری پھوپی ان کی چچی تھیں اور یہ مجھ سے عمر میں چھوٹے ہیں، دعا اور اس رو سے کہ دوست ہیں اور دوستی میں کمی و بیشی سن و سال کی رعایت نہیں کرتے، سلام، اور اس سبب سے کہ استاد کہلاتے ہیں، بندگی، اور اس نظر سے کہ یہ سیّد ہیں، درود اور بموافق مضمون اِس مصرع کے:

سوے اللہ واللہ، ما فی الوجود

سجود۔ حضرت وہ شرف نامہ نہیں ہے، کسی احمق نے شرف نامہ میں سے کچھ لغات، اکثر غلط، کمتر صحیح چن کر جمع کیے ہیں۔ نہ دیباچہ ہے کہ اس سے جامع کا حال معلوم ہو، نہ خاتمہ ہے کہ عہد و عصر کا حال کھلے۔ بایں ہمہ میاں ضیاء الدین کے پاس ہے

---

[1] (صفحہ گذشتہ) اصل خط میں تاریخ پہلے مرقوم تھی۔ لیکن میں نے اسے خط کے نیچے درج کیا تاکہ ترتیب میں یکسانی قائم رہے [2] یعنی ادب میں جانشینی کی سند۔

اگر وہ آ جائیں گے تو اُن سے کہہ دوں گا - اگر وہ لائیں گے تو اُن کو قیمت دے کر علائی مولائی کو بھیج دوں گا -

خصی بکروں کے گوشت کے قلیے، دو پیازے، پلاؤ، کباب جو کچھ تم کھا رہے ہو مجھ کو خدا کی قسم اگر اس کا کچھ خیال بھی آتا ہو - خدا کرے، بیکانیر کی مصری کا ٹکڑا تم کو میسّر نہ آیا ہو کبھی یہ تصوّر کرتا ہوں کہ میر جان صاحب اس مصری کے ٹکڑے چبا رہے ہوں گے تو یہاں میں رشک سے اپنا کلیجہ چبانے لگتا ہوں -

سہ شنبہ ۱۵ اکتوبر ۱۸۶۱ء نجات کا طالب، غالب

(۱۲)

مرزا علائی

پہلے استاد میر جان صاحب کے قہر و غضب سے مجھ کو بچاؤ تاکہ میرے حواس، جو منتشر ہو گئے ہیں، جمع ہو جائیں - میں اپنے کو کسی طرح کے قصور کا مورد نہیں جانتا - جھگڑا ان کی طرف سے ہے - تم اس کو یوں چکاؤ: یعنی اگر ان کو عرف آشنائی و ملاقات منظور ہے تو وہ میرے دوست ہیں شفیق ہیں، میرا سلام قبول فرمائیں اور اگر قرابت و رشتہ داری ملحوظ ہے تو وہ میرے بھائی ہیں، مگر عمر میں چھوٹے، میری دعا قبول فرمائیں -

صاحبین[۱] کی رائے کا اختلاف مشہور ہے - مجھ سے کچھ نہیں ہو سکتا، مگر ہر ایک قول جُدا جُدا لکھوں - آج نہ لکھا نہ سہی، دو چار دن کے بعد لکھوں گا - تم سمجھ تو گئے ہو گے کہ صاحبین مرزا قربان علی بیگ اور مرزا تمشاد علی بیگ ہیں -

بھائی صاحب کی رضا جوئی مجھ کو منظور اور یہ غزل معروض ہے - میری

---

[۱] صاحبین - اصل میں حضرت امام ابو یوسفؒ اور حضرت امام محمدؒ کو کہتے ہیں جو حضرت امام اعظمؒ کے شاگرد اور رفیق تھے - یہاں مراد سالک و رضوان ہیں جیسا کہ غالب نے خود تصریح کر دی ہے

طرف سے سلام کہو:

از من غزلے گیر و بفرمائے کہ مطرب — در نے دمد از روے نوازش دو سہ دم را

غزل

جز دفعِ غم زیادہ نبود است کامِ ما — گوئی چراغ روزِ سیاہ ہست جامِ ما
در خلوتش گذر نبود باد را مگر — صرصر بخاکِ راہ رساند پیامِ ما
اے بادِ صبح عطرے ازاں پیرہن بیار — تسکین ز بوے گل نہ پذیرد مشامِ ما
ہر بار دانہ بہر ہما افگنیم و مرد — آید بدام و دانہ رباید ز دامِ ما
گفتی چو حالِ دل شنود مہرباں شود — مشکل کہ پیش دوست تواں برد نامِ ما
از ما بما پیام وہم از ما بما سلام — رنج دلے مباد پیام و سلامِ ما
مقصود ما ز دہر آئینہ نیستی ست — یا رب کہ ہیچ دوست مبادا بکامِ ما
غالب بقولِ حضرت حافظ ز فیضِ عشق — ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

(۱۳)

آج جس وقت کہ روٹی کھانے کو گھر جاتا تھا، شہاب الدین خاں تمھارا خط اور مصری کی بھیلیاں لے کر آئے۔ میں اس کو لوا کر گھر گیا۔ اپنے سامنے مصری تلوائی۔ آدھ پاؤ اوپر دو سیر نکلی۔ خانہ دولت آباد، یہی کافی و وافی ہے۔ اور اب حاجت نہیں۔ روٹی کھا کر باہر آیا۔ تمھارے ابن عم[۲] کا آدمی جواب خط کا متقاضی ہوا کہ شتر سوار جانے والا ہے۔ میں کھانا کھا کر لیٹنے کا عادی ہوں لیٹے لیٹے مصری کی رسید لکھ دی۔ مطالب مندرجہ خط کا جواب کل دوں گا۔

چاشتگاہ سہ شنبہ دوازدہم نومبر ۱۸۶۱ء — غالب

۱؎ اس خط پر تاریخ درج نہیں۔ لیکن خط ۱۲ میں استاد میر جان کے نام سلام کا ذکر ہے جس کے جواب میں کچھ لکھا آیا۔ نظر بہ ظاہر یہ خط اسی کے جواب میں مرقوم ہوا۔

۲؎ شہاب الدین خاں ثاقب ابن ضیاء الدین احمد خاں نیر، ابن عم علائی۔

(۱۴)

صاحب!

صبح جمعہ کو میں نے تم کو خط لکھا، اُسی وقت بھیج دیا۔ پھر دن چڑھے سُنا کہ شب کو پھر دورہ ہُوا۔ گیا، خود اُن سے حال پوچھا۔ محمد علی بیگ کی زبانی یہ معلوم ہُوا کہ بہ نسبت دورہ ہائے سابق خفیف تھا اور افاقہ جلد ہو گیا۔ کل مرزا شمشاد علی بیگ ناقل تھے کہ مجھ سے علی حسین کہتے تھے کہ نواب صاحب فرماتے ہیں کہ لوہارو چلو گے اور ہماری دال روٹی قبول کرو گے؟ میں نے کہا کہ میں دال روٹی چاہتا ہوں مگر پیٹ بھر کے۔ غالب کہتا ہے کہ اس بیان سے یہ معلوم ہُوا کہ سالک[1] سے سلوک منظور نہیں، تنہا ہوائے شمشاد درسراست:

رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند
گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

یک شنبہ۔ یکم فروری سنہ ۱۸۶۲ء

(۱۵)

نیّرِ اصغر[2] سپہرِ سخن سرائی مولانا علائی کے خاطر نشان و دلنشین ہو کہ آج صبح کو ۵ یا ۶ گھڑی دن چڑھے دونوں بھائی صاحب تشریف لائے۔ میں گیا اور ملا

---

[1] قربان علی بیگ سالک جو شمشاد علی بیگ رضواں کے بھائی تھے۔ مطلب یہ کہ نواب صرف شمشاد علی بیگ کو ساتھ لے جا رہے تھے اور قربان علی بیگ سے سلوک کے لیے تیار نہ تھے۔ منشی مہیش پرشاد نے لکھا ہے کہ "تنہا ہوائے شمشاد درسراست" کے کچھ معنی نہیں بنتے لیکن معنے بالکل ظاہر ہیں۔ سالک سے سلوک منظور نہیں۔ صرف شمشاد کا شوق سر میں ہے۔ یعنی سالک کو اپنے پاس رکھنے کے لیے تیار نہیں ہیں صرف شمشاد کو رکھنے پر آمادہ ہیں۔ ہوا کا لفظ شمشاد کی مناسبت سے لائے ہیں۔ اس خط میں بھی نواب امین الدین احمد خاں کی بیماری کا ذکر ہے۔

[2] نیّرِ اصغر علائی کو اس لیے کہا کہ ضیاء الدین احمد خاں نیّر سے چھوٹے تھے اور غالب کے خلیفہ ثانی۔

علی حسین خاں کو بھی دیکھا۔ تھوڑی دیر کے بعد بھائی صاحب والدہ صاحبہ کے پاس گئے۔ میں گھر آیا کھانا کھایا۔ دوپہر کو تمھارا خط پایا۔ دو گھڑی لوٹ پوٹ کر جواب لکھا اور ڈاک میں بھجوایا۔

یہ مرض جو بھائی کو ہے اس راہ سے کہ ضد صحت ہے، مکروہ طبع ہے، ورنہ ہرگز موجب خوف و خطر نہیں۔ میں تو بھول گیا تھا۔ اب بھائی کے بیان سے یاد آگیا کہ ۱۲-۱۳ برس پہلے ایک دن ناگاہ یہ حالت طاری ہو گئی تھی۔ وہ موسم جوانی کا تھا اور حضرت عادی بہ افیون نہ تھے۔ تنقیہ بہ قے فوراً اور بہ اسہال چند روز بعد عمل میں آیا۔ اب سن کہولت، استعمال افیون مزید علیہ۔ دورہ جلد جلد متواتر ہوا۔ اضطراب از راہِ محبت ہے، از روے حکمت اضطراب کی کوئی وجہ نہیں۔ نظری[1] میں یکتا حکیم امام الدین خاں، وہ ٹونک۔ عملی[2] میں چالاک حکیم احسن اللہ خاں[3]، وہ کرولی۔ رہے حکیم محمود خاں[4]، وہ ہمسایہ دیوار بہ دیوار۔ حکیم غلام نجف خاں وہ دوست قدیم صادق الولا۔ حکیم "بقا"[5] کے خاندان میں دو صاحب موجود۔ تیسرے حکیم "منجھلے" وہ بھی شریک ہو جائیں گے۔ اب آپ فرمائیے حکیم کون ہے؟ ہاں دو ایک ڈاکٹر باعتبار ہم قومی حکام[6] نامور یا کوئی ایک آدھ بیدا سومنزوی اور

---

[1] نظری کا مطلب یہ ہے کہ علم وطب میں

[2] عملی سے مراد ہے علاج معالجہ میں۔

[3] حکیم امام الدین خاں اور حکیم احسن اللہ خاں دہلی کے مشہور طبیب تھے۔ اول الذکر غدر کے بعد ٹونک چلے گئے اور بڑے بڑے والیانِ ریاست کے معالج رہے۔ حکیم احسن اللہ خاں ریاست کرولی میں ملازم ہو گئے تھے

[4] حکیم محمود خاں شریف خانی والد مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم۔

[5] بقا کا خاندان اطبا بڑا مشہور تھا۔ منجھلے صاحب کا نام حکیم حسام الدین تھا۔

[6] یعنی انگریز۔

گمنام۔ بہر حال خاطر جمع رکھو۔ خدا کے فضل پر نظر رکھو۔

سبحان اللہ۔ تم مجھ سے سپارش کرو امین الدین خاں کی؟ کیا میرے پہلو میں دل یا میرے دل میں ایمان، جس کو محبت بھی کہتے ہیں، بقدر پر پشّہ و سرِ مور بھی نہیں؟ معالجہ حکما کی راہ پر رہے گا۔ ندیمی اور غمخواری میں اگر قصور کروں تو گنہ گار۔ میاں! ایسے موقع میں رائے اطبا میں خلاف کم واقع ہوتا ہے۔ مرض مشخّص، دوا معیّن، سوءِ مزاج سادہ نہیں، مادی ہے اور مادہ بارِد ہے۔[1] کوئی طبیب سوائے تنقیہ کے کچھ تدبیر نہ سوچے گا۔ تنقیہ میں سوائے مخرجات بلغم اور کچھ تجویز نہ کرے گا۔ تجویز ہے کہ دو دن کے بعد تنقیہ خاص ہو اور ایارج[2] کا مسہل دیا جائے۔ اسماو آیات[3] شفا بخش مقرر ہیں۔ ردِ سحر و دفع بلا ان کے ذریعہ سے متصوّر ہے۔ مگر ان ملّاؤں اور عزائم خوانوں نے تہ توڑ دی ہے۔ کچھ نہیں جانتے اور باتیں بگھارتے ہیں۔ تمہارے باپ پر کوئی سحر کیوں کرے گا؟ بیچارہ الگ ایک ایسے گوشہ رہتا ہے کہ جب تک خاص وہاں کا قصد نہ کرے، کبھی کوئی وہاں نہ جائے۔ یہ خیال عبث۔ ہاں خیرات اور مساکین سے طلب دعا اور اہل اللہ سے استمداد، شہر میں مساکین شمار سے باہر، اہل اللہ میں ایک حافظ عبدالعزیز۔ ما بخیر، شما بسلامت۔

۱۵ شعبان ۱۲۷۸ھ (فروری ۱۸۶۲ء)۔ وقت نماز ظہر نجات کا طالب غالبؔ

(۱۶)

صاحب

کل تمہارے خط کا جواب بھیج چکا ہوں، پہنچا ہو گا۔ آج صبح کو بھائی

---

[1] خرابی مزاج سادہ نہیں۔ اس میں مادہ جمع ہو گیا ہے جو بارِد ہے

[2] ایک دوائے مسہل جس سے دماغ کا تنقیہ ہوتا ہے۔

[3] یعنی وہ آیتیں یا اوراد جو شفائے مرض یا ردّ سحر یا دفع بلا کے لیے پڑھے جاتے ہیں۔

صاحب کے پاس گیا۔ بھائی ضیاء الدین خاں اور بھائی شہاب الدین خاں بھی وہیں تھے۔ مولوی صدر الدین[1] میرے سامنے آئے۔ حکیم محمود خاں کے طور پر معالجہ قرار پایا ہے، یعنی انھوں نے نسخہ لکھ دیا ہے۔ سو اس کے موافق حبوب[2] بن گئی ہیں۔ نقوع[3] کی دوائیں آج آ کر بھیگیں گی۔ کل حبوب کے اوپر وہ نقوع پیا جائے مگر انداز و ادا سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی حضرت مریض کی اور ان کے ہواخواہوں کی رائے میں قصد اس استعلاج کا مذبذب[4] ہے۔ نسخے کی حقیقت کو میزانِ نظر میں تول رہے ہیں۔ استاد میر جان بھی تھے۔ نیم نامعقول مرزا اسد بیگ بھی تھے۔ سب طرح خیریت ہے۔

کل تمھارے خط میں دو بار یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دلّی بڑا شہر ہے۔ ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہوں گے۔ اے میری جان! یہ وہ دلّی نہیں، جس میں تم پیدا ہوئے ہو۔ وہ دلّی نہیں جس میں تم نے تحصیلِ علم کیا۔ وہ دلّی نہیں ہے جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آیا کرتے تھے۔ وہ دلّی نہیں ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں۔ ایک کیمپ[5] ہے۔ مسلمان، اہلِ حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ، باقی سراسر ہنود۔ معزول بادشاہ[6] کے ذکور، جو بقیۃ السیف ہیں وہ پانچ پانچ روپے مہینہ پاتے ہیں۔ اناث میں سے جو پیر زن ہیں، کٹنیاں اور جو جوانیں کسبیاں۔ امرائے اسلام میں سے اموات گنو۔ حسن علی خاں[7] بہت بڑے باپ کا

---

[1] مفتی صدر الدین خاں آزردہ جو غدر سے پہلے صدر الصدور تھے۔

[2] گولیاں [3] نقوع: وہ دوائیں جو بھگو کر پلائی جاتی ہیں [4] یعنی علاج کا ارادہ پختہ نہیں ہوا۔

[5] یعنی چھاؤنی، معسکر [6] بہادر شاہ ثانی

[7] نجابت علی خاں والی جھجر کا چھوٹا بیٹا۔ بڑے بھائی فیض محمد خاں کے عہدِ حکومت میں فوج کا سپہ سالار رہا۔ جب فیض علی خاں مسند پر بیٹھا تو اختلاف پیدا ہو گیا۔ مقدمے تک نوبت پہنچی آخر سرکار انگلشیہ نے صلح کرائی تین ہزار روپے ماہوار پنشن لیکر دہلی میں اقامت اختیار کر لی۔ غدر کے دنوں میں باہر نکل گیا تھا۔ جنوری ۱۸۵۹ء میں واپس آیا۔ غالب کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۸۶۲ء میں فوت ہوا۔ اس وقت تک صرف سو روپے ماہوار ملتے تھے

بیٹا، سو روپے روز کا پنسن وار، سو روپے مہینہ کا روزینہ دار، بن کر نامرادانہ مر گیا۔ میر نصیر الدین[1] باپ کی طرف سے پیرزادہ، نانا اور نانی کی طرف سے امیرزادہ، مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان، بخشی محمد علی خاں کا[2] بیٹا، جو خود بھی بخشی ہو چکا ہے، بیمار پڑا، نہ دوا، نہ غذا۔ انجام کار مر گیا۔ تمھارے چچا کی سرکار سے تجہیز و تکفین ہوئی۔ احبا کو پوچھو، ناظر حسین مرزا[3]، جس کا بڑا بھائی مقتولوں میں آیا، اس کے پاس ایک پیسہ نہیں۔ ٹکے کی آمد نہیں۔ مکان اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے، مگر دیکھیے کہ چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے۔ بڈھے[4] صاحب ساری املاک بیچ کر، نوش جان کر کے، بیک بینی و دو گوش بھرت پور چلے گئے۔ ضیاء الدولہ[5] کی پانسو روپے کرایہ کی املاک واگزاشت ہو کر پھر قرق ہو گئی۔ تباہ و خراب لاہور گیا۔ وہاں پڑا ہوا ہے۔ دیکھیے کیا ہوتا ہوتا ہے۔ قصہ کوتاہ قلعہ اور جھجر اور بہادر گڑھ اور بلب گڈھ اور فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ روپے کی ریاستیں مٹ گئیں۔ شہر کی عمارتیں خاک میں مل گئیں

۱؎ شیخ نصیر الدین عرف کالے میاں۔ یہ خواجہ فخر الدین فخر عالم کے پوتے اور شیخ نظام الدین کے فرزند تھے۔ ان کی والدہ دہلی کے کسی امیر خاندان سے تھی، اسی لیے نانا نانی کو امرا میں گنا۔

۲؎ بخشیوں کا خاندان بھی بڑا مشہور اور بلند منزلت تھا

۳؎ ناظر حسین مرزا نام اور پورا لقب معین الدولہ، عمدۃ الامرا صفدر الملک فخر الدین ذوالفقار حیدر نظامت خاں بہادر ذوالفقار جنگ تھا اور بڑے بھائی کا نام مظفر الدولہ سیف الدین حیدر خاں۔ دونوں حسام الدین حیدر خاں کے فرزند تھے۔ مظفر الدولہ مارے گئے۔ ناظر حسین مدت تک پریشاں حال پھرتے رہے۔

۴؎ بڈھے صاحب کا نام نواب غلام محی الدین تھا، رؤسا دہلی میں سے تھے۔ ایک ہزار ماہوار پنشن تھی۔ تین سو روپے ماہوار بھرت پور سے ملتے تھے۔ پانسو ماہانہ کرایہ آتا تھا۔

۵؎ حکیم رکن الدولہ کے بیٹے تھے۔ غدر کے بعد پانی پت چلے گئے اور پکڑے آئے۔

ہنرمند آدمی یہاں کیوں پایا جائے؟ جو حکمار کا حال لکھا ہے، وہ بیان واقع ہے صلحا اور زہاد کے باب میں جو حرف مختصر میں نے لکھا ہے اس کو بھی سچ جانو۔ اپنے والد ماجد کی طرف سے خاطر جمع رکھو۔ سحر آسیب کا گمان ہرگز نہ کرو۔ خدا چاہے تو استعمال ایارجات کے بعد بالکل اچھے ہو جائیں گے اور اب بھی خدا کے فضل سے اچھے ہیں۔

یک شنبہ ۱۶ر فروری ۱۸۶۲ء عافیت کا طالب غالب

(۱۷)

صاحب!

پرسوں تمھارا خط آیا۔ کل جمعہ کے دن نواب کا مسہل تھا۔ گیارہ بجے ہاں سے آیا۔ چونکہ جوب میں مکرب[1] دوائیں تھیں، بہت بے چین رہے۔ آٹھ دس دست آئے۔ آخر روز مزاج بحال ہو گیا۔ تنقیہ اچھا ہوا۔ اب بفضل الٰہی اچھے ہیں اور یقین ہے کہ مرض عود نہ کرے۔ دلّی کی اقامت کی مدت اپنے والد کی رائے پر رہنے دو۔ بقدر مناسب، وقت عزم، خیر خواہانہ کچھ کہوں گا ضرور، نہ بہ ابرام میں تم سے زیادہ ان کا مزاج داں ہوں۔ یہ خود پسند اور بہ ایں ہمہ سپارش کا دشمن ہے منگلچوں[2] کے مقدمے کو طبیعت امکان پر چھوڑ دو۔ میں دخل نہ کروں گا ہاں، اگر خود مجھ سے پوچھیں گے یا میرے سامنے ذکر آجائے گا تو میں اچھی طرح کہوں گا

بہ بدہ باد زبانے کہ ناسزا گوید

بُرا نہ ماننا۔ اگر یہ دونوں بھائی یا ان میں سے ایک رفیق ہو گیا۔ یوں تمام عمر بخوشی گزر جائے، لیکن تم کے برس، کے مہینے، کے ہفتے کا اگریمنٹ لکھتے ہو۔

صبح یک شنبہ یکم مارچ ۱۸۶۲ء غالب

---

[1] کرب پیدا کرنے والی
[2] منگلچوں سے مراد قربان علی بیگ اور تمشاد علی بیگ ہیں

(۱۸)

صاحب!

میرا برادر عالی قدر اور تمھارا والد ماجد اب اچھا ہے۔ از روے عقل اعادۂ مرض کا احتمال باقی نہیں ہے۔ رہا وہم، اس کی دوا لقمان کے پاس بھی نہیں۔ مرزا قربان علی بیگ اور مرزا شمشاد علی بیگ کے باب میں جو کچھ تم نے لکھا ہے اور آیندہ جو کچھ لکھو گے، میری طرف سے جواب وہی ہوگا، جو آگے لکھ چکا ہوں۔ یعنی میں تماشائی محض رہوں گا۔ اگر بھائی صاحب مجھ سے کچھ ذکر کریں گے تو بھلی کہوں گا۔

آپ کے عم عالی مقدار جو فرماتے ہیں کہ غالب کو بیٹھے ہوئے ہزار ہا وسوسہ ہائے خیالات دکھلائی دیتے ہیں، یہ حضرت[1] اپنی ذات پر میری طبیعت کو طرح کیا ہے اور وہ یہ سمجھے ہیں کہ جس طرح میں مبتلاے وساوس و اوہام ہوں اور لوگ بھی اسی طرح بخارات مراقی میں گرفتار ہوں گے۔ قیاس مع الفارق ہے نہ تخییل صادق۔ یہاں لا موجود الا اللہ کے بادۂ ناب کا رطل گراں چڑھائے ہوئے اور کفر و اسلام و نور و نار کو مٹائے ہوئے بیٹھے ہیں۔

کجا غیر و کو غیر و کو نقش غیر
سواے اللہ و اللہ ما فی الوجود

ضیمران بروزن "زعفران" لغت عربی ہے نہ معرب۔ میں یہ نہیں سکتا کہ یہ پھول ہندستان میں ہوتا ہے یا نہیں۔ اس کی تحقیقات از روے الفاظ الادویہ ممکن ہے۔

آج اس نے جلاب لیا، دس دست آئے، مواد خوب اخراج ہوا۔

فارسی غیر فصیح: امروز فلانے مسہل گرفت، دہ دست آمدند، مواد خوب بر آمد۔

فارسی فصیح: امروز فلانے پگاہ، دارو ے مسہل آشامید، تا شام دہ بار نشست یا دہ بار بمستراح یا دہ بار بہ بیت الخلا رفت مادۂ فاسد چنانکہ باید اخراج یافت۔

---

[1] ملاحظہ ہو خط نمبر ۱۷

معلوم رہے کہ لوطیوں کے منطق میں خصوصاً اور اہل پارس کے روزمرہ میں
میں عموماً "نشستن" استعارہ ہے "ریدن" کا ۔ چنانچہ ایک تذکرہ میں مرقوم ہے
کہ اصفہان میں ایک امیر نے شعرا کی دعوت اپنے باغ میں کی ۔ مرزا صائب اور اس
عصر کے کئی شعرا جمع ہوئے ۔ ایک شاعر کہ تذکرہ میں اس کا نام مندرج ہے اور
میں بھول گیا ہوں، اکول[1] تھا اور معدہ اس کا ضعیف تھا ۔ حرص و شرہ[2] کے سبب
سے بہت کھا جاتا تھا، ہضم نہ کر سکتا تھا۔ کھانا کھا کر، شراب پی کر دروازۂ باغ کا
مقفل کر کے سب سو رہے ۔ اس مرد اکول فضول نے رات بھر میں سارا باغ ہگ بھرا۔
نہ ایک جگہ، بلکہ کبھی اس کیاری میں ۔ اور کبھی اس روش پر، کبھی اس درخت کے
تلے، کبھی اس دیوار کی جڑ میں ۔ قصہ مختصر غائت شرم و حیا سے دو چار گھڑی رات
رہے دیوار سے کود کر چلا گیا ۔ صبح کو جب جاگے، اس کو ادھر اُدھر ڈھونڈا، کہیں
نہ پایا ۔ مگر حضرت کا فضلہ کئی جگہ نظر آیا ۔ مرزا صائب نے ہنس کر فرمایا ۔ "یاران
شمارا چہ افتادہ است کہ مے گویند فلاں در باغ نیست ؟ می بینم کہ مخدوم ہم دریں
باغ چند جا نشستہ است"

صبح جمعہ ۵ رمضان و ۷ مارچ سال رستاخیز ۔

رباعی خط میں لکھنا بھول گیا ۔ یہ میں نے بھائی کو تہنیت میں بھیجی تھی

اے کردہ بہ مہر زرفشانی تعلیم — پیدا زکلاہ تو شکوہِ دیہیم
بادا بتو فرخندہ ز یزدانِ کریم — پروانگی جدید و اقطاعِ قدیم

۵ ۔ رمضان ۱۲۷۸ھ ۔ ۷ ۔ مارچ ۱۸۶۲ء

۷ ۔ مارچ ۱۸۶۲ء

(۱۹)

یار بھتیجے، گویا بھائی، مولانا علائی ! خدا کی دہائی، نہ میں ویسا ہوں گا جیسا

---

[1] بہت کھانے والا [2] حرص، لالچ

نیر سمجھا اور تم مجھ کو لکھ چکے ہو یعنی خفقانی اور خیال تراش ۔ نہ ویسا ہوں گا جیسا میرزا علی حسین خاں بہادر سمجھے ہوں گے :

اے کاش کسے ہر آنچہ ہستم داند

دو جانے میں میرا انتظار اور میرے آنے کا تقریب شادی پر مدار ، یہ بھی شعبہ ہے انھیں ظنون کا ، جن سے تمھارے چچا کو گمان ہے مجھ پہ جنون کا ۔ جاگیردار میں نہ تھا کہ ایک جاگیردار مجھ کو بلاتا ۔ گویا نہ تھا کہ اپنا ساز و سامان لے کر چلا جاتا ۔ دو جانے جا کر شادی کماؤں اور پھر اس فصل ہیں کہ دنیا کرہ نار ہو؟ لوہارو بھائی کے دیکھنے کو نہ جاؤں اور پھر اس موسم میں کہ جاڑے کی گرمی بازار ہو

کل استاد میر جان صاحب نے تمھارا خط مجھ کو دکھایا ہے ۔ میں نے ان کو جانے نہ جانے میں متردد پایا ہے ۔ جائیں ، نہ جائیں ، میں اپنی طرف سے ترغیب کرتا رہتا ہوں اور کہتا رہوں گا ۔ غلام حسن[1] خاں اگر کسی وقت آ جائیں گے تو ان کو تمھاری تحریر کا خلاصہ خاطر نشاں کر دوں گا ۔ حق سبحانہ تعالیٰ ان دونوں صاحبوں کو یا ایک کو ان میں سے توفیق دے یا مجھ کو طاقت یا تم کو انصاف ، کہ میرے نہ آنے کو وتی کی دل بستگی پر محمول نہ کرو ۔ مجھ کو رشک ہے جزیرہ نشینوں[2] کے حال پر اور رئیس فرخ آباد[3] پر خصوصاً کہ جہاز سے اتر کر سرزمین عرب میں چھوڑ دیا ۔ آہا ہا ہا :

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

---

[1] غلام حسن خاں محو پسر غلام حسین خاں مسرور ۔ (والد عارف)

[2] وہ لوگ جن کو غدر کے بعد انڈمان بھیجا گیا تھا ۔

[3] تفضل حسین خاں رئیس فرخ آباد ۔ جن پر غدر میں شرکت کا الزام لگا تھا اور خود ان کی خواہش پر ان کو عرب بھیج دیا گیا تھا ۔ مکہ معظمہ میں ان کی وفات ہوئی ۔

کلیات[۴] کے انطباع کا اختتام اپنی زیست میں مجھ کو نظر نہیں آتا۔ قاطع برہان[۵] کا چھاپا تمام ہو گیا۔ حق التصنیف کی ایک جلد میرے پاس آگئی۔ وہ تمھارے عم نامدار کی نذر ہوئی۔ باقی جلدیں جن کا میں خریدار ہوا ہوں اور درخواست میری مطبع میں داخل ہے۔ جب تک قیمت نہ بھیج دوں، کیونکر آئیں؟ روپے کی تدبیر میں ہوں۔ اگر بہم پہنچ جائے تو بھیج دوں۔ تمھارے پاس جو "قاطع برہان" پہنچی ہے اگر چھاپے کی ہے، تو صحیح ہے۔ جہاں تردد ہو، غلط نامۂ ملحقہ میں دیکھ لو۔ زیادہ انکشاف منظور ہو تو مجھ سے پوچھ لو۔ اگر قلمی ہے تو درجۂ اعتبار سے ساقط ہے۔ اس کو میری تالیف نہ سمجھو، بلکہ مجھ کو مول لے لو اور اس کو پھاڑ ڈالو۔ آج یوم الخمیس ۱۹۔ جون المبارک بارہ پر تین بجے تمھارا خط آیا۔ اُدھر پڑھا اُدھر جواب لکھنے بیٹھا۔ یہاں تک لکھ چکا تھا کہ شیخ شہاب الدین سہروردی[۶] آئے۔ تمھارا خط ان کو دیا۔ وہ پڑھ رہے ہیں، ہم لکھ رہے ہیں۔ ہوا سرد چل رہی ہے۔

۱۹۔ جون ۱۸۶۲ء

(۲۰)

جان غالب۔

دو خط متواتر تمھارے پہنچے۔ مغربی[۱] "عرفا" میں سے ہے۔ بیشتر اس کے کلام میں مضامین حقیقت آگئے ہیں لیکن "داماں گلہ دارد" اس زمین میں میں نے اس کی غزل نہیں دیکھی۔ حاجی محمد جان قدسی کی غزل اسی زمین میں ہے:

در بزم وصال تو بہ ہنگام تماشا　　نظارہ زجنبیدن مژگاں گلہ دارد

۴۔ کلیات نظم فارسی جو نولکشور کے مطبع میں چھپ رہی تھی

۵۔ "برہان قاطع" کے رد میں غالب کی کتاب جو پہلی مرتبہ ۱۸۶۲ء میں چھپی تھی۔ پھر "درفش کاویانی" کے نام سے بعض فوائد کے اضافے کے ساتھ اسے ۱۸۶۵ء میں چھاپا گیا تھا۔

۶۔ شہاب الدین خاں ثاقب جنھیں مشہور شیخ طریقت سے اشتراک اسم کے باعث سہروردی کہا۔

۱۔ فارسی کا ایک شاعر۔

یہ ایک شعر اس کا مجھے یاد ہے۔ بھائی تمھارا باپ بدگمان ہے، یعنی مجھ کو زندہ سمجھتا ہے۔ میرا سلام کہو اور یہ شعر میرا پڑھ سناؤ:

گمانِ زیست بود بر منت ز بے دردی
بداست مرگ ولے بدتر از گمانِ تو نیست

مجھے کافور و کفن کی فکر پڑ رہی ہے، وہ ستمگر شعر و سخن کا طالب ہے۔ زندہ ہوتا تو وہیں کیوں نہ چلا آتا؟ مجھ پر سے یہ تکلیف اُٹھوالو اور تم اس زمین میں چند شعر لکھ کر بھیج دو۔ میں اصلاح دے کر بھیج دوں گا۔ عصائے پیر بجائے پیر۔ واللہ میرا کلام ہندی یا فارسی کچھ میرے پاس نہیں ہے۔ آگے جو کچھ حافظہ میں موجود تھا، وہ لکھ بھیجا۔ اب جو کچھ یاد آگیا، وہ لکھتا ہوں۔

غزل

با من کہ عاشقم سخن از ننگ و نام چیست	در امر خاص حجّتِ دستورِ عام چیست؟
ہستم ز خونِ دل کہ دو چشمم ازاں پُر است	گوئی مخور شراب و نہ بینی بجام چیست؟
با دوست ہر کہ بادہ بخلوت خورد مدام	داند کہ حور و کوثر و دار السلام چیست؟

عہ کلیات میں اس غزل کے دس شعر ہیں۔ باقی ذیل میں درج ہیں:

در روز تیرہ از شبِ تارم نہ ماند بیم	چوں صبح نیست، خود چہ شناسم کہ شام چیست؟
با خیل مورے رسی ازرہ خوش است فال	قاصد بگو کز آں لب نوشیں پیام چیست؟
گفتی قفس خوش است، تواں بال و پر کشود	بارے علاج خستگی بند دام چیست؟
نیکی زتست، از تو نخواہیم مزد کار	در خود بدیم کار تو ایم، انتقام چیست؟

اس خط پر کوئی تاریخ ثبت نہیں۔ لیکن قرینہ یہی ہے کہ یہ ۱۸۶۲ء کا ہے، اس لیے کہ کلیات چھپنے سے پہلے کا معلوم ہوتا ہے اور اس سے بعد کے خط میں گلہ وارد والے شعر کا حوالہ ہے۔ وہ جولائی ۱۸۶۲ء میں لکھا گیا تھا۔

ما خستۂ غمیم و بو و مے دواے ما — باخستگاں حدیثِ حلال و حرام چیست؟
از کاسۂ کرام نصیب است خاک را — تا از فلک نصیبۂ کاسِ کرام چیست؟
غالب اگر نہ خرقۂ و مصحف بہم فروخت — پرسد چرا کہ نرخ مے لعل فام چیست؟

(۲۱)

لو صاحب، پرسوں تمھارا خط آیا اور کل دوپہر کو استاد میر جان آئے۔ جب اُن سے کہا گیا تو یہ جواب پایا کہ میں مدت سے آمادۂ سفرِ لوہارو بیٹھا ہوں۔ حکیم صاحب کی گاڑی کی روانگی کے وقت میں نے اپنی گٹھڑی بھیجی تھی، وہ پھری آئی، اس مراد سے کہ گاڑی میں جگہ نہ گٹھڑی کی، نہ سواری کی۔ ناچار چُپ ہو رہا۔ اب وہ گٹھڑی ویسی ہی بندھی ہوئی رکھی ہے۔ جب میاں خاں اور وزیر خاں روانہ ہوں گے اور منشی امداد حسین مجھ کو اطلاع دیں گے، تو میں فوراً چل دوں گا۔ پا بہ کاب ہوں۔ کل ہی آخر روز غلام حسن خاں آئے۔ کل انھوں نے چوتھے دِن کھانا کھایا تھا۔ ہیضہ ہو گیا تھا۔ قے متواتر، دست پے بہ پے۔ غرض بچ گئے۔ کہتے تھے کہ آج جولائی کی ۷ اتاریخ ہے۔ تیرہ دِن یہ اور پانچ دِن اگست کے اور[۱] نہیں جا سکتا۔ تنخواہ لے کر بانٹ بونٹ کر ایک دن نہ ٹھیروں گا، لوہارو کی راہ لوں گا۔ مرزا شمشاد علی بیگ سے تمھارا پیام کہا گیا۔ بعید ہے جو غلام حسن خاں کے ہم سفر ہو جائیں۔ بھائی کی طرف سے منشی امداد حسین خاں کو لکھوا بھیجو کہ میاں خاں وغیرہ کے ساتھ استاد کو ضرور بھیجنا اور تم اپنی طرف سے اپنے ابن عم غلام حسن کو بحوالہ میری تحریر کے عیادت اور اوائل اگست میں روانگی کی تاکید لکھ بھیجو۔

در بزمِ وصالِ تو بہ ہنگامِ تماشا
نظارہ ز جنبیدنِ مژگاں گلہ دارد

۱۔ یہاں اور بہ معنے مزید ہے۔

یہ زمین قدسی رحمۃ اللہ علیہ کے حصے میں آگئی ہے، میں اس میں کیونکر تخم ریزی کروں اور اگر بے حیائی سے کچھ ہاتھ پانو ہلاؤں تو اس کا جواب کہاں سے لاؤں؟

ہرگز نتواں گفت دریں قافیہ اشعار
بیجاست برادر اگر از من گلہ دارد

التوائے شرب شراب ۲۲ جون، شروع شراب ۱۰ جولائی
المنۃ للہ کہ در میکدہ باز است

۱۸ جولائی ۱۸۶۲ء - غالب

(۲۲)

میری جان!

سُن پنجشنبہ پنج شنبہ آٹھ[1] جمعہ نو ہفتہ دس اتوار گیارہ، ایک مژہ برہم زدن مہینہ نہیں تھما۔ اس وقت بھی شدت سے برس رہا ہے۔ انگیٹھی میں کوئلے دہکا کر پاس رکھ لیے ہیں۔ دو سطریں لکھیں اور کاغذ کو آگ سے سینک لیا۔ کیا کروں؟ تمھارے خط کا جواب ضرور۔ لو سنتے جاؤ: مرزا شمشاد علی بیگ کو تمھارا خط پڑھوا دیا۔ انھوں نے کہا کہ غلام حسن خاں کی معیت پر کیا موقوف ہے، مجھے آج سواری مل جائے کل چل نکلوں۔ اب میں کہتا ہوں کہ اونٹ ٹٹو کا موسم نہیں، گاڑی کی تدبیر ہو جائے، بس۔

پچاس برس کی بات ہے کہ الٰہی بخش خاں[2] مرحوم نے ایک زمین نئی نکالی، میں نے حسب الحکم غزل لکھی۔ بیت الغزل یہ

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا، نہ دے، شراب تو دے

---

[1] آٹھ اتفاق سے تمام نسخوں میں حذف ہو گیا۔ غلطی بالکل واضح تھی لیکن کسی کی توجہ تصحیح کی طرف نہ گئی۔

[2] غالب کے خسر الٰہی بخش خاں معروف

مقطع یہ ہے :-

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پانو پھول گئے

کہا جو اس نے ذرا میرے پانو، داب تو دے

اب میں دیکھتا ہوں کہ مطلع اور چار شعر کسی نے لکھ کر اس مقطع اور اس بیت الغزل کو شامل اُن اشعار کے کر کے غزل بنائی ہے اور اس کو لوگ گاتے پھرتے ہیں۔ مقطع اور ایک شعر میرا، اور پانچ شعر کسی اُلّو کے۔ جب شاعر کی زندگی میں گانے والے شاعر کے کلام کو مسخ کر دیں، تو کیا بعید ہے کہ دو شاعر متوفی کے کلام میں مطربوں نے خلط کر دیا ہو! مقطع بے شک مولانا مغربی کا ہے اور وہ شعر جو میں نے تم کو لکھا ہے اور یہ شعر جواب لکھتا ہوں :

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار گلچینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

یہ دونوں شعر قدسی کے ہیں۔ مغربی قدما میں اور عرفا میں ہے جیسا عراقی۔ ان کا کلام دقائق و حقائقِ تصوّف سے لبریز۔ قدسی شاہجہانی شعرا میں صائب و کلیم کا ہم عصر اور ہم چشم۔ ان کا کلام شور انگیز۔ اِن بزرگوں کی طرز روش میں زمین آسمان کا فرق۔

بھائی صاحب کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں کہ اُدھر متھرا داس سے قرض لیا، اُدھر درباری مل کو مارا، اُدھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جا لوٹی۔ ہر ایک کے پاس تمسک مُہری موجود، شہد لگاؤ، چاٹو، نہ مول نہ سود۔ اس سے بڑھ کر یہ بات کہ روٹی کا خرچ پھوپی کے سر۔ بایں ہمہ کبھی خان[۱] نے کچھ دے دیا، کبھی الور سے کچھ دلوا دیا، کبھی ماں نے آگرے سے بھیج دیا۔ اب میں اور

---

[۱] خان سے مراد بظاہر احمد بخش خاں مرحوم ہیں جو الٰہی بخش خاں معروف کے بڑے بھائی، فیروز پور جھرکا اور لوہارو کے نواب تھے۔

باسٹھ روپے آٹھ آنے کلکٹری[۱] کے، سو روپے رامپور کے۔ قرض دینے والا ایک میرا مختار کار، وہ سود ماہ بماہ لیا چاہے۔ مول میں قسط اس کو دینی پڑے۔ انکم ٹیکس جدا، چوکیدار جدا، سود جدا، مول جدا، بی بی جدا، بچے جدا، شاگرد پیشہ جدا، آمد وہی ایک سو باسٹھ۔ تنگ آ گیا۔ گزارہ مشکل ہو گیا۔ روزمرہ کا کام بند رہنے لگا۔ سوچا کہ کیا کروں؟ کہاں سے گنجایش نکالوں؟ قہر درویش بجان درویش۔ صبح کو تبرید متروک، چاشت کا گوشت آدھا، رات کو شراب و گلاب موقوف۔ بیس بائیس روپے مہینہ بچا، روزمرہ کا خرچ چلا۔ یاروں نے پوچھا: تبرید و شراب کب تک نہ پیو گے؟ کہا گیا کہ جب تک وہ نہ پلائیں گے۔ پوچھا: نہ پیو گے تو کس طرح جیو گے؟ جواب دیا کہ جس طرح وہ جلائیں[۲] گے۔ بارے مہینہ پورا نہیں گزرا تھا کہ رامپور سے علاوہ وجہ مقرری اور روپیہ آ گیا۔ قرض مقسط ادا ہو گیا۔ متفرق رہا، خیر رہو۔ صبح کی تبرید، رات کی شراب جاری ہو گئی۔ گوشت پورا آنے لگا۔

چونکہ بھائی صاحب نے وجہ موقوفی و بحالی کی پوچھی تھی، اُن کو یہ عبارت پڑھا دینا اور حمزہ خاں کو بعد سلام کہنا:

اے بے خبر ز لذتِ شرابِ مدام ما

دیکھا ہم کو یوں پلاتے ہیں۔ وریبہ کے بنیوں اور لونڈوں کو پڑھا کر مولوی مشہور ہونا اور مسائل حیض و نفاس میں غوطہ مارنا اور ہے اور عرفا کے کلام سے حقیقت

---

۱ یعنی خاندانی پنشن۔

۲ جلانا (بہ کسرہ جیم) بہ معنے زندہ کرنا، جان بخشنا، زندہ رکھنا اور (بہ فتح جیم) بہ معنے سوختہ کرنا۔ آگ لگانا۔ غالب نے یہاں یہ لفظ اس طرح استعمال کیا ہے کہ دونوں معنے اس سے نکالے جا سکتے ہیں۔ لیکن واضح معنے زندہ رکھنے کے ہیں۔

حقیقۂ وحدتِ وجود کو اپنے دِل نشین کرنا اور ہے۔ مشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب و ممکن میں مشترک جانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو مسیلمہ کو نبوت میں خاتم المرسلین کا شریک گردانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو نومسلموں کو ابوالائمہ کا ہمسر مانتے ہیں۔ دوزخ ان لوگوں کے واسطے ہے۔ میں موحدِ خالص اور مومنِ کامل ہوں۔ زبان سے لا الہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لاموجود الا اللہ، لاموثر فی الوجود الا اللہ سمجھے ہوا ہوں۔ انبیا سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الطاعت تھے۔ محمد علیہ السلام پر نبوّت ختم ہوئی۔ یہ خاتم المرسلین اور رحمۃ للعالمین ہیں۔ مقطع نبوت کا مطلع امامت، اور امامت نہ اجماعی، بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہے۔ ثم حسنؑ ثم حسینؑ، اسی طرح تا مہدی موعود علیہ السلام:

بریں زیستم ہم بریں بگذرم

ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت اور زندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں۔ اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہ ہوگا، بلکہ دوزخ کا ایندھن ہوں گا اور دوزخ کی آنچ کو تیز کروں گا، تاکہ مشرکین و منکرین نبوت مصطفوی و امامت مرتضوی اس میں جلیں۔ سنو، مولوی صاحب! اگر ہٹ دھرمی نہ کروگے اور کتمانِ حق کو گناہ جانوگے تو البتہ تم کو یاد ہوگا اور کہوگے کہ ہاں یاد ہے، جن روزوں میں تم علاؤالدین خاں کو "گلستاں" اور "بوستاں" پڑھاتے ہو اور تم نے ایک دن غریب کو دو تین تپانچے مارے ہیں، نواب امین الدین خاں ان دنوں میں لوہارو ہیں۔ علاؤ الدین خاں کی والدہ نے تم کو ڈیوڑھی پر سے اٹھا دیا۔ تم باچشمِ پُر آب میرے پاس آئے۔ میں نے تم سے کہا کہ بھائی شریف زادوں کو امیرزادوں کو چشم نمائی سے پڑھاتے ہیں، مارتے نہیں۔ تم نے بیجا کیا۔ آیندہ یہ حرکت نہ کرنا۔ تم نادم ہوئے۔ اب وہ مکتب نشینِ طفل سے گزر کر، پیر مغتاسالہ

۱؎ نواب علاؤالدین ۲؎ غالب

کے واعظ بنے - تم نے کئی فاقوں میں ایک شعر حافظ کا حفظ کیا ہے :- چوں پیر شدی حافظ الخ اور پھر پڑھتے ہو اس کے سامنے کہ اس کی نظم کا دفتر حافظ کے دیوان سے دو چند سہ چند ہے، مجموعۂ نثر جداگانہ اور یہ لحاظ بھی نہیں کرتے کہ ایک شعر حافظ کا یہ ہے اور ہزار شعر اس کے مخالف ہیں :-

صوفی بیا کہ آئینہ صاف است جام را — تا بنگری صفائے مئے لعل فام را
شراب ناب خور و روے مہ جبیناں بین — خلاف مذہب آناں جمال ایناں بین
ترسم کہ صرفہ نبرد روز باز خواست — نانِ حلال شیخ ز آبِ حرام ما
ساقی بگو وظیفۂ حافظ ز بادہ داد — کآشفتہ گشت طرۂ دستار مولوی[۵]

میاں میں بڑی مصیبت میں ہوں - محل سرا کی دیواریں گر گئی ہیں - پاخانہ ڈھ گیا - چھتیں ٹپک رہی ہیں - تمہاری پھوپی[۶] کہتی ہیں ہائے دبی، ہائے مری - دیوان خانہ کا حال محل سرا سے بدتر ہے - میں مرنے سے نہیں ڈرتا فقدانِ راحت سے گھبراتا ہوں - چھت چھلنی ہے - ابر دو گھنٹہ برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے - مالک اگر چاہے کہ مرمت کرے تو کیونکر کرے مینہ کھلے تو سب کچھ ہو اور پھر اثنائے مرمت میں، میں بیٹھا کس طرح رہوں؟ اگر تم سے ہو سکے تو برسات تک بھائی سے مجھ کو وہ حویلی جس میں میر حسن رہتے تھے، اپنی پھوپی کے رہنے کو اور کوٹھی میں سے وہ بالا خانہ مع دالان زیریں، جو الٰہی بخش خاں مرحوم کا مسکن تھا،

---

۵ اس مضمون سے ظاہر ہے کہ حمزہ خاں نے نواب علاؤ الدین خاں کے خط میں مرزا غالب کو لکھوایا ہوگا کہ اب بوڑھے ہو گئے ہو شراب چھوڑ دو - ساتھ حافظ کا یہ شعر درج کر دیا ہوگا

چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں شو
رندی و سیہ مستی در عہد شباب اولی

۶ غالب کی بیوی

میرے رہنے کو دلوا دو۔ برسات گزر جائے گی، مرمت ہو جائے گی۔ پھر صاحب اور بیم اور بابا لوگ[1] اپنے قدیم مسکن میں آرہیں گے۔ تمہارے والد کے ایثار و عطا کے جہاں مجھ پر احسان ہیں، ایک یہ مروت کا احسان میرے پایانِ عمر میں اور بھی سہی۔

صبح یک شنبہ - ۲۸ جولائی ۱۸۶۲ء غالب

(۲۳)

مولانا علائی -

نہ مجھے خوفِ مرگ، نہ دعوائے صبر ہے۔ میرا مذہب بخلاف عقیدہ قدریہ، جبر ہے۔ تم نے میانجی گری کی، بھائی نے برادر پروری کی۔ تم جیتے رہو، وہ سلامت رہیں، ہم اسی حویلی میں تا قیامت رہیں۔

اس ابہام کی توضیح اور اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مینہ کی شدت سے چھوٹا لڑکا[2] ڈرنے لگا۔ اس کی دادی[3] بھی گھبرائی۔ مجھ کو خلوت خانہ کا دروازہ غرب رویہ، اس کے آگے ایک چھوٹا سہ درہ یاد تھا۔ جب تمہارے پاؤں میں چوٹ لگی ہے، تو میں اسی دروازے سے تم کو دیکھنے آیا تھا۔ یہ سمجھ کر خلوت خانہ کو محل سرا بنایا چاہتا تھا کہ گاڑی، ڈولی، لونڈی، اصیل، کاچھن، تیلن، تنبولن، کہاری، پسنہاری، ان فرقوں کا ممرہ[4] دروازہ رہے گا۔ میری اور میرے بچوں کی آمد و رفت دیوان خانہ میں سے رہے گی۔ عیاذاً باللہ! وہ لوگ دیوان خانہ میں سے آئیں جائیں۔ اپنے بیگانے کو ہر وقت چھلپائیاں[5] نظر آئیں۔

---

[1] یعنی غالب، اُن کی بیگم اور بچے

[2] حسین علی [3] بیگم غالب [4] گزرگاہ۔ [5] چھلپائی چڑیل کو کہتے ہیں، اس لیے کہ عام خیال ہے کہ چڑیلوں کے پاؤں پیچھے کی طرف ہوتے ہیں۔

بی وفادار جن کو تم کچھ اور بھائی خوب جانتے ہیں، اب تمہاری پھوپی نے انھیں "وفادار بیگ" بنا دیا ہے - باہر نکلتی ہیں، سودا تو کیا لائیں گی، مگر خلیق اور ملنسار ہیں - رستہ چلتوں سے باتیں کرتی پھرتی ہیں - جب وہ محل سے نکلیں گی، ممکن نہیں کہ اطراف نہر کی سیر نہ کریں، ممکن نہیں کہ دروازے کے سپاہیوں سے باتیں نہ کریں - ممکن نہیں کہ پھول نہ توڑیں اور بی بی کو لیجا کر نہ دکھائیں اور نہ کہیں کہ "یہ پھول تمائے چچا کے بیٹے کی کائی کے ایں" (شرح: تمھارے چچا کے بیٹے کی کیاری کے ہیں) ہے ہے، ایسے عالی شان دیوان خانہ کی یہ قسمت اور مجھ سے نازک مزاج دیوانے کی یہ شامت! معہذا اس سہ دری کو اپنے آدمیوں کے اور لڑکوں کے مکتب کے لیے ہرگز کافی نہ جانا - مور اور کبوتر اور دنبہ اور بکری باہر گھوڑوں کے پاس رہ سکتے تھے؟ عرفت ربی بفسخ العزائم پڑھا اور چپ ہو رہا - مگر تمھاری خاطر عاطر جمع رہے کہ اسباب وحشت و خوف و خطر اب نہ رہے - مینہ کھل گیا ہے - مکان کے مالکوں کی طرف سے مدد شروع ہو گئی ہے - نہ لڑکا ڈرتا ہے، نہ بی بی گھبراتی ہے، نہ میں بے آرام ہوں - کھلا ہوا کوٹھا، چاندنی رات، ہوا سرد، تمام رات فلک پر مریخ پیش نظر، دو گھڑی کے تڑکے زہرہ جلوہ گر - ادھر چاند مغرب میں ڈوبا، ادھر مشرق سے زہرہ نکلی، صبوحی کا وہ لطف، روشنی کا وہ عالم -

۶ ماہ اگست ۱۸۶۲ء غالب

(۲۴)

جان غالب، مگر جسم سے نکلی ہوئی جان! قیامت کو دوبارہ ملنے کی توقع ہے، خدا کا احسان - مرزا قربان علی بیگ تمھاری کشش کے مجذوب کیوں بنتے؟ وہ تو خود سالک[1]

---

[1] سالک قربان علی بیگ کا تخلص تھا - اس کی رعایت سے مجذوب کا لفظ لائے - مراد یہ ہے کہ تمھاری کشش انھیں نہ کھینچ سکی - اس کا بھائی شمشاد علی بیگ رضوان پہنچ گیا -

ہیں - مگر ہاں یہ صاحبزادہ سعادت مند رضوان[1]، سو اس کے آپ مالک ہیں - نواب صاحب کا ہم مطبخ اور آپ کا ہم مائدہ ہونا بہتر ہوا ، کاش تم یہ لکھتے کہ مشاہرہ کیا مقرر ہوا[2]؟ اثنا عشری ایک تم ہو سو تمھیں کیا اختیار ہے ؟ البتہ عشرہ مبشرہ کی اولیت پر مدار ہے - باپ تمھارا خلاف قاعدہ اہل سنت جماعت ، عشرہ میں سے ثلثہ کو کم کرتا تھا[3] - رضوان نے نہ مانا - کیونکر مانتا ؟ وہ تو ثلثہ کا دم بھرتا تھا - تہور خاں صاحب کے باب میں بندہ جویا اس خبر کا ہے کہ اب لوہارو سے ان کا ارادہ کدھر کا ہے ؟

رضوان کو دعا پہنچے - نواب صاحب کی عنایات اور مولانا علائی کی صحبت مبارک ہو - بیر جی سے جب پوچھتا ہوں کہ "تم خوب ہو" اور وہ کہتے ہیں "کیا کہنا" اور میں پوچھتا ہوں "کس کا" تو وہ فرماتے ہیں : مرزا شمشاد علی بیگ کا " " اور کسی کا نام تم کیوں نہیں لیتے ؟ دیکھو یوسف علی خاں بیٹھے ہیں ، ہیرا سنگھ موجود ہے" "واہ صاحب ! میں کیا خوشامدی ہوں جو منہ دیکھی کہوں ؟ ہیرا سنگھ تو حفظ الغیب ہے - غیب کی تعریف کرنی کیا عیب ہے" - "ہاں صاحب آپ ایسے ہی وضعدار ہیں ، اس میں کیا ریب ہے"[4]۔

صبح سہ شنبہ - یکم ستمبر ۱۸۶۲ء غالب

(۲۵)

میاں ! تم میرے ساتھ وہ معاملے کرتے ہو جو احبار سے مرسوم و معمول[5]

---

[1] شمشاد علی بیگ رضوان

[2] یعنی کھانا تو تمھارے ساتھ کھانے لگا - لیکن تنخواہ کیا ٹھہرائی ؟

[3] مطلب یہ کہ علائی بارہ روپے تنخواہ دلانا چاہتے تھے ، پھر دس سے ابتدا کی تجویز کی ، لیکن امین الدین احمد خاں نے سات روپے سے شروع کرانا چاہی -

[4] یہ مکالمہ ہے اور میں نے کامے لگا کر اقوال الگ الگ کر دیے ہیں تا کہ مکالمے کے سمجھنے میں دقت نہ رہے -

[5] یعنی زندوں سے عمل میں آتے ہیں -

ہیں۔ خیر تمھارا حکم بجا لایا۔ غزل بعد اصلاح کے پہنچتی ہے۔ جناب نواب لفٹنٹ گورنر[1] بہادر نے دربار کیا۔ میری تعظیم و توقیر اور میرے حال پر لطف و عنایت میری ارزش و استحقاق سے زیادہ، بلکہ میری خواہش اور تصور سے سوا مبذول کی۔ اس ہجوم امراضِ جسمانی اور آلامِ روحانی کو اِن باتوں سے کیا ہوتا ہے، ہر دم۔ دمِ نزع ہے۔ دل غم سے خونریز ہو گیا ہے کہ کسی بات سے خوش نہیں ہو سکتا۔ مرگ کو نجات سمجھے ہوئے ہوں اور نجات کا طالب ہوں۔ کئی دن سے کوئی تحریر دل پذیر تمھاری نظر نہیں آئی۔ نہ مجھے تم نے یاد کیا، نہ اپنے بھائی کو کچھ لکھا۔ اب اس کا جواب جلدی لکھو۔ پہلے اپنے بچّوں کا حال، پھر وہاں کے اوضاع، جیسا تمھارا قاعدہ ہے، منقّح اور مفصّل لکھو۔

مارچ ۱۸۶۳ء نجات کا طالب غالب

(۲۶)

اقبال نشانا!

بخیر و عافیت و فتح و نصرت لوہارو پہنچنا مبارک ہو۔ مقصود ان سطور کی تحریر سے یہ ہے کہ مطبع "اکمل المطابع"[2] میں چند احباب میرے مسوداتِ اُردو کے جمع کرنے پر اور اس کے چھپوانے پر آمادہ ہوئے ہیں۔ مجھ سے مسودات مانگتے ہیں اور اطراف و جوانب سے بھی فراہم کئے ہیں۔ میں مسودہ نہیں رکھتا۔ جو لکھا وہ جہاں بھیجنا ہوا، وہاں بھیج دیا۔ یقین ہے کہ خط میرے تمھارے پاس بہت ہوں گے

---

[1] یعنی سر رابرٹ منٹگمری لفٹنٹ گورنر پنجاب کا دربار جو ۳۔ مارچ ۱۸۶۳ء کو دہلی میں منعقد ہوا تھا۔

[2] اکمل المطابع کے مالک حکیم غلام رضا خاں تھے۔ منشی بہاری لال مشتاق جو غالب کے عزیز شاگرد تھے۔ اس مطبع میں کام کرتے تھے۔ یہی اکمل الاخبار کے نام سے ایک اخبار بھی نکالتے تھے۔

اگر ان کا ایک پارسل بنا کر بسبیل ڈاک بھیج دو گے یا آج کل میں کوئی ادھر آنے والا ہو اور اس کو دو گے تو موجب میری خوشی کا ہوگا اور میں ایسا جانتا ہوں کہ اس کے چھاپے جانے سے تم بھی خوش ہو گے۔ بچوں کو دعا۔

سنہ ۱۸۶۳

غالب

(۲۷)

ولیعہدی میں شاہی ہو مبارک
عنایاتِ الٰہی ہو مبارک

اس امرِ فرخ و ہمایوں کی شہرت میں کوشش بے حوصلگی ہے اور اس کے اخفا میں مبالغہ خفقانیت۔ تم اپنی زبان پر نہ لاؤ، اگر کوئی اور کہے مانع نہ آؤ۔ نہ اشتہار نہ استتار۔[1]

دورہ ہوا اگر مدتِ معینہ کے بعد ہوا اور پھر جھاگ کا نہ آنا اور تمھارے پکارنے سے متنبہ ہو جانا مادے کی کمی کی علامتیں ہیں۔ شدت میں جس قدر خفت ہو غنیمت ہے۔

میرے خطوط اردو کے ارسال کے باب میں جو کچھ تم نے لکھا، تمھارے حسنِ طبع پر تم سے بعید تھا۔ میں سخت بے مزہ ہوا۔ اگر بے مزگی کے وجوہ لکھوں تو شاید ایک تختہ کاغذ کا سیاہ کرنا پڑے۔ اب ایک بات بوجزو مختصر لکھتا ہوں۔ سنو بھائی، اگر ان خطوط کا تم کو اخفا منظور ہے اور شہرت تمھارے منافیٔ طبع ہے تو ہرگز نہ بھیجو۔ قصہ تمام ہوا۔ اور اگر ان کے تلف ہونے کا اندیشہ ہے تو میرے دستخطی خطوط اپنے پاس رہنے دو اور کسی متصدی سے نقل اتروا کر، چاہو کسی کے ہاتھ، چاہو بسبیل پارسل ارسال کرو۔ لیکن خدا کے واسطے کہیں غصہ میں آ کر، عطائے تو بہ لقائے تو کہہ کر اصل خطوط نہ بھیج دینا کہ یہ امر میرے مخالف مقصود

۱؎ یعنی نہ اعلان کرانا مناسب ہے نہ چھپانا۔

ہے۔ بھلا صاحب، ڈرتا ہوں میں تم سے، ادھر خط پڑھا ادھر جواب لکھ کر ڈاک میں بھیجا۔ تمھارا خط رہنے دیا ہے۔ جب آکا شمشاد علی بیگ آئیں گے، پڑھ لیں گے۔

۱۸۶۳ء غالب

(۲۸)

لاموجود الا اللہ۔ اس خدا کی قسم جس کو میں نے ایسا مانا ہے اور اس کے سوا کسی کو موجود نہیں جانا ہے کہ خطوط کے ارسال کو مکرر نہ لکھنا از راہِ ملال نہ تھا۔ طالب کے ذوق کو سست پا کر میں متوقف ہو گیا۔ متوسط ایک جلیل القدر آدمی اور طالب کتب کا سوداگر ہے۔ اپنا نفع نقصان سوچے گا۔ لاگت بچت کو جانچے گا۔ میں متوسط کو مہتمم سمجھا تھا اور یہ خیال کیا تھا کہ یہ چھپوائے گا تیس رقعے ایک جگہ سے لے کر اُن کو بھیجے۔ اُس کی رسید میں تقریباً انھوں نے طلب رقعات بہ تکلف سوداگر لکھی اور اس سوداگر کو مفقود الخبر لکھا۔ ظاہرا کتابیں لے کر کہیں گیا ہوگا یا کتابیں لینے گیا ہوگا۔ یہ ۲۲ لفافے اور ۲۴ خط بدستور میرے بکس میں موجود و محفوظ رہیں گے۔ اگر متوسط بتقاضا طلب کرے گا، ان خطوط کی نقلیں اس کو اور اصل تم کو بھیج دوں گا ورنہ تمھارے بھیجے ہوئے کاغذ تم کو پہنچ جائیں گے۔

میاں ان خطوں کے ارسال میں تم نے مجھ سے وہ کیا جو میں نے تم سے ۱ وجانہ ہیں کیا تھا۔ بھلا میں تو پیر خرف ہوں اور سن خرافت کو نسیان لازم ہے، تم نے کیا سمجھ کے کپڑا لپیٹ کر اور مختم ۲ کر کے بھیجا؟ خطوں پر ایک قیس العرض کاغذ لپیٹ کر ارسال کیا ہوتا۔ اگر منشی بہاری لال میرا اور شہاب الدین کا دوست نہ ہوتا تو پچاس

---

۱ جو اس باختہ ۔ ۲ مہر لگا کر۔ پارسل کپڑے میں لپیٹ کر اور مہریں لگا کر بھیجنے پر جرمانہ ہوتا تھا لیکن چونکہ منشی بہاری لال غالب اور شہاب الدین احمد خاں کے دوست تھے اس لیے کوئی پرسش نہ ہوئی۔

روپے کا مجھ کو دھبا لگتا۔

رسیدہ بود بلائے و لے بخیر گذشت

غالب

صبح شنبہ۔ ۱۳ مئی ۱۸۶۳ء

(۲۹)

بد است مرگ و لے بد تر از گمان تو نیست

مکرر لکھ چکا ہوں کہ قصیدے کا مسودہ میں نے نہیں رکھا۔

مکرر لکھ چکا ہوں کہ مجھے یاد نہیں کون سی رباعیاں مانگتے ہو۔ پھر لکھتے ہو کہ رباعیاں بھیج، قصیدہ بھیج یعنی اس کے یہ کہ تو جھوٹا ہے۔ اب کے تو مقرر بھیجے گا۔ بھائی! قرآن کی قسم، انجیل کی قسم، توریت کی قسم، زبور کی قسم، ہنود کے چار بید کی قسم، دساتیر کی قسم، ژند[1] کی قسم، پاژند کی قسم، استا کی قسم، گورو کے گرنتھ کی قسم، نہ میرے پاس وہ قصیدہ، نہ مجھے وہ رباعیاں یاد۔ کلیات کے باب میں جو عرض کر چکا ہوں

بر ہمانیم کہ ہستیم و ہماں خواہد بود

جب میں دس پندرہ جلدیں منگا لوں گا، ایک بھائی کو اور ایک تم کو ارمغان بھیجوں گا۔ اور اگر بھائی کو جلدی ہے تو لکھنؤ میں اودھ اخبار کا مطبع کا مالک اس کا منشی نولکشور مشہور۔ جتنی جلدیں چاہیں لکھنؤ سے منگالیں۔ میں بہرحال دو جلدیں جس وقت موقع ہو گا، بھیج دوں گا۔

۱۱ر جون ۱۸۶۳ء نجات کا طالب غالب

(۳۰)

میری جان!

مرزا علی حسین خاں آئے اور مجھ سے ملے۔ میں نے خطوط مرسلہ تمھارے یکمشت ان کو دیے۔ اب تمھارے پاس بھیجنے کا ان کو اختیار ہے۔ رسید کا البتہ مجھے انتظار ہے

---

[1] ژند پارسیوں کی مذہبی کتاب اور پاژند اس کی تفسیر۔ استا بھی پارسیوں کی مذہبی کتاب ہے۔

علی حسین خاں سے آنے کی حقیقت اور یہاں اقامت کی مدت پوچھی گئی۔ جواب پایا کہ ایک مہینے دس دن کی رخصت لے کر آیا ہوں۔ بی بی بیمار ہے۔ اس کا استعلاج منظور ہے۔ میری جان علی حسین خاں کے کام آئے تو دریغ نہ کروں۔ بھلا یہ مبالغہ سہی بلکہ بے شک تبلیغ و غلو ہے، لیکن قریب قریب اس کے یعنی جو چیز امکان سے باہر نہ ہو۔ مگر سوچو کہ آئین غمخواری و اندوہ گساری کیا ہوگا۔ میرزا بدوضع و بدروش نہیں کہ بند و بند کا محتاج ہو۔ کوئی اس کا مقدمہ کسی محکمہ میں دائر نہیں کہ مصلحت و مشورت کی احتیاج ہو۔ رہے امور خانگی یعنی بی بی اور اس کے آبا و اخوان کے معاملے، ان میں نہ تم کو دخل، نہ مجھ کو مداخلت۔ تم علی حسین خاں کو اس بہینا پر کیا کیا چھیڑتے ہو اور یہ نہیں سمجھتے کہ اس کا دادا کتنا بڑا آدمی تھا اور اس کے دادا کی اور اس کی سسرال ایک ہے۔ یہ ذریعۂ فخر ہے اس کو اور اس کے طفیل سے تم کو۔ بلکہ تھوڑی سی نازش اگر مجھ ننگ اقربا کے حصہ میں بھی آجائے تو کچھ بعید نہیں۔

ہر چند تمہارا ہر کلمہ ایک بذلہ ہے لیکن اس "خسر" و "خسروانی" نے مار ڈالا۔ کیا کہوں جو مجھ کو مزا ملا ہے۔ کہاں "خسر" و "خسران" لغات عربی الاصل اور کہاں روزمرہ مشہور کہ خسر سسرے کو کہتے ہیں۔ صنعت اشتقاق و طباق کو کس سینہ زوری سے برتا ہے۔ اچھا میرا میاں، یہ خسر بمعنی پدر زن کیا لفظ ہے؟ حروف بین الفارسی و العربی مشترک ہیں، لیکن ان معنوں میں نہ فارسی ہے، نہ عربی ہے۔ فارسی میں پدر زن بہ فک اضافت کہتے ہیں۔ عربی میں جس طرح بمعنی نقصان لغت منصرف ہے۔ شاید سسرے کا اسم جامد بھی ہو یا فی الحقیقت سسرے کی تفریس و تعریب ہو۔ یہ پرسش نہ بہ سبیل استہزا ہے، بلکہ یوسف علی خاں عزیز مانند اس دہقان کے، کہ جو دانہ ڈال کر مینہ کا منتظر ہو اور ابر آئے اور نہ برسے، مضطر و حیران ہے۔ علی حسین خاں آتے ہیں، آئے۔ وہ آئے تو کیا لائے۔

غالب

یکشنبہ ۲۰ محرم ۱۲۸۰ھ مطابق ۲۱ جون ۱۸۶۳ء

(۳۱)

صاحب :

میں از کار رفتہ و درماندہ ہوں۔ آج تمھارے خط کا جواب لکھتا ہوں۔ لفظ "خسر" کے باب میں اتنی توضیح کیا ضرور تھی۔ میرا علم لغاتِ عربیہ کا محیط نہیں اور یہ بطریقِ حق الیقین جانتا ہوں کہ "خسر" لغاتِ فارسی نہیں۔ خُسُرے کی تفریس سے خسر پیدا ہوا ہو، کیا عجب ہے۔ تم سے اس کی تحقیق چاہی تھی کہ یہ لغت عربی الاصل نہ ہو، وہ معلوم ہوا کہ عربی نہیں، لغت ہندی ہے اور یہی تھا میرا عقیدہ۔

علی حسین خاں آئے دو تین بار مجھ سے مل گئے۔ اب نہ وہ آ سکتے ہیں، نہ میں جا سکتا ہوں۔ نصیب دشمناں وہ لنگڑے، میں لولا۔ ان کے پانو کا حال مفصل تم کو معلوم ہوگا۔ جونکیں لگیں، کیا ہوا، کہاں تک نوبت پہنچی۔ میری حقیقت سنو، مہینے بھر سے زیادہ کا عرصہ ہوا، بائیں پانو میں ورم کفِ پا سے پشتِ پا کو گھیرتا ہوا پنڈلی تک آماس۔ کھڑا ہوتا ہوں تو پنڈلی کی رگیں پھٹنے لگتی ہیں۔ خیر، اُٹھا۔ روٹی کھانے محلسرا نہ گیا، کھانا یہیں منگا لیا۔ پیشاب کو کیونکر اُٹھوں؟ حاجتی رکھ لی، بغیر اوکڑو بیٹھے بات نہیں بنتی۔ پاخانے کو اگرچہ دوسرے تیسرے دن جاؤں، مگر جاؤں تو سہی۔ یہ سب ہو چکے خیال میں لا کر سوچ لو کہ کیا گزرتی ہوگی۔ آغازِ فصل مزید علیہ یا مستزاد :

پیری و صد عیب چنیں گفتہ اند

اپنا یہ مصرع بار بار چپکے چپکے پڑھتا ہوں :

اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

مرگ اب ناگہانی کہاں رہی۔ اسباب و آثار سب فراہم ہیں۔ ہائے الٰہی بخش خاں مغفور کا کیا مصرع ہے :

آہ جی جاؤں نکل جائے اگر جان کہیں

زائد بے فائدہ -

جمعہ ۳ - جولائی سنہ ۱۸۶۳ء - مرگ کا طالب، غالب

(۳۲)

جانا عالیشانا !

پہلے خط اور پھر بتوسط برخوردار علی حسین خاں مجلد کلیات فارسی پہنچے - حیرت ہے کہ چار روپے قیمت کتاب اور چار آنے محصول ڈاک، قالب انطباع میں آکر پانچ روپے قیمت اور پانچ آنے محصول قرار پاوے خیر جہاں سو وہاں سوا سے - میرا حال تمھیں اور تمھارا حال مجھے معلوم ہے :

ایں ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر

اب کے چھٹے میں شاید نہ دے سکوں - نومبر سنہ حال میں پچاس تمھارے پاس پہنچ جائیں گے - انشاء اللہ العلی العظیم - میں بے حیا تھا نہ مرا، اچھا ہونے لگا - عوارض میں تخفیف ہے، طاقت آتی چلی ہے - مختصر مفید :

در نامہ جز ایں مصرع شاعر چہ نویسم
اے وائے ز محرومی دیدار دگر ہیچ

صبح یک شنبہ ۲ ستمبر سنہ ۱۸۶۳ء - نجات کا طالب، غالب

(۳۳)

اقبال نشان مرزا علاؤ الدین خاں بہادر کو غالب گوشہ نشین کی دعا پہنچے - برخوردار علی حسین خاں آیا، مجھ سے ملا - بھائی کا حال اس کی زبانی معلوم ہوا - حق تعالیٰ اپنا فضل کرے - الولد سر لابیہ، تم اس کے مصداق کیوں بنے؟ خفقان و مراق اگرچہ تمھارا خانہ زاد موروثی ہے، لیکن آج تک تمھاری خدمت میں حاضر نہ

ہوا تھا، اب کیوں آیا؟ اگر آیا تو ہرگز اس کو ٹھہرنے نہ دو، ہانک دو۔ خبردار اس کو اپنے پاس نہ رہنے دینا۔

شفیق مکرم و لطف مجسم منشی نولکشور صاحب بسبیل ڈاک یہاں آئے۔ مجھ سے اور تمھارے چچا اور تمھارے بھائی شہاب الدین خاں سے ملے۔ خالق نے ان کو زہرؔ کی صورت اور مشتری کی سیرت عطا کی ہے۔ گویا بجائے خود قران السعدین ہیں۔ تم سے میں نے کچھ نہ کہا تھا اور کلیات کے دس مجلد کی قیمت پچاس روپے مان لیے تھے۔ اب اُن سے جو ذکر آیا تو اُنھوں نے پہلی قیمت مشتہرۂ اخبار یعنی قبول کی یعنی تین روپے چار آنے فی جلد۔ اس صورت میں دس مجلد کے بتیس روپے آٹھ آنے میں اور بتیس روپے آٹھ آنے تم دو۔ ہمگی پینسٹھ روپے مطبع اودھ اخبار میں پہنچانے چاہئیں۔ میں دسمبر ماہ حال کی دسویں گیارھویں کو طالب ہوں گا۔ کہو بتیس روپے آٹھ آنے علی حسین خاں کو دے دوں، کہو لکھنؤ بھیج دوں۔ اس نگارش کا جواب جلدی لکھو۔

بھائی صاحب کی خدمت میں میرا سلام کہنا اور استاد میر جان کے میری طرف سے قدم لینا

۱۱۔ جمادی الثانی سال غفر (۱۲۸۰ھ) مطابق ۳۔ دسمبر سال: کیا غضب ہے ہے (۱۸۶۳ء) یہ گویا تاریخ وفات جناب نواب گورنر جنرل لارڈ الگن صاحب بہادر کی ہے۔

نجات کا طالب غالب

(۳۴)

مولانا علائی۔

واللہ علی حسین خاں کا بیان بمقتضائے محبت تھا۔ ہر بار کہتا تھا اور یہ کہتا تھا کہ حق بجانب ان کے ہے۔ نہ کوئی ہم سخن، نہ کوئی ہم نفس۔ نہ سیر، نہ شکار، نہ مجلس، نہ دربار۔ تنہائی و بے شغلی اور بس۔ جی کیوں کر نہ گھبرائے؟ خفقان کیوں کر نہ ہو جائے؟

نہ دِن یاد نہ تاریخ، آج چوتھا۔ یا بھی شاید بھول گیا ہوں، پانچواں دن ہے کہ منشی نولکشور بسواری ڈاک رہگرائے لکھنؤ ہوئے۔ کل پہنچ گئے ہوں یا آج پہنچ جائیں۔ آج روز یک شنبہ ۱۲ر دسمبر کی ہے۔ ایک دِن منشی صاحب میرے پاس بیٹھے تھے اور برخوردار شہاب الدین خاں بھی تھا۔ میں نے ثاقب کو مخاطب کر کے کہا، اگر میں دنیادار ہوتا، تو اس کو نوکری کہتا۔ مگر چونکہ فقیر تکیہ دار ہوں، تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ تین جگہ کا روزینہ دار ہوں۔ ساڑھے باسٹھ روپے ماہوار یعنی سات سو پچاس روپے سال سرکار انگریزی سے پاتا ہوں، بارہ سو روپے رام پور سے، چوبیس روپے سال ان مہاراج سے۔ توضیح یہ کہ دو برس سے ہر مہینے میں چار بار اخبار مجھ کو بھیجتے ہیں، قیمت نہیں لیتے، مگر ہاں، اڑتالیس ٹکٹ میں مطبع پہنچا دیا کرتا ہوں۔ بتیس روپے آٹھ آنے جو میں نے پوچھے مجھے کہ علی حسین خاں کے حوالے کروں مقصود اس سے یہ تھا کہ ارسال بسبیل ہنڈوی دشوار ہے۔ خیر، اب جس طرح ہوگا، حصار پہ ہنڈوی لکھوا کر تم کو بھیج دوں گا۔ تم حصار پہنچ کر روپے منگوا لیجیو خدا چاہے تو دسمبر میں روپیہ تمھارے پاس پہنچ جائے۔

استاد میر جان صاحب کو قدم بوس کہہ کر مجھ کو فرعون بننا پڑا۔ دہائی خدا کی اب ایسا نہ کروں گا۔ میرا سلام، بلکہ دُعا، ان کو کہہ دینا۔

پرسوں مولوی صدر الدین خاں صاحب کو فالج ہو گیا۔ سیدھا ہاتھ رہ گیا ہے۔ زبان موٹی ہو گئی ہے۔ بات مشکل سے کرتے ہیں اور کم سمجھ میں آتی ہے۔ میں اپاہج ہوں جا نہیں سکتا۔ جو ان کو دیکھ آتا ہے، اُس سے ان کا حال پوچھا جاتا ہے۔ دِن، تاریخ صدر میں لکھ آیا ہوں۔ کاتب کا نام غالب ہے کہ دستخط سے پہچان جاؤ۔[1]

یک شنبہ ۱۳ر دسمبر ۱۸۶۳ء

---

[1] اس فقرے کی ترتیب میں جو خوبی ہے وہ ظاہر ہے یعنی غالب بمعنی گمان قوی استعمال ہوا ہے لیکن ساتھ ہی نام بھی بتا دیا۔ تاریخ میں نے بہ نظر یکسانی ترتیب آخر میں رکھی ہے۔

(۳۵)

علائی! مولائی! کو غالب طالب کی دعا۔ بیچارے مرزا[۱] کا معاملہ علی حسین خاں کی معرفت طے ہو گیا۔ یہاں پندرہ کا سوال، وہاں دس میں سے تین کم کرنے کا خیال۔ متوسط دوسرا جو علی حسین خان بہادر کے بعد درمیان آئے، وہ کیا کرے اور کیا کہے؟ مرزا قانع و متوکل ہیں، نہ پندرہ مانگتے ہیں نہ دس۔ اللہ بس ماسوا ہوس[۲]۔ جناب ترولین[۳] صاحب، بھائی کے دوست، دلّی آئے۔ لارڈ صاحب کہلاتے ہیں۔ سنتا ہوں کہ کل اکبرآباد جاتے ہیں۔ بھائی علی بخش خاں مدت سے بیمار تھے، رات بارہ پر دو بجے مر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تمہارے عم نامدار آج دن کو بارہ بجے سلطان جی[۴] گئے ہیں، میں نہ جا سکا۔ تجہیز و تکفین ان کی طرف سے عمل میں آئے گی۔ بارہ پہ تین بجے یہ خط میں نے تمہیں لکھا ہے۔ کل شنبہ ۲۔ جنوری کو ڈاک گھر بھیج دوں گا۔ مشفقی شفیقی میر جان صاحب کو سلام مع الاکرام

یکم جنوری ۱۸۶۴ء نجات کا طالب، غالب

(۳۶)

میری جان۔ غالب کثیر المطالب کی کہانی سن۔ میں اگلے زمانے کا آدمی ہوں۔

۱۔ شمشاد علی بیگ رضوان

۲۔ یہ بحث خط ۲۴ میں بھی آ چکی ہے۔

۳۔ غالباً سر چارلس ٹریویلین CHARLES EDWARD TREVELYEN مراد ہے جو ۱۸۲۶ء میں ہندوستان آیا۔ کئی برس دہلی میں اسسٹنٹ کمشنر رہا۔ جنوری ۱۸۶۳ء میں سپریم کونسل میں مالیات کا ممبر بنا۔ اس نے لارڈ میکالے کی بہن سے شادی کی تھی۔

۴۔ غالب کے نسبتی بھائی تھے۔ حضرت شیخ نظام الدین کے مزار کے آس پاس کی جگہ کو سلطان جی کہتے ہیں۔

جہاں ایک امر کی ابتدا دیکھی، یہ جان لیا کہ اب یہ امر مطابق اس بدایت کے نہایت پذیرہ ہوگا - یہاں اختلاف طبائع کا وہ حال کہ آغاز منشوش، انجام مخدوش۔ مبتدا خبر سے بیگانہ، شرط جزا سے محروم - سُنا اور متواتر سُنا کہ قصہ طے ہو گیا، اب علاؤالدین خاں مع قبائل آئیں گے - دِل خوش ہوا کہ اپنے محبوب کی شکل مع اس کے نتائج[۱] کے دیکھوں گا - پرسوں آخر روز بھائی پاس گیا - اثنائے اختلاط و انبساط میں میں نے پوچھا کہ کہو بھئی علاؤالدین خاں کب آئیں گے ؟ جواب کچھ نہیں - "اجی وہ قصہ تو طے ہو گیا" ؟ "ہاں وہ تو روپیہ میں نے دے بھی دیا" میں نے کہا تو اب چاہیے کہ وہ آئیں - فرمایا کہ "شاید ابھی نہ آئے":

معلوم ہوا کہ خیر، ٹھینگا باجا

ناچار ارادہ کیا کہ جو کچھ کہنا تھا اب وہ لکھ کر بھیجوں - پرسوں تو شام ہو گئی تھی، کل بغلگیر ہونے والوں نے دم نہ لینے دیا - اس پر طرہ یہ کہ ثاقب نے کہا کہ بھائی تم سے شاکی ہیں - اب ضرور آ پڑا کہ گزارش مدعا سے پہلے تمھارے رفع ملال میں کلام کروں -

بھائی، تم میرے فرزند بلکہ بہ از فرزند ہو - اگر میرا صلبی بیٹا اس دید و دانست و تحریر و تقریر کا ہوتا، تو میں اس کو اپنا یار وفادار اور ذریعۂ افتخار جانتا - میرے خطوط کے نہ پہنچنے کا گلہ غلط - تمھارا کون سا خط آیا کہ اس کا جواب یہاں سے نہ لکھا گیا؟ میرے پاس جو مقاصد ضروری فراہم تھے، وہ میں نے اس نظر سے نہ لکھے کہ اب تم آتے ہو، زبانی گفت و شنید ہو جائے گی - ثاقب نے چلتی گاڑی میں روڑا اٹکا دیا، تب مجھے توطیہ و تمہید میں ایک ورق لکھنا پڑا، ورنہ آغاز نگارش یہاں سے نہ ہوتا -

---

[۱] یعنی مطابق اس آغاز کے انتہا کو پہنچے گا - [۲] یعنی بچے -

یا اسد اللہ الغالب:

با من از جہل معارض شدہ تا منفعلے
کہ گرش ہجو کنم ایں بودش مدحِ عظیم

یہ رسالہ موسوم "بہ محرق قاطع برہان" جو ثاقب نے تم کو بھیجا ہے، میرے کہنے سے بھیجا ہے اور اس ارسال سے میرا مدعا یہ ہے کہ اس کے معائنے کے وقت اس کتاب کی بے ربطی عبارت پر اور میری اپنی قرابت اور نسبت ہائے عدیدہ پہ نظر نہ کرو، بیگانہ وار دیکھو اور از روئے انصاف حَکَم بنو، بے حیف و میل۔

اس نے جو مجھے گالیاں دی ہیں، اس پر غصہ نہ کرو۔ غلطیاں عبارت کی۔ شدت اطناب مُمل کی صورت، سوال دیگر جواب دیگر، ان باتوں کو مطمحِ نظر کرو بلکہ اگر فرصت مساعدت کرے تو ان مراتب کو الگ ایک کاغذ پر لکھو اور بعد اتمام میرے پاس بھیج دو۔ میرا ایک دوست روحانی کہ وہ منجملہ رجال الغیب ہے۔ ان ہفوات کا خاکا اڑا رہا ہے۔ نیّرِ رخشاں نے اس کو مدد دی ہے۔ تم بھی، بھائی، مدد دو۔

اور وہ امر مبہم کہ جو تمھارے والد کی تقریر سے دل نشین نہیں ہوا، یعنی قصہ چک جانا اور دلّی آنا، اس کا ماجرا مفصّل و مشرّح لکھو۔

دن، تاریخ، اپنا نام، آغاز کتابت میں لکھ آیا ہوں۔ اب ارسال جواب کی تاکید کے سوا اور کیا لکھوں۔ فقط

چہار شنبہ۔ ۱۸ مئی ۱۸۶۴ء
بقول عوام باسی عید کا دن صبح کا وقت

(۳۷)

اے میری جان!

مثنوی "ابر گہر بار"[1] کون سی فکر تازہ تھی کہ میں تجھ کو بھیجتا؟ کلیات میں موجود ہے۔ معتمد اشہاب الدین خاں نے بھیج دی، میں مکرر کیا بھیجتا۔ "تیغ محرق"[2] کے دیکھنے سے انکار کیوں کرتے ہو؟ اگر منافی طبع تحریر کو بسبب انزجار[3]، نہ دیکھا کرتے تو فریقین کی کتب مبسوط کہاں سے موجود ہوتیں؟

"افسوس" کہ میں نے عربی جانا، عربی نہیں ہے اب مانا۔ یہ ایک سہو طبیعت تھا۔ میرا اعتراض تو غلط مبحث پر ہے۔ "افسوس" "فسوس" ایک کیوں ہو جاتے؟

یہاں کے اطوار مجھ سے باوجود قرب مخفی اور تم پر بانیہمہ بُعد آشکار۔ دُوران باخبر در حضور، و نزدیکان بے بصر دور۔ روپیہ آ گیا۔ دل سے نکلا، مخزن سے نکلا، ہاتھ سے نہیں نکلا۔ جب ہاتھ سے نکل جائے گا اور جنس مول لی جائے گی اور یہ گند کٹ جائے گا، تب ترسان ترسان پیشگاہ نادری میں تمہارے یہاں آنے کے باب میں کچھ عرض کیا جائے گا۔ میں ان دنوں مردہ دلی ہوں۔ والسلام۔

صبح دم با ابوالبشر گفتم ... "پارۂ زر بدہ کہ زر داری
حیف باشد کہ از چو من پسرے ... خاک رنگیں عزیز تر داری"
گفت "حیف است از تو خواہش زر ... کہ تو گنجینۂ گہر داری"

---

[1] غالب کی ایک نا تمام مثنوی جس میں غزوات نبوی کو نظم کرنا مقصود تھا۔ لیکن اس کے صرف مقدمات ہی مکمل ہوتے۔ یہ کلیات نظم فارسی میں چھپ چکی ہے۔ لیکن اس مثنوی کو ایک مرتبہ علیحدہ بھی چھاپا گیا تھا۔

[2] یعنی محرق قاطع مولفہ مولوی سعادت علی

[3] یعنی دیکھنے سے طبیعت کا گریز کرنا اور راضی نہ ہونا۔

گنج دانِ سخن حوالۂ تست | خود بہ بیں تا چہ اے پسر داری
پیش من زر کجاست جانِ پدر | بری ہر چہ در نظر داری"
گفتم "اینک بہ بند پیمانے | زر من مے دہی اگر داری
سرِ زنبیل آں عمرؔ و عیار | گر زعیارِ یش خبر داری
بکشا زود و زر بریز و بگوے | کہ ہمیں مدعا مگر داری"
گفت": بابا فسانہ بودہ است | چہ فرد ریزم و چہ بر داری ؟

دوشنبہ ۲۳ ذی الحجہ ۱۲۸۰ھ
مطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۴ء

(۳۸)

علائی مولائی غالب کو اپنا دعا گو اور خیر خواہ تصور کریں۔ مادۂ تاریخ کو نہ آپ قالب نظم میں لائیں اور نہ اور کو اس امر منکر کی تکلیف دیں۔ بھائی سمجھو یزید پر لعن منجملہ عبادت سہی لیکن کہہ دیتے ہیں کہ "بر یزید لعنت"۔ کسی مومن نے اس کی ہجو میں قصیدہ نہیں لکھا۔

ابداع مادہ ہائے تاریخ[1] تمہارے حسنات میں لکھا گیا۔ مثاب[2] تم ہو چکے، اجر پاؤ گے ان شاء اللہ۔ اب اپنے کو بدنام اور کسی کو ملول اور عداوت کو ظاہر اور اگر ظاہر ہو تو محکم نہ کرو۔

علی بخش خاں مرحوم مجھ سے چار برس چھوٹا تھا۔ میں ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوا ہوں اب کے رجب کے مہینے سے اونتروان برس شروع ہوتا ہے۔ اس نے ۶۶ برس کی عمر پائی۔ نئی تحریر و تقریر کا آدمی تھا۔ اکبر آباد میں میور[3] صاحب سے

---

[1] تاریخ کہنے کے مادے پیدا کرنا [2] مستحق ثواب۔

[3] سر ولیم میور SIR WILLIAM MUIR ۱۸۳۷ء میں سول سروس میں بھرتی ہو کر آیا۔ یوپی میں پہلے سکرٹری پھر بورڈ آف ریونیو کا ممبر اور آخر میں گورنر بنا۔

ملے۔ اثنائے مکالمت میں کہنے لگے کہ میں چچا جان[1] کے ساتھ جرنیل لارڈ لیک[2] صاحب کے لشکر میں موجود تھا اور ہولکر[3] سے جو محاربات ہوئے، اُن میں شامل رہا ہوں بے ادبی ہوتی ہے، ورنہ اگر قبا و پیرہن اتار کر دکھاؤں، تو سارا بدن ٹکڑے ٹکڑے ہے۔ جا بجا تلوار اور برچھی کے زخم ہیں۔

وہ ایک بیدار مغز اور دیدہ ور آدمی، ان کو[4] دیکھ دیکھ کر کہنے لگا کہ "اس صاحب، ہم ایسا جانتے ہیں کہ تم جرنیل صاحب کے وقت میں چار پانچ برس کے ہوگے۔ یہ سُن کر آپ نے کہا کہ درست، بجا ارشاد ہوتا ہے۔

خدا یش بیا مرزاد و بدیں دروغہائے بے نمک مگیراد

شنبہ - ۱۰ جولائی ۱۸۶۴ء غالبؔ

(۳۹)

اجی مولانا علائی۔

نواب صاحب دو مہینے تک کی اجازت دے چکے اور یہ ہیں خبر تو اشتی نہیں کرتا۔ مرزا علی محمد بیگ کی زبانی ہے کہ نواب علاؤالدین خاں سے کہہ چکے کہ قصہ مٹ گیا ہے، اب تم شوق سے دلی جاؤ۔ دو ہفتے سے لے کر دو مہینے تک کی تم کو رخصت ہے۔ پھر تم کیوں نہ آئے؟ خدا نے دعا، خداوند[5] نے استدعا قبول کی، تمہاری طرف سے سست قدمی اور دل سردی کی کیا وجہ؟ اگر حاکی[6]

ملے نواب احمد بخش خاں مرحوم والی فیروز پور جھرکا و لوہارو

ملے انگریز جرنیل جس نے ۱۸۰۳ء میں علی گڑھ، دہلی اور آگرے کو مرہٹوں سے چھینا تھا۔

ملے جسونت راؤ ہلکر جس نے ۱۸۰۵ء میں انگریزوں سے صلح کر کے اندور کی ریاست لے لی تھی۔

ملے یعنی علی بخش خاں کو

ملے نواب [illegible] الدین احمد خاں ملے حاکی - حکایت کرنے والا۔

کی حکایت جھوٹ ہے تو تم سچ لکھو کہ ماجرا کیا ہے۔

مرزا یوسف علی خاں عزیز تمھارے بلائے ہوئے اور مہدی حسین، بھائی صاحب کے مطلوب مرزا عبدالقادر بیگ کے قبائل کے ساتھ کل روانہ لوہارو ہوئے۔

شنبہ، ۱۷ ستمبر ۱۸۶۴ء نجات کا طالب، غالب

(۴۰)

مرزا علائی مولائی

نہ لاہور سے خط لکھا، نہ لوہارو سے۔ بقدر مادہ حمق محوِ انتظار، بلکہ امیدوار رہا۔ اب جو کسی طرح کی توقع نہ رہی تو شکوہ طرازی کا موقع ہاتھ آیا۔ اگرچہ جانتا ہوں کہ ایک شکوہ کے دفع میں "طوطی نامہ" برابر ایک رسالہ لکھوگے اور ہزار وجہیں موجہ بیان کروگے۔ ہاں اس تصور کا مزہ اٹھا رہا ہوں کہ دیکھوں کیا لکھتے ہو۔

دادی صاحبہ سے لکھوانا، پھوپی صاحبہ سے لکھوانا، غالب سے لکھوانا، بعد حصول اجازت نہ آنا۔ اس کے بھی کچھ معنی ہیں یا نہیں؟ اچھا میرا میاں، کچھ اس باب میں لکھ۔ چھڑی اور دو دو، ایک مندیل اور ایک سیلا یا کوئی اور چیز مبارک۔

بچوں کو میری دعا کہنا اور ان کی خیر و عافیت لکھنا۔ استاد میر جان صاحب کو سلام۔ مرزا تو جب ملے گا کہ تم دلی آؤ اور اپنی زبان سے لاہور کے ہنگامہ انجمن کا حال بیان کرو۔

چہار شنبہ۔ ۳ نومبر ۱۸۶۴ء نجات کا طالب غالب

(۴۱)

میری جان

تمھارا خط بھی آیا اور علی حسین خاں نجم الدین بھی تشریف لایا۔ اگر سرنوشت

آسمانی میں بھی اواخرِ رجب یا اوائلِ شعبان میں ہمارا تمہارا مِل بیٹھنا مندرج ہے، تو زبانی کہہ سُن لیں گے۔ قلم کو ان اسرار کی محرمیت نہیں ہے۔ جو شخص اپنے ملک و مال و جان و تن و ننگ و نام کے امور میں آشفتہ و سرگرداں بلکہ عاجز و حیراں ہو، وہ دوسرے کو اس سے کیا گلہ؟ ہائے نظیری:

با ما جفا و ناخوشی با خود غرور و سرکشی
از ما نہ از خود نہ آخر از آن کیستی؟

محلِ عقل و ہوش و دماغ سو تباہ۔ افیون کا مخمر ہو جانا علاوہ۔ اللہ جو چاہے سو کرے۔ ایسا پیارا باغ و بہار، بھائی یوں بگڑ جائے۔

۹۔ رجب ۱۲۸۱ھ۔ ۹۔ دسمبر ۱۸۶۴ء۔ نجات کا طالب غالبؔ

(۴۲)

لو صاحب، وہ مرزا رجب بیگ مرے۔ اُن کی تعزیت آپ نے نہ کی شعبان بیگ پیدا ہو گئے[1]۔ کل ان کی چھٹی ہو گئی۔ آپ شریک نہ ہوئے:

اے وائے ز محرومی دیدارِ دگر ہیچ

میاں، خدا جانے کس طرح یہ چار سطریں تجھ کو لکھی ہیں۔ شہاب الدین خاں کی بیماری نے میری زیست کا مزہ کھو دیا۔ میں کہتا ہوں کہ اس کے عوض میں مر جاؤں۔ اللہ اس کو جیتا رکھے۔ اس کا داغ مجھ کو نہ دکھاوے۔ یا رب اس کو صحت دے۔ یا رب اس کی عمر بڑھا دے! تین بچے۔ ایک اب پیدا ہونے والا ہے، یا رب اس کو اس کی اولاد کے سر پر سلامت رکھ۔

۷۔ شعبان ۱۲۸۱ھ۔ نجات کا طالب غالبؔ
۵۔ جنوری ۱۸۶۵ء۔

(۴۳)

میری جان! ناسازیِ روزگار و بے ربطیِ اطوار و بطریقِ داغ بالائے

---

[1] یعنی رجب ختم ہو گیا۔ شعبان کے مہینے کی چھٹی تاریخ ہے۔

داغ آرزوے دیدار - وہ وہ آتش شرارہ بار اور یہ ایک دریاے ناپیدا کنار۔ وقنا ربّنا عذاب النّار۔

خدا نے بھائی ضیاء الدین خاں کے بڑھاپے پر اور میری بیکسی پر رحم فرمایا۔ میرا شہاب الدین خاں بچ گیا - امراض مختلفہ میں گھر گیا تھا - بواسیر خونی، زحیرؔ، تپ، صداع، بارے اب من کل الوجوہ صحت حاصل ہے - ضعف جاتے ہی جائے گا۔ آگے کون قوی تھے کہ اب ان کو ضعیف کہا جائے؟ ایک بڈھا کسی گلی میں جاتے جاتے ٹھوکر کھا کر گر پڑا - کہنے لگا "ہاے بڑھاپا، اِدھر اُدھر دیکھا، جب جانا کہ کوئی نہیں ہے کہتا ہوا بڑھا کہ "جوانی میں کیا پتھر پڑتے تھے"۔ والسلام

جنوری ۱۸۶۵ء غالب مستہام

(۴۴)

میری جان!

نئے مہمان کا قدم تم پر مبارک ہو - اللہ تعالیٰ تمھاری اور اس کی اور اس کے بھائیوں کی عمر و دولت میں برکت دے - تمھاری طرز تحریر سے صاف نہیں معلوم ہوتا کہ سعید ہے یا سعیدہ[۲] ہے - ثاقب اس کو عزیز اور غالب عزیزہ جانتا ہے - واضح لکھو تا کہ احتمال رفع ہو - خط ثاقب کے نام کا، توبہ توبہ خط کاہے کو، ایک تختہ کاغذ کا، میں نے سراسر پڑھا - لطیفہ و بذلہ و شوخی و شوخ چشمی کا بیان جب کرتا کہ فحواے عبارت سے خون جگر نہ ہو جاتا - بھائی کا غم جدا، ایسا سخن گزار، ایسا زبان آور، ایسا عیّار طرار! یوں عاجز و درماندہ واژگار رفتہ ہو جائے! تمھارا غم جدا، ساغر اوّل و دُرد - کیا دل لے کر آئے، کیا زبان لے کر آئے - کیا علم لے کر آئے، کیا عقل لے کر آئے! اور پھر کسی روش کو برت نہ سکے - کسی شیوہ کی داد نہ

---

[۱] پیچش - [۲] یعنی لڑکا ہے یا لڑکی ہے۔

پائی۔ گویا نظیری تمہاری زبان سے کہتا ہے :

جوہرِ بینش من در تہ زنگار بماند آنکہ آئینۂ من ساخت نہ پرداخت دریغ

بھائی اس معرض میں، میں بھی تیرا ہم طالع اور ہم درد[1] ہوں۔ اگرچہ یک فنہ ہوں، مگر مجھے اپنے ایمان کی قسم، میں نے اپنی نظم و نثر کی داد باندازۂ بایست[2] پائی نہیں۔ آپ ہی کہا، آپ ہی سمجھا۔ قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے دواعی[3] میرے خالق نے مجھ میں بھر دیے ہیں، بقدر ہزار ایک، ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقتِ جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع سوت کی رسی کے لٹکا لوں اور پیادہ پا چل دوں۔ کبھی شیراز جا نکلا، کبھی مصر میں جا ٹھہرا، کبھی نجف میں جا پہنچا۔ نہ وہ دستگاہ[4] کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے تو نہ سہی، جس شہر میں رہوں اس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے[5]۔

نہ بستاں سرائے، نہ میخانۂ نہ دستاں سرائے، نہ جانانۂ
نہ رقص پری پیکراں بر بساط نہ غوغائے رامشگراں در رباط

خدا کا مقہور، خلق کا مردود، بوڑھا، ناتواں، بیمار، فقیر، نکبت میں گرفتار۔

---

[1] ہم درد سے مراد غمگسار نہیں بلکہ یہ کہ جو درد تمہیں ہے وہی مجھے ہے۔

[2] جیسی پانی چاہیے تھی

[3] جمع داعیہ یعنی ارادے، آرزوئیں۔

[4] قدرت

[5] منشی مہیش پرشاد نے یہاں آئے کی جگہ آؤں بنایا ہے۔ لیکن ترمیم کی مناسبت سمجھ میں نہ آئی عالم کے میزبان بننے سے صاف ظاہر ہے کہ غالب لوگوں کو کھلانا اور ضروریاتِ زندگی سے فارغ کرنا چاہتے تھے۔ خود بھوکا ننگا نظر نہ آؤں میں نہ داعیہ ایثار و کرم ہے نہ شانِ میزبانی۔ یہاں آئے ہی صحیح ہے۔

تمہارے حال میں غور کی اور چاہا کہ اس کا نظیر بہم پہنچاؤں۔ واقعۂ کربلا سے نسبت نہیں دے سکتا، لیکن واللہ تمہارا حال اس ریگستان میں عینہ ایسا ہے جیسا مسلم ابن عقیل کا حال کوفہ میں تھا۔ تمہارا خالق تمہاری اور تمہارے بچوں کی جان و آبرو کا نگہبان۔ میرے اور معاملات کلام و کمال سے قطع نظر کرو، وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود در بدر بھیک مانگے، وہ میں ہوں۔

نگاشتہ دوشنبہ شانزدہم از مہ صیام ۱۲۸۱ھ

یعنی ۱۳۔ فروری ۱۸۶۵ء

(۴۵)

صاحب۔

کل تمہارا خط پہنچا۔ آج اس کا جواب لکھ کر روانہ کرتا ہوں۔ رجب بیگ، شعبان بیگ، رمضان بیگ یہ نامور مہینے ہیں، سو خالی گئے۔ شوال بیگ آدمی کا نام نہیں سنا۔ ہاں عیدی بیگ ہو سکتا ہے۔ پس جب عید ہے اور روزِ سعید ہے تو کیا بعید ہے کہ بخلاف شہور ثلثہ ماضیہ اس مہینے میں تم آ سکو؟ ہے ہے، میں تو کہتا ہوں نہ آ سکو۔ اس ماہِ مبارک میں امضائے حکم سرکار کا وہ ہنگامہ گرم ہو کہ پارسیوں کی عید کوسہ برنشین[1] کا گمان گزرے۔ دور کیوں جاؤ۔ ہولی

---

[1] کوسہ برنشین۔ پارسیوں کا ایک جشن تھا جس کی کیفیت یہ ہے کہ ایک کوسہ (یعنی ایسے آدمی کو جس کی بڑی عمر تک داڑھی نہ نکلے) تلاش کر کے گدھے پر سوار کرتے۔ ایک ہاتھ میں پنکھا دوسرے میں کوڑا دے دیتے۔ اس کے بدن پر گرم دوائیں مل دیتے اور وہ ہائے ہائے گرمی کہتا اور پھر تیزی سے پنکھا جھلنے لگتا۔ امیر غریب سب اس کے گرد جمع رہتے۔ کوئی اس پر پانی ڈالتا۔ کوئی برف پھینکتا۔ جب وہ سردی کے مارے کانپنے لگتا تو کوڑا گھماتا۔ لوگ اس کی چوٹیں کھاتے اور ہنستے۔ جس دکان سے جو چیز چاہتا اٹھا لیتا بلکہ لوگ نذرانے لے کر دروازوں پر کھڑے رہتے

کی ڈھلینڈی[1] کا سماں لوہارو میں بندھ جائے۔ ایک خرسوار کی سواری بوری دم سے نکلے حسن اتفاق یہ کہ یہ وہی موسم ہے۔ ہولی اور عید کوسہ برنشین کا زمانہ باہم ہے۔ حوت کے آفتاب میں یہ دونوں تہوار ہوتے ہیں۔ کل آفتاب حوت میں آیا ہے کوسہ برنشین اور ہولی کا مژدہ لایا ہے۔ خیر میں چند روز اور ستمکش فراق اور تیرے دیدار کا مشتاق ہوں۔ تو کوسہ برنشین اور ہولی کی رنگ رلیاں منالے اور خرسوار ہو کر بضرب تازیانہ دوڑالے۔

علاؤالدین خاں واللہ تو میرا فرزند روحانی معنوی ہے۔ فرق اسی قدر ہے کہ میں جاہل ہوں اور تو مولوی ہے۔ ارے ظالم! اِس کوسہ برنشین کی داد دے عقل، کرامت ہے، الہام ہے، لطف طبع ہے، کیا ہے؟ یہ اسم کس قدر مناسب مقام ہے۔

صبیہ کا مقدم تم پر مبارک ہو۔ ثاقب مجھ سے لڑتا تھا کہ بھتیجا ہے۔ میں کہتا تھا کہ پوتی ہے۔ بارے میں جیتا اور ثاقب ہارا۔ عریضہ جداگانہ استاد میر جان صاحب کے نام پہنچتا ہے۔

غالب

پنجشنبہ ۲۶ رمضان سنہ ۱۲۸۱ھ
مطابق ۲۳- فروری سنہ ۱۸۶۵ء

(۴۶)

شکر ایزد کہ ترا با پدرت صلح فتاد	حوریاں رقص کناں ساغر شکرانہ زدند
قدسیاں بہر دعائے تو و والا پدرت	قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

میاں، تم جانتے ہو کہ میں عازم رام پور تھا۔ اسباب مساعد ہو گئے۔ لبشرط حیات جمعہ کو روانہ ہوں گا۔ لڑکے بالوں کی خیر و عافیت علی حسین خاں کی تحریر سے معلوم ہوتی رہتی ہے۔ میرا لکھنا زائد ہے۔ ایک بار میں صاحب کشنر کی عیادت کو گیا تھا۔ فرخ مرزا بھی میرے ساتھ گیا تھا۔ مزاج کی خبر پوچھ آیا۔ بھائی صاحب کو میرا سلام کہنا۔

یکشنبہ یکم اکتوبر سنہ ۱۸۶۵ء	راقم غالب علی شاہ

[1] ہولی کا دوسرا دن جس میں دھول اُڑائی جاتی ہے۔

(۴۷)

جاناعالیشانا -

خط پہنچا - حظ اُٹھایا - تمھاری آشفتہ حالی میں ہرگز شک نہیں - تم کہیں، قبائل کہیں - والیِ شہر ناسازگار، انجامِ کار ناپایدار، ایک دل اور سو آزار - اللہ تمھارا یاور، علی تمھارا مددگار - میں پا در رکاب، بلکہ نعل در آتش - کب جاؤں اور فرخ سیر کو دیکھوں - ایک خط میں نے علی حسین خاں کو لکھا - وہاں سے اس کا جواب آگیا - روہیلا پھوڑے پھنسی میں مبتلا ہے - خدا اس کو صحت دے - شمشاد علی بیگ کہاں الور پہنچا اور اس طرح گیا کہ شہاب الدین خاں سے مِل کر بھی نہ گیا - خیر

رموزِ مصلحتِ خویش خسرواں دانند

یہاں جشن[1] کے وہ سامان ہو رہے ہیں کہ جمشید اگر دیکھتا تو حیران رہ جاتا - شہر سے دو کوس کے فاصلہ پر آغا پور نامی ایک بستی ہے - آٹھ دس دن سے وہاں خیام برپا تھے - پرسوں صاحب کمشنر بہادر بریلی مع چند صاحبوں اور میموں کے آئے اور خیموں میں اترے - کچھ کم سو صاحب اور میم جمع ہوئے - سب سرکار رام پور کے مہمان - کل سہ شنبہ ۵ - دسمبر حضور پُرنور بڑے تجمل سے آغا پور تشریف لے گئے - بارہ پر دو بجے گئے اور شام خلعت پہن کر آئے - وزیر علی خاں خانساماں، خواصی میں سے روپیہ پھینکتا ہوا آتا تھا - دو کوس کے عرصے میں دو ہزار سے کم نہ نثار ہوا ہوگا - آج صاحبان عالی شان کی دعوت ہے - پٹن، شام کا کھانا ہیں کھائیں گے - روشنی، آتشبازی کی وہ افراط کہ رات دن کا سامنا کرے گی - طوائف کا وہ ہجوم، حکام کا وہ مجمع کہ بس مجلس کو طوائف الملوک کہا چاہیئے - کوئی کہتا ہے کہ صاحب کمشنر بہادر مع صاحبانِ عالی شان کے، کل جائیں گے، کوئی کہتا ہے پرسوں - رئیس[2] کی تصویر کھینچتا ہوں

---

[1] یہ خط رام پور سے لکھا گیا اور اس میں نواب کلب علی خاں کے جشنِ جانشینی کا ذکر ہے [2] نواب کلب علیخاں

قد، رنگ، شکل، شمائل بعینہ بھائی ضیاء الدین خاں۔ عمر کا فرق اور کچھ کچھ چہرہ اور لحیہ متفاوت۔ حلیم، خلیق، باذل، کریم، متواضع، متشرع، متورع، شعر فہم۔ سیکڑوں شعر یاد۔ نظم کی طرف توجہ نہیں، نثر لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ جلالا۔ طباطبائی کی طرز برتتے ہیں۔ شگفتہ جبیں ایسے کہ ان کے دیکھنے سے غم کوسوں بھاگ جائے۔ فصیح بیان ایسے کہ اُن کی تقریر سُن کر ایک اور نئی روح قالب میں آئے۔ اللّٰھم دام اقبالہ وزاد اجلالہ۔ بعد اختتام محافل طالب رخصت ہوں گا بعد حصول رخصت دلّی جاؤں گا۔ بھائی صاحب کی خدمت میں بشرط رسائی وتاب گویائی سلام کہنا اور بچوں کی خیر و عافیت جو تم کو معلوم ہوئی ہے، وہ مجھ کو لکھنا۔ ۶ر دسمبر ۱۸۶۵ء کی بدھ کا دن آٹھ بجا چاہتے ہیں۔ کاتب کا نام غالب ہے کہ تم جانتے ہوگے

(۶ر دسمبر ۱۸۶۵ء)

(۴۸)

مرزا۔

رو برو، بہ از پہلو آؤ میرے سامنے بیٹھو۔ آج صبح کے سات بجے باقر علی خاں اور حسین علی خاں مع چودہ مرغ چھ بڑے اور آٹھ چھوٹے کے، دلّی کو روانہ ہوئے۔ دو آدمی میرے اُن کے ساتھ گئے۔ کلو اور لڑکا نیاز علی یعنی ڈیڑھ آدمی میرے پاس ہیں۔ نواب صاحب نے بوقت رخصت ایک ایک دوشالہ مرحمت کیا۔ مرزا نعیم بیگ ابن مرزا کریم بیگ دو ہفتے سے یہاں وارد ہیں اور اپنی بہن کے ہاں ساکن ہیں۔ کہتے ہیں کہ تیرے ساتھ دلّی چلوں گا اور وہاں سے لوہارو جاؤں گا۔ میرے چلنے کا حال یہ ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ اسی ہفتہ میں چلوں گا۔

آپ چال چوکے، اُردو لکھتے لکھتے جو خط مشتمل ایک مطلب پر تھا، اس کو تم

عا۔ امین الدین احمد خاں۔

نے فارسی میں لکھا اور فارسی بھی متصدیانہ کہ امیر کو اور اپنے بزرگ کو کبھی بصیغۂ مفرد نہ لکھیں۔ یہ وہی "چھوٹی ہے" "بڑی ہے" کا قصہ ہے۔ خیر خط نہ دکھاؤں گا۔ ماکتب فیہ کہہ کر کام نکال لوں گا۔ میں نے تو چلتے وقت فرخ سیر کے اتالیق کی زبانی بھائی کو کہلا بھیجا تھا کہ تم اگر کوئی اپنا مدعا کہو تو میں اس کی درستی کرا لاؤں۔ جواب آیا کہ اور کچھ مدعا نہیں، صرف مکان کا مقدمہ ہے، سو اس مقدمہ میں میرا اور میرے شرکا کا کمیل وہاں موجود ہے۔ اگر وہ اس امر کا ذکر کرتے تو میں ان سے ان کے خالو علی اصغر خاں کے نام عرضی یا خط لکھوا لاتا۔ بہر حال اب بھی قاصر نہ رہوں گا۔ تاریخ اوپر لکھ آیا۔ نام اپنا بدل کر مغلوب رکھ لیا ہے

جمعہ ۲۲ دسمبر ۱۸۶۵ء

دو بجے تین کا عمل

(۴۹)

جانا جانا،

ایک میرا خط تمہارے دو خطوں کے جواب میں تم کو پہنچا ہوگا۔ آج میں علی اصغر خاں بہادر کے گھر گیا۔ اُن سے میں نے تذکرہ کیا۔ فرمایا کہ فرخ سیر کی ماں کو لکھ بھیجو کہ سال بھر کی تنخواہ کی رسید بھیج دیں، یہاں سے روپیہ بھیج دیا جائے گا۔ آج منگل ہے۔ ۷ شعبان کی اور ۲۶ دسمبر کی دو بھتیجے تمہارے جمعہ کے دن ۲۲ دسمبر کو دہلی پہنچے میں پرسوں یوم الخمیس کو مرحلہ پیما ہوں گا۔

اوّل ما آخر ہر منتہی (در اکرام و عزت) آخرِ ما جیب تمنا تہی (از مال و دولت)

تو کمان کرو ہم کیا کہ، فارسی گھسا دیا کہ۔ مجھ سے ہندی کی چندی سُن۔

ایک غلیل غفور نے دی ہی کی ہے، ایک علی اصغر خاں سے پہنچی۔ دونوں کل آئیں گی۔ مرزا نعیم بیگ ابن مرزا کریم بیگ دو تین ہفتہ سے یہاں وارد اور اپنی بہن کے ہاں ساکن ہیں۔ زاد کی خدا نے جیسی فقیر پر کی، راحلہ وہ جانیں۔

غالب

۷ شعبان ۱۲۸۲ھ - ۲۶ دسمبر ۱۸۶۵ء

(۵۰)

میاں،

چلتے وقت تمھارے چچا نے غلیل کی فرمائش کی تھی۔ رام پور پہنچ کر وہ بے سعی و تلاش ہاتھ آگئی۔ بنوا رکھی۔ لڑکوں نے، ملازموں نے، سب نے مجھ سے سُن لیا کہ یہ نواب ضیاء الدین خاں کے واسطے ہے۔ اب چلنے سے ایک ہفتہ پہلے تم نے غلیل مانگی۔ بھائی کیا بتاؤں کہ کتنی جستجو کی۔ بہم نہ پہنچی۔ دس روپے تک کو مول نہ ملی۔ نواب صاحب سے مانگی، توشہ خانہ میں بھی نہ تھی۔ ایک امیر کے ہاں پتہ لگا، دوڑا ہوا گیا۔ کھپچی موجود پائی۔ لیکن کیا کھپچی؛ جیسے نجف خاں کے عہد کے توڑیوں میں ہماری تمھاری ہڈی۔ بنوانے کی فرصت کہاں؟ آج لی، کل چل دیا۔ اس بانس کی قدر کرنا اور اس کو اچھی طرح بنوا لینا۔ بادشاہ فرخ سیر اور اس کے اخوان خوش و خرم ہیں۔ فرخ سیر کی ماں نے باجرے کا حلوہ سوہن کھلایا۔

شنبہ ۲۵ شعبان ۱۲۸۲ھ۔ نجات کا طالب غالب۔

مطابق ۱۳ جنوری ۱۸۶۶ء۔

(۵۱)

صاحب،

خط تمھارا پہنچا، مطالب دل نشین ہوئے۔ غوغائے خلق سے مجھ کو غرض نہیں۔ کیا اچھی رباعی ہے کسی کی

مومن بخیال خویش مستم داند کافر بگماں خدا پرستم داند

مردم ز غلط فہمیِ مردم مردم اے کاش کسے ہر آنچہ ہستم داند

؂ علی اصغر خاں جن کا ذکر پہلے خط میں ہے۔ لیکن کمان نہ ملی صرف کھپچی ملی۔ یعنی کمان بنانے کا بانس۔

بھائیوں[1] سے پھر نہیں ملا - بازار میں نکلتے ہوئے ڈر لگتا ہے - جواہر خبردار میرا سلام اخوین کو اور ان کا سلام مجھ کو پہنچا دیتا ہے - اسی کو غنیمت جانتا ہوں -

تاب لائے ہی بنے گی غالب واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

یہ مطلع اور مقطع مندرجہ دیوان ہے، مگر اس وقت یہ دونوں شعر حسب حال نظر آئے، اس واسطے لکھ دیے گئے - تم نے اشعار جدید مانگے، خاطر تمھاری عزیز - ایک مطلع اور دو مصرعے[2] آگے کے کہے ہوئے یاد آگئے کہ وہ داخل دیوان بھی نہیں - اُن پر فکر کر کے ایک مطلع اور پانچ شعر لکھ کر سات بیت کی ایک غزل تم کو بھیجتا ہوں - بھائی کیا کہوں کہ کس مصیبت سے یہ چھ بیتیں ہاتھ آئی ہیں اور وہ بھی بلند رتبہ نہیں :

بہت سہی غم گیتی شراب کم کیا ہے؟ غلام ساقی کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے؟

(۲ ۵)

سعادت و اقبال نشان مرزا علاؤالدین خاں بہادر کو فقیر اسد اللہ کی دعا پہنچے. کل شام کو مخدوم مکرم جناب آغا محمد حسین صاحب شیرازی، بسواری ریل، مانند دولت لخواہ، کہ ناگاہ آوے، فقیر کے تکیہ میں تشریف لائے، شب کو جناب ڈپٹی ولایت حسین خاں کے مکان میں آرام فرمایا - اب وہاں آتے ہیں - قریب طلوع آفتاب، بچشم نیم باز یہ رقعہ تمھارے نام لکھا ہے - جو کچھ جی چاہتا ہے وہ مفصل نہیں لکھ سکتا - مختصر مفید آغا صاحب کو دیکھ کر یوں سمجھنا کہ میرا بوڑھا چچا غالب جوان ہو کر میلے کی سیر کو حاضر ہوا ہے - بس نورچشمان راحت جان مرزا باقر علی خاں بہادر و مرزا حسین علی خاں بہادر

---

[1] بھائیوں سے مراد امین الدین احمد خاں اور ضیاءالدین احمد خاں ہیں -

[2] غالباً اس زمانے میں دونوں لوہارو گئے ہوئے تھے -

جناب آغا صاحب کا قدمبوس بجالائیں۔ ان کی خدمت گزاری کو اپنی سعادت اور میری خوشنودی سمجھیں بس۔

ہاں، مرزا علائی اگر کرنیل الگزنڈر اسکنر بہادر سے ملاقات ہو تو میرا سلام کہنا۔

غالب

(۵۳)

میاں،

مدعا اصلی ان سطور کی تحریر سے یہ ہے کہ اگر کل کمیٹی میں گئے ہو، تو میرے سوال کے پڑھے جانے کا حال لکھو۔ ضمناً ذکر ایک مدبر کا لکھا جاتا ہے۔ جو تم نے اس مدبر کے صفات لکھے، سب سچ ہیں۔ احمق، خبیث النفس، حاسد، طبیعت بُری، سمجھ بُری، قسمت بُری۔ ایک بار میں نے دکنی کی دشمنی میں گالیاں کھائیں، ایک بار بنارسی کی دوستی میں گالیاں کھاؤں گا۔ میں نے جو تمھیں اس کے باب میں لکھا تھا، وجہ اس کی یہ تھی کہ میں نے سُنا تھا کہ تم نے اپنے سائیسوں سے کہہ دیا ہے، یا کہا چاہتے ہو کہ اس کو بازار میں بے حرمت کریں۔ یہ خلاف شیوۂ مومنین ہے۔ خلاصہ یہ کہ یہ قصد نہ کرنا۔ یہ مؤید اس قول کا ہے جو میں نے تم سے پہلے کہا تھا کہ تم یوں تصوّر کرو کہ اس نام کا آدمی اس محلے میں، بلکہ اس شہر میں کوئی نہیں۔

غالب

(۵۴)

صاحب،

بہت دن سے تمھارا خط نہیں آیا۔ آپ کا وکیل بڑا چرب زبان ہے۔ مقدمہ اس نے جیت لیا۔ چنانچہ اُس کی تحریر سے تم کو معلوم ہوا ہوگا۔ سنتا ہوں کہ حمزہ خاں کو ان دنوں علّت مشائخ کا زور ہے اور سعدی کی اس بات پر

عمل کرتے ہیں:

کسانیکہ یزداں پرستی کنند | بآواز دولاب مستی کنند

خدا مبارک کرے۔ غالب

(۵۵)

میاں، تمہارے باپ کا تابع، تمہارا مطیع، فرخ مرزا کا فرمانبردار، مگر ابھی اٹھا ہوں۔ اپنے کو بھی نہیں سمجھا کہ میں کون ہوں۔ آج فرخ صاحب کے نام کا رقعہ پہنچ جائے گا۔ چھ جز تمہارے دیے ہوئے میر مہدی حسین صاحب کو دیئے اور باقی دن چڑھے اعیان مطبع جمع ہولیں تو وہ اوراق بھی منگا دوں۔ غالب

(۵۶)

اقبال نشان والاشان، صدرہ عزیز تر از جان، مرزا علاؤالدین خاں کو دعائے درویشانۂ غالب نوانہ پہنچے۔ سال نگارش تم کو یاد ہوگا۔ میں نے دبستان فارسی کا تم کو جانشین وخلیفہ قرار دے کر ایک سجل لکھ دیا ہے۔ اب جو چار کم استی برس کی عمر ہوئی[۱] اور جانا کہ میری زندگی برسوں کیا بلکہ مہینوں کی نہ رہی۔ شاید بارہ مہینے جس کو ایک برس کہتے ہیں اور جیوں، ورنہ دو چار مہینے پانچ سات ہفتے دس بیس دن کی بات رہ گئی ہے۔ اپنے ثبات حواس میں اپنے دستخط سے یہ توقیع تم کو لکھ دیتا ہوں کہ فن اردو میں نظماً و نثراً تم میرے جانشین ہو۔ چاہیے کہ میرے جاننے والے جیسا مجھ کو جانتے تھے، ویسا تم کو جانیں اور جس طرح مجھ کو مانتے تھے تم کو مانیں کُلُّ شَیءٍ هَالِكٌ اِلّا وجهه، ویبقیٰ وجه ربك ذوالجلال والاکرام

یکشنبہ سلخ صفر ۱۲۸۵ھ ۲۱ جون ۱۸۶۸ء من مقام دہلی[۲]

۱۔ ۱۲۸۵ھ میں غالب کی عمر ۷۳ برس کی تھی۔ معلوم نہیں اسے کس حساب سے ۷۶ برس بنا دیا۔ میرا خیال ہے اصل لفظ چار نہیں سات ہوگا۔ غلطی سے چار پڑھا گیا اور یہی رائج رہا۔

۲۔ گویا یہ سند وفات سے کم وبیش نو مہینے پہلے لکھی گئی۔

نواب ضیاء الدین احمد خاں صاحب بہادر

جناب قبلہ[1] و کعبہ -

آپ کو دیوان کے دینے میں تامل کیوں ہے؟ روز آپ کے مطالعہ میں نہیں رہتا - بغیر اس کے دیکھے آپ کو کھانا ہضم نہ ہوتا ہو، یہ بھی نہیں - پھر آپ کیوں نہیں دیتے؟ ایک جلد ہزار جلد بن جائے - میرا کلام شہرت پائے - میرا دل خوش ہو - تمھاری تعریف کا قصیدہ اہل عالم دیکھیں - تمھارے بھائی کی تعریف کی نثر سب کی نظر سے گزرے - اتنے فوائد کیا تھوڑے ہیں؟ رہا کتاب کے تلف ہونے کا اندیشہ، یہ خفقان ہے - کتاب کیوں تلف ہو گی؟ احیاناً اگر ایسا ہوا اور دلی لکھنو کی عرض راہ میں ڈاک لٹ گئی، تو میں فوراً بہ سبیل ڈاک رام پور جاؤں گا اور نواب فخر الدین خاں مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیوان تم کو لادوں گا - اگر یہ کہتے ہو کہ اب وہاں سے لے کر بھیج دو، وہ نہ کہیں گے کہ وہیں سے کیوں نہیں بھیجتے؟ ہاں یہ لکھوں کہ نواب ضیاء الدین خاں صاحب نہیں دیتے، تو کیا وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ جب وہ تمھارے بھائی اور تمھارے قریب ہو کر نہیں دیتے، تو میں اتنی دور سے کیوں دوں؟ اگر تم یہ کہتے ہو کہ تفضل سے لے کر بھیج دو، وہ اگر نہ دیں تو میں کیا کروں؟ اگر دیں تو میرے کس کام کا؟ پہلے تو ناتمام، پھر ناقص - بعض بعض قصائد اس میں سے اوروں کے نام کر دیئے گئے ہیں اور اس میں اسی ممدوح سابق کے نام پر ہیں - شہاب الدین خاں کا دیوان، جو یوسف مرزا لے گیا ہے، اس میں یہ دونوں قباحتیں موجود - تیسری یہ کہ سراسر غلط - ہر شعر غلط، ہر مصرع غلط - یہ کام تمھاری مدد کے بغیر انجام نہ پائے گا -

---

[1] ضیاء الدین احمد خاں عمر میں میرزا غالب سے چھوٹے تھے - لیکن انھیں قبلہ و کعبہ غالباً اس وجہ سے لکھا کہ صاحب امارت تھے - یہاں دیوان سے مراد فارسی کلیات نظم کا نسخہ ہے -

اور تمھارا کچھ نقصان نہیں۔ ہاں احتمالِ نقصان وہ بھی از روے وسوسہ و وہم، اس صورت میں میں تلافی کا کفیل، جیسا کہ اُوپر لکھ آیا ہوں۔ بہر حال راضی ہو جاؤ اور مجھ کو لکھو تو میں طالب کو اطلاع دوں اور طلب اُس کی جب دوبارہ ہو تو کتاب بھیج دوں۔

رحم و کرم کا طالب غالبؔ

مرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقبؔ

(۱)

بھائی۔

تمھارا خط حکیم محمود خاں صاحب کے آدمی کے ہاتھ پہنچا۔ خیر و عافیت معلوم ہوئی۔ انصاف کرو، کتاب کوئی سی ہو، اس کا پتہ کیوں کر لگے؟ لوٹ کا مال چوری چوری کونے کھتروں[۲] میں بک گیا اور اگر سڑک پر بھی بکا تو میں کہاں دیکھوں؟ صبر کرو اور چپ ہو رہو:

بر دل نفسِ اندہ گیتی بسر آید ‏ ‏ ‏ گبریدکہ گیتی ہمہ یکسر بسر آمد

آدمی تو آتے جاتے رہتے ہیں، خدا کرے یہاں کا حال سُن لیا کرتے ہو۔ اگر جیتے رہے اور ملنا نصیب ہُوا تو کہا جائے گا ورنہ قصہ مختصر قصہ تمام ہُوا۔ لکھتے ہُوئے ڈرتا ہوں اور وہ بھی کون سی خوشی کی بات ہے جو لکھوں؟ اپنے گھر میں اور اپنے بچّوں کو میری طرف سے دعا کہہ دینا اور زنم کو بھی تمھاری استانی دعا کہتی ہیں۔ زیادہ زیادہ۔

دوشنبہ ۸ / فروری ۱۸۵۸ء[۱] ‏ ‏ ‏ از غالبؔ

---

[۱] اس خط پر کوئی تاریخ ثبت نہیں۔ بظاہر ۱۸۶۰ء کا معلوم ہوتا ہے جب کلیاتِ نظم فارسی منشی نولکشور کے مطبع میں چھپوانے کا خیال آیا تھا۔

[۲] کھترا سوراخ کو کہتے ہیں اور یہ لفظ کونے کے ساتھ استعمال ہوتا ہے مطلب ہے چھپ چھپا کر فروخت ہو گیا۔

(۲)

بھائی شہاب الدین خاں واسطے خدا کے تم نے اور حکیم غلام نجف خاں نے میرے دیوان کا کیا حال کر دیا ہے۔ یہ اشعار جو تم نے بھیجے ہیں، خدا جانے کس ولد الزنا نے داخل کر دیے ہیں۔ دیوان تو چھاپے کا ہے۔ متن میں اگر یہ شعر ہوں تو میرے ہیں، اگر حاشیہ پر ہوں تو میرے نہیں ہیں۔ بالفرض اگر یہ شعر متن میں پائے بھی جائیں تو یوں سمجھنا کسی ملعون، زن جلب نے اصل کلام کو چھیل کر یہ خرافات لکھ دیئے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ جس مفسد کے یہ شعر ہیں اس کے باپ پر اور دادا پر لعنت اور وہ ہفتاد پشت تک ولد الحرام۔ اس کے سوا اور کیا لکھوں؟

ایک تو لڑکے میاں غلام نجف، دوسرے تم، میری کم بختی بڑھاپے میں آئی کہ میرا کلام تمھارے ہاتھ پڑا۔ بعد ان سطروں کے لکھنے کے تمھارا خط پہنچا۔ یہ دوسرا حادثہ مجھ کو پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا۔ قضا و قدر کے امور میں دم مارنے کی گنجایش نہیں ہے کہیں جاگیر پر جانے کی اجازت جلد ہو جائے[1] تاکہ سب یکجا باہم آرام سے رہو۔ اپنے کاتب سے کہہ دینا کہ یہ خرافات متن میں نہ لکھے، اگر لکھ دیے ہوں تو وہ ورق نکلوا ڈالنا، اور ورق اس کے بدلے لکھوا کر لگا دینا۔ مناسب تو یوں ہے کہ تم کسی آدمی کے ہاتھ وہ دیوان، جو تمھارے کاتب نے نقل کیا ہے، میرے پاس بھیج دو تاکہ میں ایک نظر اس کو دیکھ کر پھر تم کو بھیج دوں۔ زیادہ زیادہ۔ آج میرے پاس ٹکٹ ہے نہ دام؛ معاف رکھنا۔ والسلام[2]

غالب

۱۔ امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں غدر کے خاتمہ سے پہلے لوہارو روانہ ہو گئے تھے۔ مہرولی میں ان کا سامان لوٹا گیا۔ دہلی میں مکانوں کو آگ لگا دی گئی۔ دوجانہ پہنچے۔ وہاں پکڑے آئے اور خاصی دیر تک قلعہ میں رہے جب بے گناہ ثابت ہونے پر جولائی کے بعد ان کو جاگیر پر جانے کی اجازت ملی۔ اس خط میں اور اگلے خط میں ان کو جاگیر پر جانے کی اجازت مل جانے کی امید ظاہر کی گئی ہے۔

۲۔ اس خط پر تاریخ درج نہیں۔ منشی مہیش پرشاد نے مارچ ۱۸۵۸ء کا بتایا ہے۔ قرینہ یقیناً یہی ہے کہ یہ خط مکتوب ۱ کے بعد اور مکتوب ۳ سے پہلے لکھا گیا۔

(۳)

بھائی،

تمھارا خط پہنچا۔ کوئی مطلب جواب طلب نہیں تھا کہ میں اس کا جواب لکھتا۔ پھر سوچا کہ مبادا تم آزردہ ہو، اس واسطے آج یہ رقعہ تم کو لکھتا ہوں۔ میرا جی تو یہ چاہتا تھا کہ اب جو خط تمھیں لکھوں اس کے آغاز میں یہ لکھوں کہ مبارک ہو۔ تمھارے اب[1] و عم مع الخیر اپنی جاگیر کو روانہ ہو گئے۔ انشاء اللہ تعالیٰ اب کے جو خط تم کو لکھوں گا، اس کا مضمون یہی ہوگا خاطر جمع رکھنا۔ اور اگر میرا خط دو چار دن نہ پہنچے تو مجھ کو اسی مضمون کے ظہور کا منتظر سمجھنا اور گلہ نہ کرنا۔ اور ہاں صاحب، تم جو خط لکھتے ہو تو اس میں سعید[2] احمد خاں کا کچھ ذکر نہیں لکھتے۔ لازم ہے کہ اس کی خیر و عافیت اور اس کی بہن کی خیر و عافیت لکھتے رہا کرو۔ یہاں تمھاری پھوپی اور تمھارے دونوں بھتیجے اچھی طرح ہیں[3]۔ والدعا

یکشنبہ ۱۲ اپریل ۱۸۵۸ء از غالب

(۴)

تمھارے بھائی کا خط تمھارے پاس بھیجتا ہوں۔ کلیات[4] اُردو جو تم نے خریدے ہیں، ایک اس میں سے چاہو، اپنے چچا کی نذر کرو، چاہو بھائی کو تحفہ بھیجو۔ میں نے اس وقت اُن کے نام کا خط لوہارو کو روانہ کیا ہے۔ بعد ارسال خط مولوی سدید الدین خاں صاحب میرے ہاں آئے۔ اثنائے حرف و حکایت میں میں نے "شاہین" کی حقیقت پوچھی

---

[1] یعنی ضیاء الدین احمد خاں اور امین الدین احمد خاں۔

[2] سعید الدین احمد خاں طالب، برادر شہاب الدین احمد خاں ثاقب

[3] پھوپی سے مراد بیگم غالب اور بھتیجوں سے مراد باقر علی خان اور حسین علی خاں ہیں۔

[4] کلیات سے مراد اگر اردو کا وہ دیوان ہے جو دہلی کے مطبع احمدی میں چھپا تھا تو یہ خط ۱۸۶۱ء کے نصف آخر میں لکھا گیا اگر کان پور کے مطبع نظامی کا نسخہ مراد ہے تو پھر اسے ۱۸۶۲ء کا سمجھنا چاہیے۔

جواب دیا کہ ہاں عربی میں ایک باجے کا نام "شاہین" ہے۔ صورت اس کی پوچھی گئی، کہا کہ مجھے معلوم نہیں۔ صراح میں میں نے دیکھا ہے۔ فقط۔ تم جو مولانا علائی کو خط لکھو، یہ رقعہ ملفوف کر دو۔

غالب

(۵)

نورِ چشم شہاب الدین خاں کو دعا کے بعد معلوم ہو یہ جو رقعہ لے کر پہنچے ہیں۔ ان کا نام حسن علی ہے اور یہ سید ہیں۔ دواسازی میں یگانہ، رکاب داری میں یکتا۔ جان محمد ان کا باپ ملازم سرکار شاہی تھا۔ اب ان کا چچا میر فتح علی پندرہ روپے مہینے کا الور میں نوکر ہے۔ بہرحال ان سے کہا گیا کہ پانچ روپیہ مہینہ ملے گا اور لوہارو جانا ہو گا۔ انکار کیا کہ پانچ روپیہ میں میں کیا کھاؤں گا، یہاں زن و فرزند کو کیا بھجواؤں گا؟ جواب دیا گیا کہ سرکار بڑی ہے، اگر کام تمہارا پسند آئے گا تو اضافہ ہو جائے گا۔ اب وہ کہتا ہے کہ خیر، توقع پر یہ قلیل مشاہرہ قبول کرتا ہوں، مگر دونوں وقت روٹی سرکار سے پاؤں، بغیر اس کے کسی طرح نہیں جا سکتا۔

سنو میاں، حق بجانب اس غریب کے ہے۔ روٹی بغیر بات نہیں بنتی۔ یقین ہے تم رپورٹ کرو گے تو اس امر کی منظوری کا حکم آ جائے گا۔ یہ قصہ فیصل ہوا۔ اب یہ کہتا ہے کہ دو ماہ مجھے پیشگی دو تاکہ کچھ کپڑا لتا بناؤں اور کچھ گھر میں دے جاؤں راہ میں روٹی اور سواری سرکار سے پاؤں، تو یہاں بھی حق بجانب سائل کے جانتا ہوں، مگر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ خیر تم یہی میرا رقعہ اپنے نام کا علائی مولائی کو بھیج دو۔

سہ شنبہ۔ ۲۴ ستمبر ۱۸۶۱ء

غالب

(۶)

میاں،

وہ قاضی تو مسخرہ ہے۔ اُن کا خط دیکھ لیا۔ خیر، ہاں علاء الدین خاں کا خط

گھنٹہ بھر بھانڈ کے طائفے کا تماشہ ہے۔ اب تم کہو استاد میر جان کو کیوں کہ بھیجو گے: اُن کو کہاں پاؤ گے اور علاؤ الدین خاں نے حسب الحکم تمھارے چچا کے لکھا ہے کہ لوہارو کی سواریاں آئی ہوئی شاید کل پرسوں جائیں۔ اس کی فکر آج کو، امین الدین خاں بیچارہ اکیلا گھبراتا ہوگا۔

"چکیدن دہیم"۔ "رمیدن دہیم" یہ غزل علاؤ الدین کو بھیج چکا ہوں۔ تم علاؤ الدین خاں کو لکھو کہ بڑے شرم کی بات ہے:

"ہر دم آزردگی غیر سبب را چہ علاج"

اس غزل کو حافظ کی غزل سمجھتے ہو۔ واہ وا! "غیر سبب" یہ کہاں کی بولی ہے

"از خواندن قراں تو قاری چہ فائدہ"

عیاذاً باللہ امیر خسرو "قرآن" کو، کہ بسکون رائے قرشت والف ممدودہ ہے، "قراں" بروزن "پراں" لکھیں گے۔ یہ دونوں غزلیں دو گدھوں کی ہیں۔ شاید ایک نے مقطع میں حافظ اور ایک نے مقطع میں خسرو لکھ دیا ہو۔

(۷)

مرزا میاں شہاب الدین خاں اچھی طرح رہو۔ غازی آباد کا حال شمشاد علی سے سُنا ہوگا۔ ہفتے کے دن دو تین گھڑی دن چڑھے احباب کو رخصت کر کے راہی ہُوا۔ قصد یہ تھا کہ پلکھوے رہوں، وہاں قافلے کی گنجایش نہ پائی۔ ہاپوڑ کو روانہ ہوا۔ دونوں برخوردار[1] گھوڑوں پہ سوار پہلے چل دیئے۔ چار گھڑی دن رہے میں ہاپوڑ کی سرائے میں پہنچا۔ دونوں بھائیوں کو بیٹھے ہوئے اور گھوڑوں کو ٹہلتے ہوئے پایا۔ گھڑی بھر دن رہے قافلہ آیا۔ میں نے چھٹانک بھر گھی داغ کیا۔ دو شامی کباب اس میں ڈال دیے۔ رات ہوگئی تھی۔ شراب پی لی۔ کباب کھائے

---

[1] باقر علی خاں اور حسین علی خاں

لڑکوں نے ارہر کی کھچڑی پکوائی۔ خوب گھی ڈال کر آپ بھی کھائی اور سب آدمیوں کو بھی کھلائی۔ دن کے واسطے سادہ سالن پکوایا، ترکاری نہ ڈلوائی۔ بارے آج تک دونوں بھائیوں میں موافقت ہے۔ آپس کی صلح و مشورت سے کام کرتے ہیں۔ اتنی بات زائد ہے کہ حسین علی منزل پہ اُتر کر پاپڑ اور مٹھائی کے کھلونے خرید لاتا ہے، دونوں بھائی مل کر کھا لیتے ہیں۔ آج میں نے تمھارے والد کی نصیحت پر عمل کیا۔ چار بجے پانچ کے عمل میں ہاپوڑ سے چل دیا۔ سورج نکلے بابوگڈھ کی سرائے میں آ پہنچا۔ چارپائی بچھائی، اس پہ بچھونا بچھا کر حقّہ پی رہا ہوں اور یہ خط لکھ رہا ہوں۔ دونوں گھوڑے کوتل آ گئے۔ دونوں لڑکے رتھ میں سوار آتے ہیں اب وہ آئے اور کھانا کھا لیا اور چلے۔ تم اپنی استانی کے پاس جا کر یہ رقعہ سراسر پڑھ کر سنا دینا۔ شمشاد کو کتاب کے مقابلے اور تصحیح کی تاکید کر دینا[۱]۔

(۸)

رقعہ کا جواب کیوں نہ بھیجا تم نے ثاقب حرکت یہ کی ہے بیجا تم نے
حاجی کلّو کو دے کے بے وجہ جواب غالب کا پکا دیا کلیجا تم نے

(۹)

اے روشنیٔ دیدہ شہاب الدین خاں
کٹتا ہے بتاؤ کس طرح سے رمضان
ہوتی ہے تراویح سے فرصت کب تک
سنتے ہو تراویح میں کتنا قرآن

---

[۱] یعنی شمشاد علی بیگ رضوان کو تاکید کر دینا کہ قاطع برہان کا مقابلہ اور تصحیح کرتا رہے۔

میرزا امیرالدین احمد خاں فرخ مرزا

اے مردم چشم جہاں بین غالب!

پہلے القاب کے معنے سمجھ لو۔ یعنی چشم جہاں بین غالب کی پتلی۔ چشم جہاں بین تمھارا باپ علاؤالدین احمد خاں بہادر اور پتلی آج میں نے تمہارا خط دیکھا۔ مجھ کو بہت پسند آیا۔ استاد کامل نہ ہونے کے باوصف تم نے یہ کمال حاصل کیا۔ آفریں صد آفریں! میں اپنے اور تمھارے پروردگار سے، کہ وہ رب العالمین ہے، یہ دعا مانگتا ہوں کہ تم کو زیادہ نہیں تو تمھارے باپ کے برابر علم و فضل اور تمھارے پردادا حضرت فخرالدولہ نواب احمد بخش خاں بہادر جنت آرامگاہ کے برابر جاہ و جلال عنایت کرے۔ میاں، تمھارے دادا نواب امین الدین خاں بہادر ہیں، میں تو تمھارا ولدادہ ہوں۔ خبردار ہر جمعہ کو اپنی صورت مجھے دکھا جایا کرو۔ والدعا

مرزا قربان علی بیگ خاں صاحب سالک

(۱)

میری جان، کن اوہام میں گرفتار ہے؟ جہاں باپ کو پیٹ چکا، اب چچا کو

---

(۱) یہ خط اس زمانے میں لکھا گیا، جب دہلی میں مرزا غالب کے خطوط چھپ رہے تھے۔ نواب امیرالدین احمد خاں مرحوم نے خود ایک مرتبہ راقم الحروف سے بیان کیا کہ خطوں کے چھپنے کا شہرہ سنا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ خاندان کے سب لوگوں کے نام خط ہیں تو میں نے بھی مرزا صاحب سے عرض کیا کہ دادا جان! ہمارے نام بھی ایک خط لکھ دو۔ اس موقع پر میرزا نے فرمایا کہ دادا تمھارے امین الدین احمد خاں ہیں۔ میں تو تمھارا "ولدادہ" ہوں۔ یہ فقرہ خط میں بھی لکھ دیا۔ یہ غالباً ۱۸۶۸ء کا واقعہ ہے۔ یہ خط اس کے لکھنے کے دن یا ایک آدھ دن بعد لکھا گیا ہوگا۔

کو بھی رو۔ تجھ کو خدا جیتا رکھے اور تیرے خیالات و احتمالات کو صورت وقوعی دے۔ یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں، مخلوق کا کیا ذکر؟ کچھ بن نہیں آتی۔ اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلّت سے خوش ہوتا ہوں۔ یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصوّر کیا ہے۔ جو دُکھ مجھے پہنچتا ہے، کہتا ہوں: لو غالب کے ایک اور جوتی لگی، بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی دان ہوں۔ آج دُور دُور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب تو قرضداروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے، غالب کیا مرا، برا ملحد مرا، بڑا کافر مرا، ہم نے ازراہِ تعظیم، جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے "جنّت آرامگاہ" و "عرش نشین" خطاب دیتے ہیں، چونکہ یہ اپنے کو شاہ قلمروِ سخن جانتا تھا، "سقر مقر" اور "ہاویہ زاویہ"[1] خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ "آیئے نجم الدولہ بہادر"[2] ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرضدار بھوگ سُنا رہا ہے۔ میں اُن سے پوچھ رہا ہوں "اجی حضرت نواب صاحب۔ نواب صاحب کیسے! اوغلان صاحب[3]، آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں، یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے؟ کچھ تو اُکسو، کچھ تو بولو" بولے کیا بے حیا بے غیرت، کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لیے جاتا تھا، یہ بھی سوچا ہوتا کہاں سے دوں گا۔

---

[1] یعنی دوزخ اس کی جائے قرار ہو، ہاویہ اس کا زاویہ بنے۔

[2] میرزا غالب کو شاہی دربار سے نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ خطاب ملا تھا۔ نجم الدولہ ان کے خطاب کا ایک جزو تھا۔

[3] ترکی زبان میں خطاب کے لیے احترام کا لفظ، جیسے ہمارے ہاں جناب ہے۔

(۲)

وللہ ممن الطاف خفیہ[1]۔ خیر و عافیت تمہاری معلوم ہوئی۔ دم غنیمت ہے جان ہے تو جہان ہے۔ کہتے ہیں کہ خدا سے نا اُمیدی کفر ہے۔ میں تو اپنے باب میں خدا سے نا اُمید ہو کر کافر مطلق ہو گیا ہوں۔ موافق عقیدۂ اہل اسلام جب کافر ہو گیا۔ تو مغفرت کی بھی توقع نہ رہی۔ چل بھئی۔ نہ دُنیا، نہ دین۔ مگر تم حتی الوسع مسلمان بنے رہو اور خدا سے نا امید نہ ہو۔ انّ مع العسر یُسرا[2] کو اپنا نصب العین رکھو:

در طریقت ہر چہ پیش سالک آید خیر اوست

گھر میں تمہارے سب طرح خیر و عافیت ہے۔ محمد میرزا پنجشنبہ اور جمعہ کو داستان کے وقت آ جاتا ہے۔ رضوان ہر روز شب کو آتا ہے۔ یوسف علی خاں عزیز سلام اور باقر اور حسین علی بندگی کہتے ہیں۔ کلو وارو غہ کورنش عرض کرتا ہے۔ اوروں کو یہ پایہ حاصل نہیں کہ وہ کورنش بھی بجا لائیں۔ خط بھیجتے رہا کرو۔ والدعا

صبح دو شنبہ ۶ صفر سال حال (۱۲۸۱) اپنی مرگ کا طالب غالب
۱۱ر جولائی ۱۸۶۴ء

بنام مرزا شمشاد علی بیگ خاں صاحب رضواں

(۱)

فرزند دلبند شمشاد علی بیگ خاں کو، اگر خفا نہ ہوں تو، دعا، اگر آزردہ ہوں، تو بندگی۔ غازی آباد سے جا کر طبع اقدس ناساز ہو گئی ؛ از آمدن کعبہ پشیماں شدہ باشی۔

قربان علی بیگ خاں کو دعا کہنا اور ان کا حال لکھنا

آج شنبہ ۴۔ نومبر کی ہے۔ پرسوں نواب صاحب دورے کو گئے۔ فرما گئے

---

[1] خدا پوشیدہ مہربانیاں کرتا ہے۔

[2] قرآن کی آیت کا ٹکڑا ہے جس کے معنی ہیں کہ تنگی کے ساتھ کشایش بھی ہے۔

ہیں کہ دو ہفتے میں آؤں گا۔ آکر چار روز یہاں رہیں گے، پھر نمایش گاہ بریلی کی سیر کو جائیں گے، وہاں سے پھر کر جب آئیں گے تو صاحب کمشنر بریلی کا انتظار فرمائیں گے۔ وہ پنجم دسمبر تک آجائیں گے۔ تین دن تک جشن رہے گا۔ اس کے دو چار روز بعد غالب رخصت ہوگا۔ خدا کرے تم تک زندہ پہنچ جائے۔ پیرجی بہت یاد آتے ہیں۔ ان کو دعا کہنا اور یہ کاغذ پہلے تم پڑھنا، پھر لک کو پڑھانا۔ پھر میاں خواجہ امان اور حکیم رضا خان کو دکھانا۔ پھر مرزا تفضل حسین خاں کے پاس لے جانا۔ اس قصیدے کے ساتھ کی نثر نواب ضیاء الدین خاں یا مرزا ثاقب سے مانگ لینا اور اس کی نقل کر لینا اور "قاطع برہان" کا حال لکھنا۔ میں نے تیس روپے کی ہنڈوی، سو روپے کی باقی حکیم جی کو بھیج دی ہے۔ حضرت نے رسید بھی نہیں لکھی۔ اُن سے رسید لکھوا بھیجو اور سب جلدوں کے شیرازے بندھ جائیں اور موٹا کاغذ دونوں طرف لگ جائے۔ خبردار کوئی نسخہ بے جلد نہ رہے۔ تین سو مجلد کے تیار ہونے کی خبر اور بقیہ حساب میرے پاس بھیج دینا یا روپیہ فوراً بھیج دوں گا یا آکر دوں گا۔

گورنر کا حال لکھو، کون کون حاضر ہوا، کس کس کی ملاقات ہوئی؟ فرخ سیر کے داوا صاحب آئے یا نہیں؟ اگر آئے ہیں تو روداد مفصل لکھو۔ ہاں بھائی صاحب ٹونک والے سید سراج احمد کا بھی حال ضرور لکھنا۔ علی نقی خاں وزیر شاہ اودھ کی حقیقت بھی ضرور لکھنا اور مجھ کو ان مقاصد کے جواب کا منتظر سمجھنا۔ آج دوشنبہ ۴ نومبر کی ہے۔ آٹھ دن میں خط کی آمد و شد یقینی ہے۔ نو دن راہ دیکھوں گا، دسویں دن اگر تمھارا خط نہ آیا تو میں رافضی بن جاؤں گا۔ مطالب مندرجہ کے جواب کا طالب غالب

۴ نومبر ۱۸۶۵ء

۱؎ امین الدین احمد خاں والئے لوہارو۔

۲؎ یعنی تم کو چھوڑ دوں گا، کنارہ کش ہو جاؤں گا۔

(۲)

مرزا! ہم تحریرِ خطوط بسبب ضعف ترک ہوتی جاتی ہیں۔ تحریر کا تارک نہیں ہوں بلکہ متروک ہوں[1]۔ اب مجھے ویسا نہ سمجھو، جیسا چھوڑ گئے ہو۔ رام پور کے سفر میں تاب و طاقت، حسنِ تکلم، لطفِ طبیعت، یہ سب اسباب لٹ گیا۔ اگر تمھارے خط کا جواب نہ لکھوں تو محلِ ترحم ہے، نہ مقامِ شکایت۔ سنو، میرے خط نہ پہنچنے سے تم کو تشویش کیوں ہو؟ جب تک زندہ ہوں، غمزدہ و افسردہ، ناتوان و نیم جاں ہوں۔ جب مر جاؤں گا تو میرے مرنے کی خبر سن لوگے پس جب تک میرے مرنے کی خبر نہ سنو، جانو کہ غالب جیتا ہے۔ خستہ و نثر نذار رنجور و درد مند۔ یہ سطریں لکھ کر اس وقت تمھارے بھائی[2] کے پاس بھیجتا ہوں۔ مگر ان کو ہمیشہ سفر در وطن ہے۔ بفرضِ محال اگر گھر میں ہیں تو عنایت اللہ ان کو، ورنہ محمد مرزا کو دے آئے گا۔ ربیع الثانی جمعہ کا دن صبح کا وقت ہے۔

ربیع الثانی (سنہ ۱۲۸۳ھ)
(اگست سنہ ۱۸۶۶ء)

میرزا باقر علی خاں صاحب کامل

(۱)

اقبال نشان باقر علی خاں کو غالب نیم جان کی دعا پہنچے۔ بہت دن ہوئے کہ تمھارا خط آیا۔ مگر تم نے اپنے مکان کا پتہ تو لکھا ہی نہ تھا۔ فقط الور کا نام لکھ کر چھوڑ دیا۔ میں کیوں کر خط بھیجتا؟ بارے اب شہاب الدین خاں کی زبانی پتہ معلوم ہوا۔ سو

---

[1] میں نے تحریر نہیں چھوڑی؛ تحریر نے مجھے چھوڑ دیا یعنی تحریر کا دماغ ہی نہ رہا۔

[2] میرزا قربان علی بیگ سالک

[3] میرزا غالب کا ملازم۔

اب میں تم کو خط لکھتا ہوں۔ جنیا بیگم[1] اچھی طرح ہے۔ میرے پاس آتی رہتی ہے اور تمہارے گھر میں سب طرح خیر و عافیت ہے۔ اکتوبر کے مہینے کی تمہاری تنخواہ تمہارے گھر بھیج دی۔ مرزا حسین علی خاں بندگی عرض کرتا ہے۔

تحریر ۱۶ / نومبر ۱۸۶۷ء اسد اللہ

(۲)

اقبال نشان مرزا باقر علی خاں کو غالب نیم جاں کی دعا پہنچے۔ تمہارا خط آیا۔ تمہارے روزگار کی درستی آگے سُن چکا تھا، اب تمہارے لکھنے سے دیکھ بھی لی۔ دل میرا خوش ہوا اور تم خاطر جمع رکھو۔ جیسا کہ مہاراج[2] نے تم سے کہا ہے، تمہاری ترقی انشاءاللہ جلد ہوگی۔ مجھ سے جو تم گلہ کرتے ہو خط کے نہ بھیجنے کا، بھائی، اب میری انگلیاں نکمّی ہو گئی ہیں اور بصارت میں بھی ضعف آگیا ہے۔ دو سطریں نہیں لکھ سکتا۔ اطراف و جوانب کے خطوط آئے ہوئے دھرے رہتے ہیں۔ جب کوئی دوست آجاتا ہے، میں اس سے جواب لکھوا دیتا ہوں۔ پرسوں کا تمہارا خط آیا ہوا دھرا تھا۔ اب اس وقت مرزا یوسف علی خاں آ گئے ہیں میں نے ان سے یہ خط لکھوا دیا۔ تمہاری دادی[3] اچھی طرح ہے۔ بھائی[4] اچھی طرح ہے، تمہارے گھر میں سب خیر و عافیت ہے۔ تمہاری لڑکی اچھی طرح ہے۔ کبھی روز، کبھی دوسرے تیسرے میرے پاس آجاتی ہے۔

(۳)

نورِ چشم و راحت جاں میرزا باقر علی خاں کو فقیر غالب کی دُعا پہنچے۔ تمہارا خط جو

۱۔ باقر علی خاں کی بڑی صاحبزادی جن کا اصل نام محمد سلطان بیگم تھا۔ خاندان والے اِسے جندو بیگم کہا کرتے تھے اور میرزا غالب پیار سے اسے میرزا جیون بیگ پکارتے تھے۔

۲۔ یعنی شیو دھیان سنگھ والی الور جن کے پاس میرزا باقر علی خاں نوکر تھے۔

۳۔ بیگم غالب ۴۔ میرزا حسین علی خاں

میرے خط کے جواب میں تھا وہ مجھ کو پہنچا۔ اس میں کوئی بات جواب طلب نہ تھی۔ اس خط میں ایک نئے امر کی اطلاع دیتا ہوں۔ وہ امر یہ ہے کہ میں نے اگلے مہینے میں "سبد چین" کی ایک جلد مع عرضی، اقبال نشان ہیر تفضل حسین خاں کی معرفت الور کو بھجوائی تھی، سو اب کے ہفتے میں حضور پر نور مہاراؤ راجہ بہادر کا خط انھیں کی معرفت مجھ کو آیا۔ حضور نے از راہ بندہ پروری و قدر افزائی القاب بہت بڑا مجھے لکھا اور خط میں فقرے بہت عنایت اور التفات کے بھرے ہوئے درج کیے۔ تم تو وہیں ہو، تم کو اس کی اطلاع ہو گئی تھی یا نہیں؟ اور اگر ہو گئی تھی تو تم نے مجھ کو کیوں نہیں لکھا؟ اب میں تم سے یہ پوچھتا ہوں کہ کبھی دربار میں کچھ میرا بھی ذکر آتا ہے یا نہیں؟ اور اگر آتا ہے تو کس طرح آتا ہے؟ حضور سن کر کیا فرماتے ہیں؟

۷ ردسمبر ۱۸۶۸ء غالب

منشی ہرگوپال تفتہ

ہرگوپال نام، تفتہ تخلص، سکندر آباد ضلع بلند شہر کا باشندہ، ۱۲۱۴ھ میں محلہ قانونگویاں میں پیدا ہوا۔ یعنی غالب سے دو برس چھوٹا تھا۔ "ادبی خطوط غالب" کے مولف نے لکھا ہے کہ ابتدا میں کچھ دن قانون گوئی کے عہدے پہ مامور رہا۔ غالب کے بعض خطوط سے معلوم ہوتا ہے کو جانی بانکے لال رند وکیل راجہ بھرت پور کے ماتحت تفتہ کیلئے مالی منفعت کا کوئی انتظام تھا جس کی نوعیت میری معلومات کے مطابق یہ ہے کہ بندوبست کے محکمہ میں ملازمت مل گئی تھی۔ چنانچہ خط ۱۱ میں راجہ بھرت پور کے انتقال کی خبر سن کر تفتہ کو جو خط لکھا، اس میں فرماتے ہیں

"مجھ کو فکر جانی جی کی ہے کہ اس علاقے میں تم بھی شامل ہو . . . . تم اگرچہ بابو صاحب (رند) کی محبت کا علاقہ رکھتے ہو۔ لیکن انھوں نے ازراہِ دوراندیشی تم کو متوسل اس سرکار کا کر رکھا تھا اور تم مستغنیانہ اور لاابالیانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ زنہار اب وہ روش نہ رکھنا۔ اب تم کو بھی لازم آپڑا ہے جانی جی کے ساتھ روشناس حکام والا مقام ہونا۔"

یہ سلسلہ بظاہر جانی بانکے لال رند کی وفات تک قائم رہا ہوگا۔ جو غالباً ۱۸۵۵ء میں ہوئی۔ اس کے بعد تفتہ نے ساری زندگی آزادانہ گزاری۔

بعض خطوں سے متبادر ہوتا ہے کہ تفتہ کافی خوشحال تھے۔ ان کا روپیہ بنک میں جمع تھا۔ (ملاحظہ ہو خط ۲۲) وہ اپنے خرچ پر اپنی کتابیں چھپواتے رہے (خط ۲۷) غدر کے بعد غالب پر عسرت کا شدید دور جاری تھا۔ اس زمانے میں تفتہ نے میرٹھ سے سو روپے بھیجے تھے۔ غالب خود لکھتے ہیں کہ

"از میرٹھ سفینہ زر بہ من فرستاد" (کلیاتِ نثرِ غالب صفحہ ۴۰۸) غالباً اسی ہدیہ کا ذکر خط نمبر ۳۱ میں بھی کیا ہے۔ لیکن آخری دور میں بہ ظاہر تفتہ کی مالی حالت کمزور ہو گئی تھی۔ چنانچہ اس نے نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ اور نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر کے قصیدے لکھے اور غالب نے ان قصیدوں کا صلہ دلانے کی سعی کی (خط ۹۲) خط ۱۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ تفتہ کی حالت ایسی تھی کہ غالب نے ان کے لیے ربٹی گن صاحب کے ماتحت پندرہ بیس روپے مشاہرے کی ملازمت کے لیے سعی کے متعلق استفسار کیا تھا۔

غالب سے تلمذ کا سلسلہ کب شروع ہوا؟ اس بارے میں یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔ فارسی خطوں میں تفتہ کے نام ایک خط ہے جو فروری ۱۸۴۸ء میں لکھا گیا یعنی اس سے پیشتر تفتہ شاگرد بن چکے تھے اور یہ رابطہ غالب کے آخری دم تک قائم رہا۔ وفات کی صحیح تاریخ معلوم نہیں ہو سکی بعض احباب سے سنا ہے کہ غالب سے دس برس بعد یعنی ۱۸۷۹ء میں وفات پائی۔

فارسی شعر خاصا کہتے تھے۔ اردو میں ان کے صرف دو شعر میں نے دیکھے ہیں یعنی غالب کی تاریخ وفات کا قطعہ:

غالب وہ شخص تھا ہمہ داں جس کے فیض سے
ہم سے ہزار ہیچ مداں نامور ہوئے
فیض و کمال و صدق و صفا اور حسن و عشق
چھ لفظ اس کے مرتے ہی بے پا و سر ہوئے

"خمخانۂ جاوید" میں مرقوم ہے کہ چار دیوان ان سے یادگار ہیں۔ نواب علی حسن خاں اپنے تذکرہ شعرائے فارسی میں فرماتے ہیں:

"پنج دیوان شعر دارد و ابیات ہر یکے از آں قریب سیزدہ ہزار بیت (صبح گلشن صفحہ ۸۶)

میری نظر سے ان کا صرف ایک دیوان گزرا ہے جو ۱۸۵۷ء میں مطبع کوہ نور (لاہور) میں چھپا تھا۔ یہ دیوان قریباً چھ سو صفحے کا ہے اور اس میں صرف غزلیات کے اشعار پونے آٹھ ہزار کے قریب

ہیں - اکثر زمینوں میں دو دو غزلیں کہی گئی ہیں -

رباعیات و متفرقات کے علاوہ اس دیوان میں ایک دو مرثیے بھی ہیں - ایک تفتہ کے بیٹے لالہ پتیمبر سنگھ کا جس کے چودہ بند اور ۳۲۲ شعر ہیں - دوسرا جانی بانکے لال رند وکیل راجہ بھرت پور کا اس کے بارہ بند اور ۲۷۳ شعر ہیں، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ تفتہ کتنے پُرگو تھے -

"تضمین گلستاں" اور "سنبلستان" بھی ان کی تصانیف میں ہیں -

اُردو میں غالب کے سب سے زیادہ خطوط ان ہی کے نام ہیں - یعنی ۱۲۳ - اس سے ظاہر ہے کہ تفتہ کے ساتھ کتنا گہرا تعلق تھا اور میرا خیال ہے کہ سارے خطوط محفوظ نہیں رہے - ۱۸۴۸ء، ۱۸۵۰ء اور ۱۸۵۱ء کا صرف ایک ایک خط ہے اور یہ بات قرین قیاس نہیں کہ گہرا تعلق پیدا ہونے کے باوجود سال بھر میں صرف ایک خط لکھا گیا ہو - بقیہ سنین کی کیفیت یہ ہے :

۱۸۵۲ء	پانچ یا چھ
۱۸۵۳ء	گیارہ یا بارہ
۱۸۵۴ء	چار یا پانچ
۱۸۵۶ء	ایک
۱۸۵۷ء	ایک
۱۸۵۸ء	چونتیس
۱۸۵۹ء	چودہ
۱۸۶۰ء	نو
۱۸۶۱ء	پانچ یا چھ
۱۸۶۲ء	چار یا پانچ
۱۸۶۳ء	نو
۱۸۶۴ء	چار

۱۸۶۵ء ——————— آٹھ

بقیہ تین سوا تین برس کے کل چار خط ہیں۔ ۱۸۵۸ء میں "دستنبو" کی طباعت کے سلسلے میں زیادہ خط لکھے گئے۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ بار بار وقفے کیوں ہوئے ؟ مثلاً ۱۸۵۵ء کا کوئی خط موجود نہیں۔ ۱۸۵۶ء کا صرف ایک خط ہے جو دیوان کی تقریظ کے متعلق ہے اور جسے میں قیاساً ۱۸۵۶ء کا قرار دیتا ہوں اس لیے کہ تفتہ کا دوسرا دیوان ۱۸۵۷ء میں چھپا۔ ۱۸۵۷ء کا صرف ایک خط ہے اور اس میں کوئی ایسا اشارہ نہیں جس سے ظاہر ہو کہ مدت تک سلسلہ مکاتیت بند رہا۔ میرا خیال یہی ہے کہ سارے خط محفوظ نہیں رہے، بلکہ بہت سے خط ضائع ہو گئے۔

تفتہ کو غالب از راہِ محبت میرزا تفتہ کہتے تھے۔ غالباً انھیں کی وجہ سے جانی بانکے لال رند اور منشی بال مکند بے صبر نے غالب کی شاگردی اختیار کی ؎

(۱)

مہاراج،

آپ کا مہربانی نامہ پہنچا۔ دل میرا اگرچہ خوش نہ ہوا، لیکن ناخوش بھی نہ رہا۔ بہرحال مجھ کو، کہ نالائق و ذلیل ترینِ خلائق ہوں، اپنا دعاگو سمجھتے رہو۔ کیا کروں، اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا۔ وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھ کو نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کریں۔ میرے قصیدے دیکھو، تشبیب کے شعر بہت پاؤ گے اور مدح کے شعر کمتر۔ نثر میں بھی یہی حال ہے۔ نواب مصطفیٰ خاں کے "تذکرے[۱]" کی تقریظ کو ملاحظہ کرو کہ اُن کی مدح کتنی ہے۔ مرزا رحیم الدین بہادر حیاؔ تخلص کے دیوان کے دیباچہ کو دیکھو۔ وہ جو تقریظ دیوان حافظ کی، بموجب فرمایش جان جاکوب بہادر کے لکھی ہے، اس کو دیکھو کہ فقط ایک بیت میں ان کا نام اور ان کی مدح آئی ہے اور باقی ساری نثر میں کچھ اور ہی اور مطالب ہیں۔ واللہ باللہ اگر کسی شہزادے یا امیرزادے کے دیوان کا دیباچہ لکھتا تو اس کی اتنی مدح نہ کرتا جتنی تمھاری مدح کی ہے۔ ہم کو اور ہماری روش کو اگر پہچانتے تو اتنی مدح کو بہت جانتے۔ قصہ مختصر تمھاری خاطر کی اور ایک فقرہ تمھارے نام کا بدل کر اس کی عوض ایک فقرہ اور لکھ دیا ہے۔ اس سے زیادہ بھٹئی میری روش نہیں۔ ظاہرا تم خود فکر نہیں کرتے، اور حضرات کے بہکانے میں آجاتے ہو۔ وہ صاحب تو بیشتر اس نظم و نثر کو مہمل کہیں گے، کس واسطے کہ ان کے کان اس آواز سے آشنا نہیں۔ جو لوگ کہ قتیل[۲] کو اچھے لکھنے والوں میں جانیں گے، وہ نظم و نثر کی خوبی کو کیا پہچانیں گے؟

---

[۱] اس سے مراد "گلشن بے خار" ہے۔ اس پر میرزا نے جو تقریظ لکھی تھی، وہ کلیات نثر فارسی مطبوعہ نولکشور میں صفحہ ۶۹ پر ہے۔

[۲] میرزا محمد حسن قتیل

ہمارے شفیق منشی نبی بخش صاحب کو کیا عارضہ ہے کہ، جس کو تم لکھتے ہو، مار، الجھن سے بھی نہ گیا؟ ایک نسخہ طب محمد حسین خانی میں لکھا ہے اور وہ بہت بے ضرر اور سود مند ہے، مگر اثر اس کا دیر میں ظاہر ہوتا ہے۔ وہ نسخہ یہ ہے کہ پان سات سیر پانی لیویں اور اس میں سیر بھیجے تولہ بھر چوب چینی کوٹ کر ملاویں اور اس کو جوش کریں اور اس قدر کہ چہارم پانی جل جائے۔ پھر اس باقی پانی کو چھان کر کوری ٹھلیا بھر رکھیں اور جب باسی ہو جائے اس کو پئیں۔ جو غذا کھایا کرتے ہیں، کھایا کریں۔ پانی، دن رات، جب پیاس لگے یہی پئیں۔ روز جوش کروا کر چھنوا کر رکھ چھوڑیں۔ بیس دن میں اس کا فائدہ معلوم ہوگا۔ میرا سلام کہہ کر یہ نسخہ عرض کر دینا۔ آگے ان کو اختیار رہے[1]۔

مئی ۱۸۴۸ء

(۲)

بھائی، یہ مصرع جو تم کو بہم پہنچا ہے۔ فن تاریخ گوئی میں اس کو کرامت اور اعجاز کہتے ہیں۔ یہ مصرع سلمانؔ[1] ساوجی و ظہیرؔ[2] کا سا ہے۔ چار لفظ اور چار دوں واقعہ[3]

---

[1] یہ ان خطوں میں سے ہے، جن پر شروع میں کوئی تاریخ درج نہیں تھی۔ منشی مہیش پرشاد نے اسے اگست ۱۸۴۹ء کا قرار دیا۔ لیکن جب منشی نبی بخش حقیر کے نام کے مکاتیب کا مجموعہ بنام "نادرات غالب" چھپا تو واضح ہوا کہ اس خط کو اگست ۱۸۴۹ء کا قرار دینا ٹھیک نہ ہوگا اس لیے کہ ۸۔ جون ۱۸۴۸ء کا مرقومہ ایک خط منشی حقیر کے نام موجود ہے جس میں تفتہ کی کتاب کی تقریظ اور چوب چینی کے پانی کا ذکر ہے۔ قرینہ یہی ہے کہ یہ خط حقیر کے نام کے خط سے پہلے لکھا گیا۔ اس لیے اسے مئی ۱۸۴۸ء کا سمجھنا چاہیے۔

[1] خلافت عباسی کی تباہی کے بعد متفرق حکومتیں قائم ہو گئی تھیں۔ ان میں ایک حکومت خاندان جلائر کی تھی جس کا مرکز بغداد تھا۔ اسی خاندان حکومت کا مداح سلمان تھا جو "ساوہ" (مغربی ایران) کا رہنے والا تھا۔ اس لیے ساوجی مشہور ہوا۔ عام روایت کے مطابق ۱۳۶۷ء میں فوت ہوا۔ قصیدہ گو اساتذہ میں شمار ہوتا ہے۔

[2] ظہیر فاریاب کا رہنے والا تھا۔ مشہور قصیدہ گو شاعر تھا۔ جس کے دیوان کے متعلق کسی نے کہا (آگے صفحہ ۱۰۳)

کے مناسب - یہ مصرع کہہ کر اور مصرع کی فکر کہ فی کس واسطے ؟ واہ واہ! سبحان اللہ

اور یہ جو تم کو "فر" کے لفظ میں تردّد ہوا اور ایک سوکھا سہما شعر ظہوری کا لکھا، بڑا تعجب ہے - یہ لفظ میرے ہاں پنج آہنگ میں دس ہزار جگہ آیا ہوگا۔ "فر" اور "فرہ" لفظ فارسی ہے مرادف "جاہ" کے - پس "جاہ" کو اور اس کو کس نے کہا ہے کہ بغیر ترکیب دیے نہ لکھے؟ "عالی جاہ" اور "سکندر جاہ" اور "مظفر فر" اور "فریدوں فر" یوں بھی درست ہے اور صرف "جاہ" اور "فر" یوں بھی درست۔

اور ایک بات تم کو معلوم رہے کہ "اس پورے خطاب کو خطاب بہادری کہنا بہت بے جا ہے - سنو: خطاب کے مراتب میں پہلے تو خانی کا خطاب ہے اور یہ بہت ضعیف ہے اور بہت کم ہے - مثلاً ایک شخص کا نام ہے میر محمد علی یا شیخ محمد علی یا محمد علی بیگ اور اس کو خاندانی بھی خانی نہیں حاصل - پس جب اس کو بادشاہ وقت محمد علی خاں کہہ دے، تو گویا اس کو خانی کا خطاب ملا اور جو شخص کہ اس کا نام اصلی محمد علی خاں ہے یا تو وہ قوم افغان ہے یا خانی اس کی خاندانی ہے، بادشاہ نے اس کو محمد علی خاں بہادر کہا - پس یہ خطاب "بہادری" کا ہے - اس کو بہادری کا خطاب کہتے ہیں - اس سے بڑھ کر خطاب "دولگی" کا ہے - یعنی مثلاً "محمد علی خاں بہادر" اس کو "منیر الدولہ محمد علی خاں بہادر" کہا - اب یہ خطاب "دولگی" کا ہوا، اس کو "بہادری کا خطاب" نہیں کہتے - اب اس خطاب پر افزایش جنگ کی ہوتی ہے "منیر الدولہ محمد علی خان بہادر شوکت جنگ" - ابھی خطاب پورا نہیں، پورا جب ہوگا کہ جب

(صفحہ گذشتہ) دیوان ظہیر فاریابی در مکہ بہ دزد اگر بیابی

اسی کا شعر ہے: نہ کرسی فلک نہد اندیشہ زیر پا

تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلاں دہد

(۱) "فر" بہ معنی دبدبہ و شوکت - دس ہزار سے مراد ہے "بہ کثرت"

"ملک" بھی ہو ہیں پورے خطاب کو "خطاب بہادری" لکھنا غلط ہے - یہ واسطے تمھارے معلوم رہنے کے لکھا گیا ہے[1] -

اب آپ اِس سات بیت کے قطعے کو اپنے دیوان میں داخل اور شامل کر لیجے یعنی قطعوں میں لکھ دیجیے - جب تمھارا دیوان چھاپا جائے گا ، یہ قطعہ بھی چھپ جائے گا - مگر ہاں منشی صاحب کے سامنے اس کو پڑھے اور ان سے استدعا کیجیے کہ اس کو آگرے بھیجیے تا کہ اس کو چھاپا جائے "اسعد الاخبار" میں - یقین ہے کہ وہ تمھارے کہنے سے عمل میں لائیں گے - مجھ کو کیا ضرور ہے کہ میں یہاں سے لکھوں ؟ میں نے یہاں "صادق الاخبار" میں چھپوا دیا ہے -

اگست ۱۸۵۰ء

(۳)

میں تم کو خط بھیج چکا ہوں ، پہنچا ہوگا - کل ایک رقعہ میرے پاس آیا - کوئی صاحب عطا اللہ خاں ہیں ادراکی تخلص کرتے ہیں ، خدا جانے کہاں ہیں اور کون ہیں - ایک دوست نے وہ رقعہ میرے پاس بھیجا - میں نے اس کا جواب لکھ کر اسی دوست کے پاس بھیج دیا - رقعہ تم کو بھیجتا ہوں - پڑھ کر حال معلوم کروگے -

---

[1] غالب نے خطابات کی تدریجی ترتیب یہ بنائی ہے :

(۱) خان (۲) بہادر (۳) دولہ (۴) جنگ ، ملک - ممکن ہے مغلوں کے زمانے میں یہی ترتیب ہو - حیدر آباد کے آخری زمانے کے مروجات سے معلوم ہوتا ہے کہ خانی کا خطاب اڑ گیا تھا اور ترتیب یہ تھی : (۱) جنگ (۲) دولہ (۳) ملک (۴) امرا (۵) جاہ (۶) فتح جنگ ، نظام الدولہ ، آصف جاہ - سکندر جنگ (۷) اقبال الدولہ ، اقتدار الملک ، وقار الامرا - ایک خطاب سلطنت کا بھی اختیار کیا گیا تھا - مثلاً "یمین السلطنۃ"

تمہارے شعر میں جو تردّد تھا - اس کا جواب میں نے یہ لکھا ہے - تم کو بھی معلوم رہے :

رفت آنچہ بہ منصور شنیدی تو و من ہم
اے دل سخنے ہست نگہدار زبان را

تردّد یہ کہ "آنچہ بہ منصور رفت" نہیں دیکھا - "آنچہ بر منصور رفت" درست ہے - جواب : بارِ موحدہ علےٰ کے معنی بھی دیتی ہے، پس جو کچھ بَر سے مراد تھی، وہ بارِ موحدہ سے حاصل ہو گئی اور اگر بارِ موحدہ کے معنی معیت کے لیں، تو بھی درست ہے - نظیری کہتا ہے :

شادی کہ غبن میکنشی و دم نے زنی در شہر این معاملہ با ہر گدا رود

اگر کوئی یہ کہے کہ (نظیری کے شعر میں) "معاملہ" ہے اور اس شعر (تفتہ کے شعر) میں معاملہ کا لفظ نہیں - جواب اس کا یہ ہے کہ سراسر دونوں شعروں کی صورت ایک ہے - نظیری کے ہاں "معاملہ" مذکور ہے اور تفتہ کے ہاں مقدر ہے - رفت کا صلہ اور تعدیہ بارِ موحدہ کے ساتھ دونوں جگہ ہے - والسلام

۱۸۵۱ء
اسد اللہ

(۴۳)

کیوں مہاراج، کول[1] میں آنا اور منشی نبی بخش صاحب کے ساتھ غزلخوانی کرنی اور ہم کو یاد نہ لانا! مجھ سے پوچھو کہ میں نے کیوں کر جانا کہ تم مجھ کو بھول گئے؟ کول میں آئے اور مجھ کو اپنے آنے کی اطلاع نہ دی - نہ لکھا کہ میں کیوں کر آیا ہوں اور کب تک رہوں گا اور کب جاؤں گا اور بابو[2] صاحب سے کہاں جاملوں گا - خیر، اب جو میں نے

---

[1] علی گڑھ کا پرانا نام -

[2] بابو سے مراد جانی بانکے لال رند ہیں - جیسا کہ خط ۵ سے واضح ہو جاتا ہے - وہ راجہ بھرت پور کے وکیل تھے اور غالباً جے پور سے بھی کچھ تعلق تھا - میرزا غالب کے شاگرد تھے - مزید حالات (بقیہ صفحہ ۱۰۶)

بے حیائی کر کے تم کو خط لکھا، لازم ہے کہ میرا قصور معاف کرو اور مجھ کو ساری اپنی حقیقت لکھو۔ تمھارے ہاتھ کی لکھی ہوئی غزلیں بابو صاحب کی میرے پاس موجود ہیں اور اصلاح پا چکی ہیں۔ اب میں حیران ہوں کہ کہاں بھیجوں۔ ہر چند اُنھوں نے لکھا ہے کہ اکبر آباد ہاشم علی خاں کو بھیج دو، لیکن میں نہ بھیجوں گا۔ جب وہ اجمیر یا بھرت پور پہنچ کر مجھ کو خط لکھیں گے، تو میں ان کو وہ اوراق ارسال کر دوں گا یا تم جو لکھو گے، اس پر عمل کروں گا۔ بھائی ایک دِن شراب نہ پیو یا کم پیو اور ہم کو دو چار سطریں لکھ بھیجو کہ ہمارا دھیان تم میں لگا ہوا ہے۔

رقم زدہ یک شنبہ ۱۴ جنوری ۱۸۵۲ء اسداللہ

(۵)

شفیق بالتحقیق منشی ہرگوپال تفتہ سلامت رہیں۔

آپ کا وہ خط جو آپ نے کانپور سے بھیجا تھا پہنچا۔ بابو صاحب کے سیر و سفر کا حال اور آپ کا لکھنو جانا اور وہاں کے شعرا سے مِلنا سب معلوم ہوا۔ اشعار جناب رِند کے پہنچنے کے ایک ہفتہ بعد درست ہو گئے اور اصلاح اور اشارے اور فوائد جیسا کہ میرا شیوہ ہے، عمل میں آیا۔ جب تک کہ اُن کا یا تمھارا خط نہ آوے اور اقامت گاہ معلوم نہ ہو میں کاغذ ضروری کہاں بھیجوں اور کیوں کر بھیجوں؟ اب جو تمھارے لکھنے سے جانا کہ ۱۹ فروری تک اکبر آباد آؤ گے تو میں نے یہ خط

(بقیہ صفحہ ۱۰۵) معلوم نہیں ہو سکے۔ تفتہ ان کے ماتحت ملازم ہو گئے تھے۔ تفتہ کے دوسرے دیوان مطبوعہ مطبع دو کوہ نور، لاہور میں جانی بانکے لال رند پر ایک طویل مرثیہ موجود ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا انتقال ۱۲۷۲ھ (۵۶-۱۸۵۵ء) میں ہوا۔ مرثیہ میں تفتہ ایک جگہ رند کے فضائل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "بود ہندو و دِل سوے اسلام" دوسری جگہ لکھتے ہیں:

پدر او ہمیں پسر مے داشت ، درجہاں زو نشاں کہ بود نہ ماند

تمھارے نام لکھ کر لفافہ کر رکھا ہے۔ آج انیسویں ہے، پرسوں اکیسویں کو لفافہ آگرے کو روانہ ہوگا۔ بابو صاحب کو میں نے خط اس واسطے نہیں لکھا کہ جو کچھ لکھنا چاہیئے تھا، وہ خاتمہ اوراقِ اشعار پر لکھ دیا ہے۔ تم کو چاہیئے کہ ان کی خدمت میں میرا سلام پہنچاؤ اور سفر کے انجام اور حصول مرام کی مبارکباد دو اور اوراق اشعار گزرانو اور یہ عرض کرو کہ جو عبارت خاتمے پہ مرقوم ہے، اس کو غور سے پڑھیے اور اپنا دستور العمل گردانیے، نہ یہ کہ سرسری دیکھیے اور بھول جایئے۔ بس تمام ہوا وہ پیام کہ جو بابو صاحب کی خدمت میں تھا۔

اب پھر تم سے کہتا ہوں کہ وہ جو تم نے اس شخص کو لی کا حال لکھا تھا، معلوم ہوا۔ ہر چند اعتراض ان کا لغو اور پرسش ہے اُن کی بے مزہ ہو، مگر ہمارا یہ منصب نہیں کہ معترض کو جواب نہ دیں یا سائل سے بات نہ کریں۔ تمھارے شعر پر اعتراض اس راہ سے کہ وہ ہمارا دیکھا ہوا ہے، گویا ہم پر ہے۔ اس سے ہمیں کام نہیں کہ وہ مانیں یا نہ مانیں۔ کلام ہمارا اپنے نفس میں معقول و استوار ہے۔ جو زبان داں ہوگا وہ سمجھ لے گا غلط فہم اور کج اندیش لوگ نہ سمجھیں، نہ سمجھیں۔ ہم کو تمام خلق کی تہذیب و تلقین سے کیا علاقہ؟ تعلیم و تلقین واسطے دوستوں کے اور یاروں کے ہے، نہ واسطے اغیار کے۔

تمھیں یاد ہوگا کہ میں نے تمھیں بارہا سمجھایا ہے کہ خود غلطی پہ نہ رہو اور غیر کی غلطی سے کام نہ رکھو۔ آج تمھارا کلام وہ نہیں کہ کوئی اس پہ گرفت کر سکے۔ مگو ہاں:

حسود را چہ کنم کو ز خود برنج درست

والسلام والاکرام

رقم زدہ ۱۹ فروری و مرسلہ بست و یکم فروری ۱۸۵۲ء — غالب

(۶)

بندہ پرور "بیش از بیش و کم از کم" یہ ترکیب بہت فصیح ہے۔ اس کو کون منع

کوتا ہے اور جلال اسیرؒ کی یہ بیت بہت پاکیزہ اور خوب ہے۔ اس کے معنی یہی ہیں کہ "در زمانِ من مہر بیش از بیش شد و در زمانِ تو وفا کم از کم شد"۔ استاد کیا کہے گا؟ اس میں تو تین ٹکڑے کا لف و نشر ہے "من" اور "تو" "مہر" اور "وفا" "بیش از بیش" اور "کم از کم"۔ یاد رہے کہ "بیشتر از بیش" "کمتر از کم" اگرچہ بحسب معنی جائز ہے لیکن فصاحت اس میں کم ہے "بیش از بیش" اور "کم از کم" افصح ہے۔ وہ شعر تمھارا خوب ہے اور ہمارا دیکھا ہوا ہے:

قیس از تو نہ ایم کم، دلے صبر   بیش است ترا، کم است مارا

لیکن ہاں پہلے مصرع میں اگر "کمتر" ہوتا تو اور اچھا تھا۔ بہ ہر حال اتنا خیال رہے کہ ایسی جگہ "تر" کا لفظ افصح ہے۔ چنانچہ میرا شعر ہے:

جلوہ کن، منت منہ، از ذرہ کمتر نیستم
حسن با ایں تابناکی آفتابے بیش نیست

مصرع: ورنہ چشمِ تو چہ از روزنِ دیوار کم است

یہاں بہت ہی اوپری معلوم ہوتا ہے اور نرا ہندی کا ترجمہ رہ جاتا ہے فارسیت نہیں رہتی۔ مصرع: سہل شمار زندگانی ہا

مجھ کو یاد پڑتا ہے کہ میں نے اس مطلع کو یوں درست کر دیا ہے:

رایگان ست زندگانی ہا   می تواں کرد جانفشانی ہا

اور اس صورت میں یہ مطلع ایسا ہو گیا تھا کہ میرے دل میں آئی تھی کہ تم کو نہ دوں اور خود اس زمین میں غزل لکھوں۔ مگر پھر میں نے خست نہ کی اور تم کو دے دیا۔ حضرت نے ملاحظہ نہیں فرمایا۔ یہ خط جو آپ نے مجھے لکھا ہے، شراب کے نشہ میں لکھا ہے اور وہ اصلاحی

؎ میرزا جلال اسیر بن مومن شہرستان اصفہان کے باشندے اور شاہ عباس صفوی کے رشتہ داروں میں تھے۔ جن شعرا کو "خیال بند" کہا جاتا تھا، ان میں شامل ہیں۔ ۱۶۴۹ء میں فوت ہوئے۔

اوراق بھی اسی عالم میں ملاحظہ فرمائے ہیں - اب مصرع :

گلہ تا کے ز زندگانی ہا

اس کو موقوف کیجیے اور وہ مطلع رہنے دیجیے کہ وہ بہت خوب ہے بعینہ مولانا ظہوری[1] کا معلوم ہوتا ہے۔ بھائی ہمارے اوراق اصلاحی کو غور سے دیکھا کرو - ہماری محنت تو ضائع نہ جائے۔

"ایامے چند" جمع الجمع ایسی کھلی ہوئی نہیں ہے، بلکہ فقیر کے نزدیک جمع الجمع ہی نہیں ہے۔ مثلاً "معانی چند" اور "احکام چند" اور "اسرار چند" یہ آدمی لکھ سکتا ہے مگر ہاں "آمال ہا" یہ کھلی سوربٹھ ہے۔ مصرع

خطائے بزرگاں گرفتن خطاست

ہم کو اپنی تہذیب سے کام ہے، اغلاط میں سند کیوں ڈھونڈھتے پھریں؟ مثلاً حضرت حافظ نے لکھا ہے:

صلاحِ کار کجا و من خراب کجا — بہ بیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

میری جان، ایسے موقع پر یہ چاہیے کہ بزرگوں کے کلام کو ہم موردِ اعتراض نہ کریں اور خود اس کی پیروی نہ کریں۔ فقیر گوارا نہیں رکھنے کا جمع الجمع کو اور برا نہ کہے گا حضرت صائب کو[2]۔

---

[1] فارسی کے مشہور شعرا میں سے ہے - اکبر کے عہد میں ہندوستان آیا تھا۔ پھر دکن پہنچ کر بیجاپور میں عادل شاہی دربار میں ملازم ہو گیا۔ ملک قمی نے اپنی لڑکی سے شادی کر دی تھی۔ نظم کے علاوہ اس کی نثر بھی مشہور ہے۔ "سہ نثر" مدت تک فارسی نصاب میں رہی۔

[2] مطلب یہ ہے کہ صائب نے اگر کہیں جمع الجمع سے کام لیا ہے تو اسے برا کہنے کی ضرورت نہیں، لیکن خود میں جمع الجمع کو جائز نہیں سمجھتا - اس لیے کہ اغلاط میں اساتذہ کی سندیں ڈھونڈنا بالکل غیر مناسب ہے ؎

شہرت فلانے شخص کے انتقال کی بہ غلط،[1] البتہ میرا بھی موجب ملال ہے، مگر یہ کون سا واقعۂ عظیم ہولناک ہے کہ صاحبانِ اخبار اس کو چھاپیں۔ آپ اس طرف اتنا اغتنا نہ فرمایئے۔

گر ماہ و آفتاب بمیرد، عزا مگیر
در تیر و زہرہ کشتہ شود، نوحہ خوان مخواہ

میں کالے[3] صاحب کے مکان سے اُٹھ آیا ہوں۔ بلی ماروں کے محلے میں ایک حویلی کرایہ کو لے کر اس میں رہتا ہوں۔ وہاں کا میرا رہنا تخفیف کرایہ کے واسطے نہ تھا، صرف کالے صاحب کی محبت سے رہتا تھا۔ واسطے اطلاع کے تم کو لکھا ہے۔ اگرچہ میرے خط پر حاجت مکان کے نشان کی نہیں ہے، "در دہلی بہ اسد اللہ برسد" کافی ہے۔ مگر اب لال کنواں نہ لکھا کرو۔ محلہ بلّی ماراں لکھا کرو۔

اور ہاں صاحب ہمارے شفیق بابو صاحب کا حال لکھو مسہل سے فراغت ہوئی؟ اور اب اجمیر اور وہاں سے آبو پہاڑ کو کب جائیں گے؟ میرا سلام بھی کہہ دیجیے گا۔ والسلام

محررہ دو شنبہ بست و دوم مارچ ۱۸۵۲ء اسد اللہ

(۷)

کاشانۂ دل کے ماہ دو ہفتہ منشی ہرگوپال تفتہ، تحریر میں کیا کیا سحر طرازیاں کرتے ہیں۔ اب ضرور آپڑا ہے کہ ہم بھی جواب اسی انداز سے لکھیں۔ سُنو صاحب: یہ تم

---

[1] مطلب یہ ہے کہ تفتہ نے لکھا کہ فلاں شخص کے انتقال کی شہرت ہوگئی اور واقعہ غلط تھا۔ اس کی تردید اخبار میں چھپوا دیجئے۔

[2] دو ستارے۔

[3] شیخ نصیر الدین عرف کالے میاں، بہادر شاہ کے پیر اور مولانا فخر الدین فخر عالمؒ کے پوتے تھے۔ ان کا مکان گلی قاسم جان میں تھا جس میں غالب کئی برس رہے اور غالباً کرایہ نہیں دیتے تھے۔

جانتے ہو کہ زین العابدین خاں مرحوم[1] میرا فرزند تھا اور اب اس کے دونوں بچے[2] کہ وہ میرے پوتے ہیں، میرے پاس آ رہے ہیں اور دم بدم مجھ کو ستاتے ہیں اور میں تحمل کرتا ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ میں تم کو اپنے فرزند کی جگہ سمجھتا ہوں۔ پس تمھارے نتائجِ طبع میرے معنوی پوتے ہوئے۔ جب ان عالم کے پوتوں سے کہ مجھے کھانا نہیں کھانے دیتے، مجھ کو دوپہر کو سونے نہیں دیتے، ننگے ننگے پاؤں میرے پلنگ پر رکھتے ہیں، کہیں پانی لڑھاتے ہیں، کہیں خاک اُڑاتے ہیں، میں نہیں تنگ آتا تو ان معنوی پوتوں سے کہ ان میں یہ باتیں نہیں، میں کیوں گھبراؤں گا؟ آپ ان کو جلد بہ سبیل ڈاک میرے پاس بھیج دیجیے کہ میں ان کو دیکھوں۔ وعدہ کرتا ہوں کہ پھر جلد ان کو تمھارے پاس بہ سبیل ڈاک بھیج دوں گا۔ حق تعالیٰ تمھارے عالمِ صورت کے بچوں کو جیتا رکھے اور ان کو دولت و اقبال دے اور تم کو ان کے سر پر سلامت رکھے اور تمھارے معنوی بچوں یعنی نتائجِ طبع کو فروغِ شہرت اور حسنِ قبول عطا فرمائے۔ بابو صاحب کے نام کا خط اُن کے خط کے جواب میں پہنچتا ہے۔ ان کو دے دیجیے گا۔ اور ہاں صاحب بابو صاحب اور تم آبو کو جانے لگو تو مجھ کو اطلاع کرنا اور تاریخِ روانگی لکھ بھیجنا تا کہ میں بے خبر نہ رہوں۔ والدعا

نگاشتہ جمعہ ۱۸ رجب ۱۸۵۲ء اسد اللہ

---

[1] زین العابدین خاں عارف غالب کے ہم زلف نواب غلام حسین خاں مسرور کے فرزند اور بیگم غالب کے حقیقی بھانجے تھے۔ مسرور نے اپنی بیوی بنیادی بیگم بنت الٰہی بخش خاں معروف کو چھوڑ کر دوسری شادی کر لی تھی اور عارف اس رشتے کی بنا پر نیز خوش فکری کے باعث غالب سے وابستہ ہو گئے تھے۔ ۳۵ برس کی عمر میں جمادی الثانی ۱۲۶۸ھ (اپریل ۱۸۵۲ء) میں انتقال کیا۔ ان کے شاگرد الیگزنڈر بدرے متخلص بہ آزاد نے جو "الک صاحب" مشہور تھے۔ مندرجہ ذیل مصرع سے تاریخِ وفات نکالی تھی: عارف پسند رحمتِ حق ہو چکا ہے آج

[2] باقر علی خاں اور حسین علی خاں

(۸)

کل تمھارا خط آیا۔ رازِ نہانی مجھ پہ آشکارا ہُوا۔ میں سمجھا ہُوا تھا کہ تم دیوانگی اور شورش کر رہے ہیں۔ اب معلوم ہوا کہ حق بجانب تمھارے ہے۔ میں جو اپنے عزیز کو نصیحت کرتا ہوں تو اپنے نفس کو مخاطب کر کے کہتا ہوں کہ اے دِل تو اپنے کو اس عزیز کی جگہ سمجھ کر تصور کر کہ اگر تجھ پر یہ حادثہ پڑا ہوتا یا تو اس بلا میں گرفتار ہُوا ہوتا تو کیا کرتا؟ عیاذاً باللہ! اب میں تم کو کیوں کر کہوں کہ بے حرمتی گوارا کرو اور رفاقت نہ چھوڑو۔ بلکہ یہ بھی زائد ہے، جو دوست سے کہیے کہ تو ہمارے واسطے اس کو ترک کر۔ بہرحال دوست کی دوستی سے کام اس کے افعال سے کیا غرض؟ جو محبت و اخلاص ان میں، تم میں ہے، بدستور بلکہ روز افزوں رہے۔ ساتھ رہنا اور پاس رہنا نہیں ہے، ایسی

وصلے کہ درآں ملال باشد ہجراں بہ ازاں وصال باشد

آمدم بر سر مدعا تمھاری رائے ہم کو اس بات میں پسند۔ عجب طرح کا پیچ پڑا کہ نکل نہیں سکتا۔ نہ تم کو کچھ سمجھا سکتا ہوں اور نہ ان کو کچھ کہہ سکتا ہوں۔ مجھے تو اس موقع میں سوائے اس کے کہ تماشائی نیرنگ قضا و قدر بنا رہوں، کچھ بن نہیں آتی![1]

نہ بینم کہ تا کہ دگار جہاں دریں آشکارا چہ دارد نہاں

جے پور کا امر محض اتفاقی ہے۔ بے قصد و بے فکر دَر پیش آیا ہے۔ ہو سکا کا نہ اُدھر متوجہ ہوا ہوں۔ بوڑھا ہو گیا ہوں، بہرا ہو گیا ہوں۔ سرکار انگریزی میں بڑا پایہ رکھتا تھا۔ رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا۔ پورا خلعت پاتا تھا۔ اب بدنام ہو گیا ہوں اور ایک بہت بڑا دھبا لگ گیا ہے۔ کسی ریاست میں دخل کر نہیں سکتا، مگر

---

[1] اس عبارت سے متبادر ہوتا ہے۔ کہ کسی معاملہ میں تفتہ اور رند کا یکجا رہنا اور تفتہ کا ملازمت جاری رکھنا مشکل ہو گیا تھا اور وہ ترک ملازمت کے خواہاں تھے۔ غالب نے روکا لیکن جب حقیقت حال کا علم ہُوا تو اعتراف کیا کہ تفتہ کی رائے درست ہے۔

ہاں استاد یا پیر یا مداح بن کر راہ و رسم پیدا کر دوں۔ کچھ فائدہ اٹھاؤں کچھ اپنے کسی عزیز کو وہاں داخل کر دوں۔ دیکھو کیا صورت پیدا ہوتی ہے:

تا نہال دوستی کے بر دہد — حالیا رفتیم و تخمے کاشتیم

صحاف کے ہاں سے دیوان ابھی نہیں آیا۔ آج کل آجائے گا پھر اس کے جزودان کی تیاری کر کے روانہ کروں گا۔ ابھی کول میں آرام کرو۔ اپنے بچوں میں دل بہلاؤ۔ اگر جی چاہے تو اکبر آباد چلے جائیو، وہاں اپنا دل بہلا ہو۔ دیکھو ہم اس خود داری میں ادھر سے کیا ہوتا ہے اور وہ کیا کرتے ہیں۔ والسلام

جمعہ دہم دسمبر ۱۸۵۲ء اسد اللہ

(۹۱)

پرسوں تمھارا خط آیا۔ حال جو معلوم تھا، وہ پھر معلوم ہوا۔ غزلیں دیکھ رہا تھا۔ آج شام کو دیکھنا تمام ہوا تھا۔ غزلوں کو رکھ دیا تھا۔ چاہتا تھا کہ ان کو بند کر کے رہنے دوں۔ کل صبح ۹ بجے ۱۰ بجے ڈاک میں بھیج دوں۔ خط کچھ ضرور نہیں ہے۔ اسی خیال میں تھا کہ ڈاک کا ہرکارہ آیا۔ جانی جی کا خط لایا۔ اس کو پڑھا۔ اب مجھ کو ضرور ہوا کہ خلاصہ اس کا تم کو لکھوں۔ یہ رقعہ لکھا۔ خلاصہ بطریق ایجاز یہ ہے کہ عرضی گزری، دیوان گزرا، راول جی کے نام کا خط گزرا۔ راجہ صاحب دیوان کے دیکھنے

۱؎ مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جے پور کے راجہ کے پاس اپنا دیوان بھیجنا تھا جس کی جلد بندھوائی۔ پھر جزودان یعنی غلاف بنوانا تھا۔ "بدنام ہو گیا ہوں اور دھبا لگ گیا ہے" سے اشارہ غالباً اسیری کی طرف ہے جو قمار بازی کے سلسلے میں عمل میں آئی تھی۔

۲؎ تمام نسخوں میں ۱۸۵۳ء ہے۔ یہ بداہتہً غلط ہے۔ ۱۸۵۳ء کے خط یا اس زمانے کے دوسرے خطوں سے جے پور سے ہنڈی آنے کا ذکر ہے۔ یقیناً اس سلسلے میں تحریک پہلے ہوئی تھی۔ لہٰذا یہ خط سنہ ۱۸۵۲ء کا ہونا چاہیے۔

سے خوش ہوئے۔ جانی جی نے جو ایک معتمد اپنا سعداللہ خاں وکیل کے ساتھ کر دیا ہے وہ منتظر جواب کا ہے۔ راول جی نئے ایجنٹ کے استقبال کو گئے ہیں اور اب ایجنٹ علاقہ، جے پور کی راہ سے نہیں آتا ہے آگرہ اور گوالیار، کروٗلی ہوتا ہوا اجمیر آئے گا اور اس راہ میں جے پور کا عمل نہیں۔ بس چاہیے کہ راول جی اُلٹے پھر آویں اُن کے آئے پر عرضی کا جواب ملے گا اور اس میں دیوان کی رسید بھی ہو گی۔ بھائی، جانی جی تم کو بہت ڈھونڈھتے اور تمھارے بغیر بہت بے چین ہیں۔ میں نہ تم کو کچھ کہہ سکتا ہوں، نہ ان کو سمجھا سکتا ہوں۔ تم وہ کرو کہ جس میں سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے۔ ہاں یہ بھی جانی جی نے لکھا تھا کہ بہت دن کے بعد منشی جی کا خط آیا ہے

اسداللہ

(۱۰)

بھائی،

پرسوں شام ڈاک کا ہرکارہ آیا اور ایک خط تمھارا اور ایک خط جانی جی کا لایا۔ تمھارے خط میں اوراق اشعار اور بابو صاحب کے خط میں جے پور کے اخبار۔ دو دن سے مجھ کو وجع الصدر ہے اور میں بہت بے چین ہوں۔ ابھی اشعار کو دیکھ نہیں سکتا۔ بابو صاحب کے بھیجے ہوئے کاغذ تم کو بھیجتا ہوں۔ اشعار بعد دو چار روز کے تم کو بھیجے جائیں گے۔

مرسلہ جمعہ ۲۵ فروری ۱۸۵۳ء اسداللہ

(۱۱)

بھائی،

آج مجھ کو بڑی تشویش ہے اور یہ خط میں تم کو کمال سراسیمگی میں لکھتا ہوں جس دن میرا خط پہنچے، اگر وقت ڈاک کا ہو، تو اسی وقت، جواب لکھ کر روانہ کرو۔ اور اگر

وقت نہ رہا تو چار و ناچار دوسرے دِن جواب بھیجو۔ منشا تشویش و اضطراب کا یہ ہے کہ کئی دِن سے راجہ بھرت پور کی بیماری کی خبر سُنی جاتی تھی۔ کل سے اور بُری خبر شہر میں مشہور ہے[1]۔ تم بھرت پور سے قریب ہو یقین ہے کہ تم کو تحقیق حال معلوم ہوگا جلد لکھو کہ کیا صورت ہے؟ راجا کا مجھ کو غم نہیں۔ مجھ کو فکر جانی جی کی ہے کہ اسی علاقہ میں تم بھی شامل ہو۔ صاحبان انگریز نے ریاستوں کے باب میں باب میں ایک قانون وضع کیا ہے، یعنی جو رئیس مر جاتا ہے، سرکار اس ریاست پر قابض و متصرف ہو کہ رئیس زادہ کے بالغ ہونے تک بند و بست ریاست کا اپنے طور پر رکھتی ہے۔ سرکاری بند و بست میں کوئی قدیم الخدمت موقوف نہیں ہوتا۔ اس صورت میں یقین ہے کہ جانی صاحب کا علاقہ بدستور قائم رہے، مگر یہ وکیل ہیں، معلوم نہیں مختار کون ہے اور ہمارے بابو صاحب میں اور اس مختار میں صحبت کیسی ہے۔ رانی سے اُن کی کیا صورت ہے۔ تم اگرچہ بابو صاحب کی محبت کا علاقہ رکھتے ہو، لیکن انھوں نے از راہِ دور اندیشی تم کو متوسّل اس سرکار کا کر رکھا ہے اور تم مستغنیانہ اور لاابالیانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ زنہار اب وہ روش نہ رکھنا۔ اب تم کو یہ لازم آپڑا ہے، جانی جی کے ساتھ روشناس حکام والا مقام ہونا۔ پس چاہیے کول کی آرائش کا ترک کرنا اور خواہی نخواہی بابو صاحب کے ہمراہ رہنا۔ میری رائے میں یوں آیا ہے اور میں نہیں لکھ سکتا کہ موقع کیا ہے اور مصلحت کیا ہے؟ جانی جی بھرت پور آئے ہیں یا اجمیر میں ہیں؟ کس فکر میں ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟ واسطے خدا کے، نہ مختصر، نہ سرسری بلکہ مفصّل اور منقّح جو کچھ واقع ہوا ہو اور جو صورت ہو، مجھ کو لکھو اور جلد کہ مجھ پر خواب و خور حرام ہے۔ کل شام کو میں نے سُنا۔ آج صبح قلعہ[2] نہیں گیا اور یہ خط لکھ کر

---

[1] یعنی مشہور ہے کہ راجا فوت ہو گیا۔
[2] یعنی لال قلعہ یا دربار شاہی۔

از راہِ احتیاط بیرنگ روانہ کیا ہے۔ تم بھی اس کا جواب بیرنگ روانہ کرنا۔ آدھ آنہ ایسی بڑی چیز نہیں۔ ڈاک کے لوگ بیرنگ خط کو ضروری سمجھ کر جلد پہنچاتے ہیں اور پوسٹ پیڈ پڑا رہتا ہے۔ جب اس محلے میں جانا ہوتا ہے تو اس کو بھی لے جاتے ہیں۔ زیادہ کیا لکھوں کہ پریشان ہوں۔ ضروری جواب طلب

نوشتہ چاشتگاہ دوشنبہ ۲۸ مارچ ۱۸۵۳ء

(۱۳)

آج منگل کے دن ۵ اپریل کو تین گھڑی دن رہے ڈاک کا ہرکارہ آیا۔ ایک خط منشی صاحب کا اور ایک خط تمھارا اور ایک خط بابو صاحب کا لایا۔ بابو صاحب کے خط سے اور مطالب تو معلوم ہو گئے، مگر ایک امر میں حیران ہوں کہ کیا کروں۔ یعنی انھوں نے ایک خط کسی شخص کا آیا ہوا میرے پاس بھیجا ہے اور مجھ کو یہ لکھا ہے کہ اس کو اُلٹا میرے پاس بھیج دینا۔ حالانکہ خود لکھتے ہیں کہ میں اپریل کی چوتھی کو سیاٹو یا آبو چل دوں گا اور آج پانچویں ہے بس تو وہ کل روانہ ہو گئے۔ اب میں وہ خط کس کے پاس بھیجوں؟ ناچار تم کو لکھتا ہوں کہ میں خط کو اپنے پاس رہنے دوں گا۔ جب وہ آ کر مجھ کو اپنے آنے کی اطلاع دیں گے، تب وہ خط ان کو بھیجوں گا۔ تم کو تردد نہ ہو کہ کیا خط ہے۔ خط نہیں، مینڈھو لال کایستھ غماز کی عرضی تھی بنام مہاراجہ بیکنٹھ باشی سعایت بابو صاحب پر مشتمل کہ اس نے لکھا تھا کہ ہردیو سنگھ، جانی جی کا دیوان اور ایک شاعر دہلی کا دیوان مہاراجہ جے پور کے پاس لایا ہے اور جانی کی درستی روزگار جے پور کی سرکار میں کر رہا ہے۔ اس کے بھیجنے کی یہ وجہ کہ پہلے ان کے لکھنے سے مجھ کو معلوم ہوا تھا کہ کسی نے ایسا کہا ہے۔ میں نے ان کو لکھا تھا کہ تم میرے سر کی قسم اب ہردیو سنگھ کو بلوا لو۔ میں امر جزوی کے واسطے امر کلی کا بگاڑ نہیں چاہتا۔ اس کے جواب میں انھوں نے وہ عرضی بھیجی اور لکھ بھیجا کہ راجہ مرنے والا ایسا نہ تھا کہ ان باتوں پر نگاہ کرتا۔ اس

نے یہ عرضی گزرتے ہی میرے پاس بھیج دی - فقط[ٔ] - بارے خط کے آنے سے جانی جی کی طرف سے میری خاطر جمع ہو گئی - مگر اپنی فکر پڑی - یعنی بابو صاحب آبو ہوں گے اگر ہردیوسنگھ پھر کر آئے گا تو وہ بغیر ان کے ملے اور ان کے کہے مجھ تک کاہے کو آئے گا - خیر، وہ بھی لکھتا ہے کہ راول کہیں گیا ہوا ہے، اس کے آنے پر رخصت ہو گی - دیکھیے وہ کب آوے اور کیا فرض ہے کہ اس کے آتے ہی رخصت ہو بھی جائے -

تمھاری غزل پہنچی - یہ البتہ کچھ دیر سے پہنچے گی تمھارے پاس - گھبرانا نہیں

والدعا - جواب طلب -

نگاشتہ سہ شنبہ اور درود نامہ
ومرسلہ چہار شنبہ اپریل ۱۸۵۳ء

اسد اللہ

(۱۳)

بھائی،

ہاں میں نے "زبدۃ الاخبار" میں دیکھا کہ رانی صاحبہ مر گئیں - کل ایک دوست کا خط اکبرآباد سے آیا، وہ لکھتا ہے کہ راجہ مرا، رانی مری، ابھی ریاست کا کوئی ڈھنگ قرار قرار نہیں پایا - صورت انتظام جانی بیجناتھ کے آنے پر موقوف ہے - یہاں تک اس

ٔ مطلب یہ ہے کہ جانی جی نے غالب کا دیوان اپنے آدمی کے ہاتھ جے پور بھیجا - مینڈھو لال نے راجہ کے پاس شکایت کی کہ ہردیوسنگھ جانی جی اور غالب کا دیوان پیش کر کے جانی جی کے لیے جے پور میں ملازمت کا بندوبست کرانا چاہتا ہے - غالب کو معلوم ہوا تو فوراً جانی جی کو لکھا کہ ہردیوسنگھ کو واپس بلا لو - میری خاطر اپنے معاملات کیوں خراب کرو - "کل امر" جانی جی کی ملازمت اور عزت تھی، "جزوی امر" غالب کے لیے مالی امداد کی سعی تھی لیکن جانی جی نے لکھا کہ راجہ ایسا نہ تھا اس لیے عرضی میرے پاس بھیج دی - اور وہی تحریر اب آپ کے (غالب) کے پاس بھیج رہا ہوں -

دوست کی تحریر ہے۔ ظاہراً اس کو بابو صاحب کا نام نہیں معلوم۔ ان کے بھائی کا نام یاد رہ گیا۔ صرف اس دوست نے بطریقِ اخبار لکھا ہے۔ اس کو میری اور جانی جی کی دوستی کا بھی معلوم نہیں۔ حاصل اس تحریر سے یہ ہے کہ اگر یہ خبر سچ ہے تو ہمارے دوست کا نام بنا رہے گا۔ آمین یا رب العالمین

صاحب جے پور کا مقدمہ اب لائق اس کے نہیں ہے کہ اس کا خیال کریں۔ ایک بنا ڈالی تھی، وہ نہ اٹھی۔ راجا لڑکا ہے اور چھچھورا ہے۔ راول جی اور سعد اللہ خاں بنے رہتے تو کوئی صورت نکل آتی۔ اور یہ جواب آپ لکھتے ہیں کہ راجا تیرے دیوان کو بڑھا کرتا ہے اور پیشِ نظر رکھتا ہے، یہ بھی تو آپ از روئے تحریر منشی ہردیو سنگھ کہتے ہیں۔ اُن کا بیان کیونکر دل نشین ہو؟ وہ بھی جو بابو صاحب لکھ چکے ہیں کہ پانسو روپے نقد اور خلعت مرزا صاحب کے واسطے تجویز ہو چکا ہے، ہولی ہو چکی اور میں لے کر چلا۔ پھاگن، چیت، بیساکھ، نہیں معلوم ہولی کس مہینے میں ہوتی ہے۔ آگے تو پھاگن میں ہوتی تھی۔

بندہ پرور، بابو صاحب نے پہلی بار تو مجھ کو دو ہنڈویاں بھیجی ہیں، سو سو روپے کی۔ ایک تو میر احمد حسین میکش کے واسطے راجا صاحب کی طرف سے تاریخ تولد کنور صاحب کے انعام میں اور ایک اپنی طرف سے مجھ کو بطریقِ نذرِ شاگردی۔ بعد اس کے دو ہنڈویاں سو سو روپے کی بعد چار چار، پانچ پانچ مہینے کے آئیں، مع میر احمد حسین کے صلے کے روپیوں کے۔ چار سو اور اس سے علاوہ تین سو، اور یہ کہ چار سو یا تین سو کتنے دن میں آئے، اس کا حساب کنور صاحب کی عمر پر حوالے ہے۔ اگر وہ دو برس کے ہیں تو دو برس ہیں اور اگر تین برس کے ہیں تو تین برس ہیں۔

ہاں صاحب، یہ وہی میر قاسم علی صاحب ہیں، جو میرے پُرانے دوست ہیں۔ پرسوں یا اترسوں جو ڈاک کا ہرکارہ تمھارا خط لایا تھا، وہ ایک خط میر صاحب کے

نام کا، کوئی میاں حکمت اللہ ہیں، ان کا میرے مکان کے پتے سے لایا تھا۔ وہ میں نے لے کر رکھ لیا ہے۔ جب میر صاحب آجاویں تو ان کو میرا سلام کہنا اور کہنا کہ حضرت، اگر میرے واسطے نہیں، تو اس خط کے واسطے آپ دلی آئیے۔

غالب

(۱۴)

بھائی،

تم نے مجھے کونسا دو چار سو روپے کا نوکر یا پنشن دار قرار دیا ہے جو دس بیس روپے مہینہ قسط کی آرزو رکھتے ہو۔ تمھاری باتوں پر کبھی کبھی ہنسی آتی ہے۔ اگر احیاناً تم کبھی دہلی کے ڈپٹی کلکٹر یا وکیل کمپنی ہوتے، تو مجھ کو بڑی مشکل پڑتی۔ بہرحال خوش رہو اور متفکر نہ ہو۔ پانچ روپے مہینہ پنشن انگریزی میں سے قسط مقرر ہو گیا تا ادائے زر۔ ابتدائے جون ۱۸۵۳ء یعنی ماہ آیندہ میں سے یہ قسط جاری ہو گی[1]۔

بابو صاحب کا خط تمھارے نام کا پہنچا۔ عجب تماشا ہے۔ وہ روپیہ نہ پہنچنے کے ہونے سے خجل ہوتے ہیں اور میں ان کے عذر چاہنے سے مرا جاتا ہوں۔ ہائے اتفاق، آج میں نے ان کو لکھا اور کل راجہ کے مرنے کی خبر سُنی۔ واللہ باللہ اگر دو دن پہلے خبر سُن لیتا تو اگر میری جان پر آبنتی تو بھی ان کو نہ لکھتا۔ جے پور کے آئے ہُوئے روپے کی ہنڈوی اس وقت تک نہیں آئی۔ شاید آج شام تک یا کل تک آجائے۔ خدا کرے وہ آبو پہاڑ سے ہنڈوی روانہ کر دیں، ورنہ پھر خدا جانے، کہاں کہاں جائیں گے اور روپیہ بھیجنے میں کتنی دیر ہو جائے گی۔ خدا کرے زرِ مصارف ہردیو سنگھ اسی میں سے مجرا لیں، میری کمال خوشی ہے۔ اور یہ نہ ہو تو ۲۵ روپے ہردیو سنگھ کو میری طرف سے ضرور دیں۔ منشی[2] صاحب کا ایک خط

---

[1] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب نے کچھ روپیہ تفتہ سے یا تفتہ کے ذریعہ سے قرض لیا تھا۔

[2] منشی صاحب سے مراد غالباً منشی نبی بخش حقیر ہیں۔

ہاترس سے آیا تھا۔ کل اس کا جواب ہاترس روانہ کر چکا ہوں۔ والدعا

محررہ دوشنبہ ۲۳ مئی ۱۸۵۳ء اسد اللہ

(۱۵)

عجب تماشا ہے۔ بابو صاحب لکھتے ہیں کہ ہر دیو سنگھ آگیا اور پانسو روپے کی ہنڈوی لایا۔ مگر اس کے مصارف کی بابت انیس روپے کئی آنے اس ہنڈوی میں محسوب ہو گئے۔ سو میں اپنے پاس سے ملا کر پورے پانسو کی ہنڈوی تجھ کو بھیجتا ہوں میں نے ان کو لکھا کہ مصارف ہر دیو سنگھ کے میں مجرا دوں گا۔ تکلیف نہ کرو "پچیس" یہ میری طرف سے ہر دیو سنگھ کو اور دے دو اور باقی کچھ کم ساڑھے چار سو کی ہنڈوی جلد روانہ کرو۔ سو بھائی آج تک ہنڈوی نہیں آئی۔ میں حیران ہوں۔ وجہ حیرانی کی یہ کہ اس ہنڈوی کے بھروسے پر قرضداروں سے وعدہ جون کے اوائل کا کیا تھا۔ آج جون کی پانچویں ہے، وہ تقاضا کرتے ہیں اور میں آج کل کر رہا ہوں۔ شرم کے مارے بابو صاحب کو کچھ نہیں لکھ سکتا۔ جانتا ہوں کہ وہ سبکدوش ہو کر پورا کرنے کی فکر میں ہوں گے۔ پھر وہ کیوں اتنا تکلف کریں؟ تیس روپے کی کون سی ایسی بات ہے؟ اگر مصارف ہر دیو سنگھ میرے ہاں سے مجرا ہوئے، تو کیا غضب ہوا۔ انتیس اور پچیس چون روپیہ نکال ڈالیں اور باقی ارسال کریں۔ لفافے خطوط کے جو میں نے بھیجے تھے، وہ بھی ابھی نہیں آئے۔ باایں ہمہ یہ کیسی بات ہے کہ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ بابو صاحب کہاں ہیں؟ پہاڑ پر ہیں یا بھرت پور آئے ہیں؟ اجمیر آنے کی ظاہرا کوئی وجہ نہیں ہے۔ ناچار کثرت انتظار سے عاجز آ کر آج تم کو لکھا ہے۔ تم اس کا جواب مجھ کو لکھو اور اپنی رائے لکھو کہ وجہ درنگ کی کیا ہے؟ زیادہ زیادہ۔

مرقومہ پنجم جون ۱۸۵۳ء روز پنجشنبہ جواب طلب اسد اللہ

(۱۶)

تمھاری خیر و عافیت معلوم ہوئی۔ غزل نے محنت کم لی۔ بھائی[1] کا ہاتھ بس سے آنا معلوم ہوا۔ آویں تو میرا سلام کہہ دینا۔

یہ تمھارا دعا گو اگرچہ اور امور میں پایہ عالی نہیں رکھتا، مگر احتیاج میں اس کا پایہ بہت عالی ہے۔ یعنی بہت محتاج ہوں۔ سو دو سو میں میری پیاس نہیں بجھتی۔ تمھاری ہمت پر سو ہزار آفرین۔ جے پور سے اگر مجھ کو دو ہزار ہاتھ آجاتے تو میرا قرض رفع ہو جاتا اور پھر اگر دو چار برس کی زندگی ہوتی، تو اتنا ہی قرض اور مل جاتا۔ یہ پانسو تو بھائی تمھاری جان کی قسم متفرقات میں جا کر سو ڈیڑھ سو بچ رہیں گے۔ سو وہ میرے صرف میں آئیں گے۔ مہاجنوں کا سودی جو قرض ہے وہ بقدر پندرہ سولہ سے کے باقی رہے گا اور وہ جو سو بابو صاحب سے منگوائے گئے تھے، وہ صرف انگریز سوداگر کے دینے تھے قیمت اس چیز کی، جو ہمارے مذہب میں حرام اور تمھارے مشرب میں حلال[2] ہے۔ سو وہ دیے گئے۔ یقین ہے کہ آج کل میں بابو صاحب کا خط معہ ہنڈوی آجائے۔ بابو صاحب کے جو خطوط ضروری اور کاغذ ضروری میرے پاس آئے ہوئے تھے، وہ میں نے پنجشنبہ ۲۶ مئی کو پارسل میں ان کے پاس روانہ کر دیئے اور اس میں بھی لکھ بھیجا کہ ہنڈوی اور میرے بھیجے ہوئے لفافے جلد بھیج دو۔ پنجشنبہ ۱۵ دن آج پورے ہوئے۔

نگاشتہ پنجشنبہ نہم جون ۱۸۵۳ء از اسد اللہ

(۱۷)

بھائی،

جس دن تم کو خط بھیجا، تیسرے دن ہر دیو سنگھ کی عرضی اور پچیس روپے کی رسید

۱۔ منشی نبی بخش حقیر ۲۔ یعنی شراب

اور پانسو کی ہنڈوی پہنچی - تم سمجھے ؟ بابو صاحب نے پچیس روپے ہردیو سنگھ کو دیے اور مجھ سے مجرا نہ لیے - بہر حال ہنڈوی بارہ دن کی میعادی تھی چھ دن گزر گئے تھے۔ چھ دن باقی تھے - مجھ کو صبر کہاں ؟ متی کاٹ کر روپے لے لیے - قرض متفرق سب ادا ہوا - بہت سبکدوش ہوگیا - آج میرے پاس ۷۰ نقد بکس میں اور چار بوتل شراب اور تین شیشے گلاب کے توشہ خانے میں موجود ہیں - الحمد للہ علیٰ احسانہٗ -

بھائی صاحب آ گئے ہوں تو میر قاسم علی خاں کا خط ان کو دے دو اور میرا سلام کہو اور پھر مجھ کو لکھو تاکہ میں ان کو خط لکھوں - بابو صاحب بھرت پور آ جائیں تو آپ کاہلی نہ کیجے گا اور ان کے پاس جائیے گا کہ وہ تمھارے جویاے دیدار ہیں -

سہ شنبہ ۲۴ رجب ۱۸۵۳ء اسد اللہ

(۱۸)

بھائی ،

میں نے مانا تمھاری شاعری کو ، میں جانتا ہوں کہ کوئی دم تم کو فکر سخن سے فرصت نہ ہوگی - پر جو تم نے التزام کیا ہے ترصیع کی صنعت کا اور دو لخت شعر لکھنے کا اس میں ضرور نشست معنی بھی ملحوظ رکھا کرو اور جو کچھ لکھو اس کو دوبارہ سہ بارہ دیکھا کرو - کیوں صاحب ، یہ ڈبل خط پوسٹ پیڈ بھیجنا اور وہ بھی دلّی سے سکندر آباد کو ، آیا حاتم کے سوا اور میرے سوا کسی نے کیا ہوگا ؟ کیا ہنسی آتی ہے تمھاری باتوں پر ، خدا تم کو جیتا رکھے اور جو کچھ تم چاہو تم کو دے - جانی جی کی بڑی فکر ہے - میں تم کو لکھا چاہتا تھا کہ ان کا حال لکھو - تمھارے خط سے معلوم ہوا کہ تم کو بھی نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہیں - یقین ہے کہ وہ اجمیر میں ہوں گے ، مگر خط نہیں بھیجا جاتا کہ وہاں مقیم نہیں ہیں - خدا جانے کب چل نکلیں - بہر حال تم بھرت پور کے قریب ہو اور ان کے متوسلوں کو جانتے ہو اور اگر ہو سکے تو کسی کو لکھ کر خبر منگوا

لو اور جو کچھ تم کو معلوم ہو وہ بھی مجھ کو لکھو۔ منشی صاحب مع منشی عبد اللطیف کول میں آ گئے۔ کل ان کا خط مجھ کو آیا تھا۔ آج اس کا جواب بھی روانہ کر دیا

یکشنبہ ۲۱ اگست ۱۸۵۳ء اسد اللہ

(۱۹)

صاحب:

دوسرا پارسل جس کو تم نے بہ تکلف خط بنا کر بھیجا ہے، پہنچا۔ نہ اصلاح کو جگہ، نہ تحریر سطور کا پیچ و تاب سمجھ میں آتا ہے۔ تم نے الگ الگ دو ورقے پر کیوں نہ لکھا اور چھدرا چھدرا کیوں نہ لکھا؟ ایک آدھ دو ورقہ زیادہ ہو جاتا تو ہو جاتا۔ بہ ہر حال اب مجھے چُننے پڑے ہیں سوالات۔ اگر کوئی سوال میری نظر نہ چڑھے اور رہ جائے تو سطور کی موڑ توڑ کا گناہ سمجھنا، میرا قصور نہ جاننا۔

"بلا رباے" اس میں تامل کیا ہے؟ لفظ صحیح اور پورا تو یہی ہے "رُبا" اس کا مخفف ہے ۱۲ خار رہ ادرر اہش افشانم کہ چوں خواہد شدن ۱۲

بہت خوب او معقول۔ میں اس وقت خدا جانے کس خیال میں تھا۔ "چوں خواہد شدن" و "کنوں خواہد شدن" ردیف قافیہ سمجھا تھا۔

لفظ "بے پیر" تو زانی بچہ ہاے ہندی نژاد کا تراشا ہوا ہے۔ جب اشعار اردو میں اپنے شاگردوں کو نہیں باندھنے دیتا تو تم کو فارسی شعر میں کیونکر اجازت دوں گا۔

میرزا جلال اسیر علیہ الرحمۃ مختار ہیں اور ان کا کلام سند ہے۔ میری کیا مجال ہے کہ ان کے باندھے ہوئے لفظ کو غلط کہوں؟ لیکن تعجب ہے اور بہت تعجب ہے کہ امیر زادۂ ایران ایسا لفظ لکھے ۱۲

"شست بستن" جب ظہوری کے ہاں ہے تو باندھیے۔ یہ روزمرہ ہے اور

ا؎ ابن نبی بخش حقیر۔

ہم روزمرہ میں ان کے پیرو ہیں۔ "بے پیر" ایک لفظ ٹکسال باہر ہے ورنہ جب
زبان ہونے میں اسیر بھی ظہوری سے کم نہیں ہوا

زاہدا ایں سخنت ہرزہ کہ گفتی چہ شدی
حق غفور ست گناہے شدہ ام تا چہ شود

پہلے زاہد سے یہ سوال غلط کہ "چہ شدی" "تا چہ شد" سوال ہو سکتا ہے۔ پھر "گناہے شدہ ام" یہ جواب مہمل۔ "گناہے کردہ ام" جواب ہو سکتا ہے۔ یہاں تم کہو گے "ہمہ تن گناہ" یا "سراپا گناہ" یا "سراسر گناہ شدہ ام" یہ جواب اس جواب سے سراسر بے ربط ہے۔ جب تک ہمہ تن گناہ نہ ہو تا معنی نہیں بنتے۔ ہرگز ہرگز اصلاح دیے ہوئے شعر میں مضمون تمہارا ہی رہا اور ٹکسال کے موافق ہو گیا۔ عجب ہے تم سے کہ صرف "شدہ ام" اور "تا چہ شود" کے پیوند میں اُلجھ کر حقیقتِ معنی سے غافل رہے:

باز آر دلِ خود از چنیں کار   آزار چہ می کنی دلم را

اہلی نے زبردستی کی ہے مگر ہاں اس نے ایک وجہ ٹھہرالی ہے یعنی "آزردن" مصدر اور "آزرد" مضارع اور "آزار" امر۔ امر بمعنی اسم جامد آتا ہے اور اسم جامد "کردن" کے ساتھ پیوند پاتا ہے۔ خیر رہنے دو۔

کند آں آہوے وحشی ز برم فردارم

یہ شعر مویدِ میرے کلام کا ہے "بردارم" و "ردارم" و "سردارم" و "فرداارم" یہ سب الفاظ ایک طرح کے ہیں۔ الف ممدودہ کہیں نہیں۔ ہاں "بودارد و رد وارد" و "فرود آرد" تمہارے عقیدے کی تائید کرتا ہے۔ مگر یہ شعر استاد کا نہیں۔ مشائخ میں سے ایک بزرگ تھے مولانا علاؤ الدین:

ما مقیمانِ کوے دلدار یم

یہ ترجیع بند انھیں کا ہے۔ ان کو فقر و فنا و سلوک ہیں (سند) سمجھنا چاہیے نہ انداز کلام میں :   "پر مو راست شمشیرے کہ بر موے میاں دارد"

بھائی ، خدا کی قسم یہ مصرع تلوار کی نازکی کی سند نہیں ہو سکتا۔ یہ تو ایک مضمون ہے کمر "مو" اور تلوار "پُر مو"۔ وجہ تشبیہ علاقۂ پر مو با مو مانند علاقۂ شمشیر با میاں۔ نزاکت وجہ تشبیہ کبھی نہیں، انصاف شرط ہے۔ تلوار کی خوبی "تیزی" ہے یا "نازکی"؟ یہ دھوکا نہ کھاؤ اور تلوار کو نازک نہ باندھو۔ "خو" میں اور "تلوار" میں مناسبت نہیں پائی جاتی۔ جانے دو۔ شعر سے ہاتھ اُٹھاؤ ۱۲

میاں "خمیدن" بھی صحیح اور "چمیدن" بھی صحیح۔ اس میں کس کو تردّد ہے: مگر لغت اور محاورے اور اصطلاح میں قیاس پیش نہیں جاتا۔ ہندوستان کے باتوفی لوگوں کو خم و چم بولتے سُنا ہے۔ آج تک کسی نظم و نثر فارسی میں یہ لفظ نہیں دیکھا۔ لفظ پیارا، مجھ کو بھی پسند، مگر کیا کروں جو اپنے پیشواؤں سے نہ سُنا ہو، اس کو کیوں کر صحیح جانوں؟ "چمید" صیغہ ماضی کا ہے "چمیدن" سے اور "چمیدن" ایک مصدر ہے صحیح اور مسلّم۔ "چمد" مضارع "چم" امر۔ اس میں کیا گفتگو ہے۔ کلام "خم و چم" میں ہے۔

سوالات ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کا جواب لکھ دیا۔ اب اشعار کو دیکھتا ہوں۔ خدا کرے مجھ سے کوئی سوال باقی نہ رہ گیا ہو اور تم بھی جب ان اوراق طلسمی کو دیکھو تو کوئی اصلاح کا اشارہ تم سے باقی نہ رہ جائے۔ غرض یہ ہے کہ اب پھر اس طرح کبھی نہ لکھنا۔ میں بہت گھبراتا ہوں۔ "خمیدست" و "رسیدست" میں "نرفی دست" یہ قافیہ درست ہے۔ مگر "است" کا الف سب جگہ اڑا دو اور یاد رہے کہ سین تے کافی ہے الف ضرور نہیں۔

غالب

(۲۰)

تمہارا خط پہنچا۔ مجھ کو بہت رنج ہوا۔ واقعی اُن چھوٹے لڑکوں کا پالنا بہت دشوار ہوگا۔ دیکھو میں بھی تو اسی آفت میں گرفتار ہوں۔ صبر کرو اور صبر نہ کروگے تو کیا کروگے۔ کچھ بن نہیں آتی۔ میں مسہل میں ہوں۔ یہ نہ سمجھنا کہ بیمار ہوں۔ حفظ صحت کے واسطے مسہل لیا ہے۔ تمہارے اشعار غور سے دیکھ کر بھائی منشی نبی بخش صاحب کے پاس لفافہ تمہارے نام کا بھیج دیا ہے۔ جب تم آؤ گے تب تم کو دیں گے جہاں جہاں تردد و تامل کی جگہ تھی وہ ظاہر کردی ہے اور باقی سب اشعار بدستور رہنے دیے ہیں۔ اب تم کو چاہیے کہ کول پہنچ کر مجھ کو خط لکھو۔ اس لفافے کی رسید اور اپنا سارا حال مفصل لکھو۔ اس سے زیادہ کیا لکھوں۔ اسد اللہ

(۲۱)

واہ، کیا خوبی قسمت ہے میری! بہت دن سے دھیان لگا ہوا تھا کہ اب منشی جی کا خط آتا ہے اور ان کی خیر و عافیت معلوم ہوتی ہے۔ خط آیا اور خیر و عافیت معلوم نہ ہوئی یعنی معلوم ہوا کہ خیر نہیں ہے اور پاؤں میں چوٹ لگی ہے۔ سُنو صاحب، یہ بھی غنیمت ہے کہ ہڈی کو صدمہ نہیں پہنچا۔ اتنا پھیلاؤ بھی اس سبب سے ہوا کہ کوئی مالش کرنے والا نہ ملا اور چوٹ کہنہ ہوگئی۔ البتہ کچھ دیر میں افاقت ہوگی بعد افاقت ہونے کے تم مجھ کو اطلاع کرنے میں دیر نہ کرنا۔ میرا دھیان لگا ہوا ہے۔

بابو صاحب کا خط آیا تھا پھر انھوں نے تکلیف کی اور وہ کچھ بھیجا جو آگے بھیجا تھا۔ تمہاری مفارقت سے بہت ملول ہیں۔ طرز تحریر سے فراوانی محبت معلوم ہوتی تھی۔ میں نے اُن کو لکھ بھیجا ہے کہ منشی جی گئے نہیں۔ ضرورت کو کیا کریں؟ جلد پھر آئیں گے۔ آپ ان کو اپنے پاس تصور فرمائیے۔

بابو ہرگوبند سنگھ تعطیل میں کول گئے ہوں گے جو آپ کے خط میں ان کی بندگی

لکھی آئی۔ کیوں اُنھوں نے تکلیف کی؟ بہمہ جہت دو سو قدم پر میرے گھر سے ان کا مکان، اور وہ جاتے وقت مجھ سے رخصت نہ ہوگئے۔ اب بندگی سلام کیا ضرور؟

ہاں صاحب یہ تم نے اور بابو صاحب نے کیا سمجھا ہے کہ میرے خط کے سرنامے پر املی کے محلے کا پتہ لکھتے ہو۔ میں بلی ماراں میں رہتا ہوں، املی کا محلہ یہاں سے بے مبالغہ آدھ کوس ہے۔ وہ تو ڈاک کے ہرکارے مجھ کو جانتے ہیں ورنہ خط ہرزہ پھرا کرے۔ آگے کالے صاحب کے مکان میں رہتا تھا، اب بلی ماراں میں کرایے کی حویلی میں رہتا ہوں۔ املی کا محلہ کہاں اور میں کہاں؟

منشی جی کو لکھتے ہو کہ حاکم کے ساتھ گئے ہیں اور پھر لکھتے ہو کہ نہ دورے میں بلکہ اپنے کام کو۔ بہ ہر صورت اب آ گئے ہوں گے۔ میرا سلام کہیے گا اور اپنی خیر و عافیت کے ساتھ اُن کی معاودت کی خبر لکھیے گا، ورنہ مجھ کو خط لکھنے میں تامل رہے گا

"نظر شگفتن" و "گوش شگفتن" ہم نہیں جانتے، اگرچہ منشی ہرگوپال تفتہ اور مولانا نور الدین ظہوری نے لکھا ہو:

نظارہ را ز خون دلم گل در آستین ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ خوش مگو، بگو کہ ز چشمم چمن چکید

یہ نہ سمجھنا کہ چمن از چشم چکیدن شگفتن گوش و نظر کی مانند غرابت رکھتا ہے۔ یہ خونفشانی چشم کا استعارہ ہے اور خونفشانی صفت چشم ہو سکتی ہے۔ اگر نظر کا خوش ہونا اور کان کا شاد ہونا جائز ہوتا تو ہم اس کا استعارہ شگفتگی کر لیتے۔ خوش ہونا جب صفت چشم و گوش نہ ہو تو ہم کیا کریں۔

یاد رہے یہ نکات سوائے تمھارے اور کو میں نہیں بتاتا۔ میری بات کو غور کر کے سمجھ لیا کرو۔ میں پوچھنے سے اور تکرار سے ناخوش نہیں ہوتا، بلکہ خوش ہوتا ہوں۔ مگر ہاں ایسی تکرار جیسی بیش اور بیشتر کے باب میں کی تھی، ناگوار گزرتی ہے کہ وہ صریح تہمت تھی مجھ پر۔ جو میں آپ لکھوں گا، تم کو اس کے لکھنے سے کیوں منع کروں گا:

اے صد ہزار راز نہاں اندریں سخن | گو کم سخن تو ئی نگہت کم سخن مباد
ہر چہ با نفس خود کنم نہ بدی | نیکیش نام مے تو انم کرد

یہ دونوں شعر بے سقم ہیں، رہنے دو۔

مرزا کا ہیم سلامت باد | کام را کام مے توانم کرد

میں نہیں سمجھا کہ اس کے معنی کیا ہیں۔ کام کو کام سب کہ سکتے ہیں۔ اس میں لطف کیا ہے؟ ز تیر کتا ز ہئی، آں نازنیں سوار ہنوز

ز سبزہ سیاہ در انگشت زینہار ہنوز

حزیں[۱] کے اس مطلع میں واقعی ایک ہنوز زائد اور بے ہودہ ہے۔ تتبع کے واسطے سند نہیں ہو سکتا۔ یہ غلط محض ہے، یہ سقم ہے، یہ عیب ہے، اس کی کون پیروی کرے گا؟ حزیں تو آدمی تھا، یہ مطلع اگر جبریل کا ہو، تو اس کو سند نہ جانو اور اس کی پیروی نہ کرو۔

بھائی تمہارا مصرع اس قبیل سے نہیں ہے۔ اس میں تو مکنید متمم معنی ہے "در مکنید" زائد نہیں ہے۔ مگر خرابی یہ ہے کہ فارسی رہنے دو تو اور اگر ہندی کرو تو مصرع مہمل اور بے معنی ہے:

چہ گل چہ لالہ چہ نسریں چہ نسترن مکنید

کیا گلاب کا پھول، کیا لالہ، کیا موتیا، کیا چمپا نہ کرو، زنہار نہ کرو، یعنی کیا نہ کرو؟

---

[۱] علی نام حزیں تخلص بڑے اونچے خاندان میں سے تھے۔ اصفہان میں پیدا ہوئے۔ جب افغان اصفہان پر مسلط ہوئے اور صفوی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا تو وہاں سے نکلے۔ جب نادر شاہ ایران پر مسلط ہو گیا تو سندھ کے راستے ہندوستان چلے آئے۔ ملتان، لاہور، دہلی اور آگرہ ہوتے ہوئے بنارس پہنچے اور وہیں رخت اقامت ڈال دیا۔ تھوڑی مدت کے لیے عظیم آباد (پٹنہ) گئے تھے۔ بنارس ہی میں فوت ہوئے۔ آخری دور کے بلند مرتبہ شاعر مانے جاتے تھے۔

اب جب تمہیں کہو کہ صاحب ذکر نہ کرو، تب کوئی جانے، ورنہ کبھی جانا نہیں جاتا۔ کہ ذکر نہ کرو۔ اے، تم نے کہا بھی کہ ہمارا مقصود یہ ہے کہ ذکر نہ کرو، حضرت ذکر مضاف کیونکر ہو سکتا ہے گل و لالہ و نسرین و نسترن کی طرف؟ کہو گے کہ ذکر کا لفظ نہیں، بیان کا لفظ اُوپر کے مصرع میں ہے۔ وہ بیان کا لفظ رسول سے اور زنجیروں سے ان چاروں لفظوں سے ربط نہیں پاتا۔ مطلع لکھو، قطعہ لکھو، ترجیع بند لکھو، یہ مصرع معنی دینے ہی کا نہیں۔ مہمل محض ہے۔ والسلام

اسد اللہ

(۲۲)

دیکھو صاحب، پھر تم دنگا کرتے ہو۔ وہی "بیش و بیشتر" کا قصہ نکلا غلطی میں جمہور کی پیروی کیا فرض ہے؟ یاد رکھو یائے تحتانی تین طرح پر ہے۔

جزو کلمہ:

مصرع: ہمائے بر سر مرغاں ازاں شرف دارد

مصرع: اے سر نامہ نام تو عقل گرہ کشائے را

یہ ساری غزل اور مثل اس کے جہاں یائے تحتانی ہے جزو کلمہ ہے، اس پر ہمزہ لکھنا گویا عقل کو گالی دینا ہے۔

دوسری تحتانی مضاف ہے۔ صرف اضافت کا کسرہ ہے۔ ہمزہ وہاں بھی مخل ہے۔ جیسے آسیائے چرخ، بآشنائے قدیم۔ توصیفی، اضافی، بیانی کسی طرح کا کسرہ ہو، ہمزہ نہیں چاہتا۔ "فدائے تو شوم" "رہنمائے تو شوم" یہ بھی اسی قبیل ہے۔

تیسری دو طرح پر ہے، یائے مصدری اور وہ معروف ہوگی۔ دوسری طرح توحید و تنکیر، وہ مجہول ہوگی۔ مثلاً مصدری: "آشنائی"۔ یہاں ہمزہ ضرور، بلکہ ہمزہ

نہ لکھنا عقل کا قصور۔ توحیدی "آشنائے" یعنی ایک آشنا یا کوئی آشنا۔ یہاں جب تک ہمزہ نہ لکھو گے، دانا نہ کہاؤ گے ۱۲

"نیم گناہ" و "نیم نگاہ" و "نیم ناز" یہ روزمرہ اہلِ زبان ہے۔ نیم بمعنی اندک۔ ورنہ گناہ کا آدھا اور نگاہ کا ادھواڑ اور ناز آدھا، یہ مہملات میں ہے۔ ان چیزوں کا مناصفہ کیا؟ اگر تم کو "نیم گناہ" پسند نہیں "تازہ گناہ" رہنے دو۔

"خستہ"، "بستہ"، "تازہ"، "غازہ"، "خانہ"، "دانہ"، "آوارہ"، "بیچارہ"، "روزہ"، "بوزہ" ہزار لفظ ہیں کہ ان کے آگے جب یائے توحید آتی ہے، تو اس کی علامت کے واسطے ہمزہ لکھ دیتے ہیں۔ "زرہ"، "گرہ"، "کلاہ"، "شاہ"، "آگاہ"، "آگہہ"، "صبحگاہ"، "صبحگہ" ایسے الفاظ کے آگے تحتانی آتی ہے تو "زرہے"، "گرہے"، "کلاہے"، "شاہے"، "آگاہے"، "آگہے"، "گاہے"، "گہے" لکھ دیتے ہیں ۱۲

غالب

(۲۳)

"بدمست" یہ لفظ نیا بنایا ہے۔ مقصود تمہارا تو میں نے سمجھ لیا، مگر زنہار اور کوئی نہ سمجھے گا "المعنی فی بطن القائل" کے یہی معنی ہیں "چشمانِ پرخمار" و "چشمانِ بے حیا" ان دونوں ترکیبوں میں سے ایک لکھ لو۔ ان سب اشعار میں نہ عیب، نہ لطف۔

دیکھو صاحب خط میں تم پھر وہی "بیش و بیشتر" کا قصہ لائے ہو۔ "چہ جرم" و "چہ سبب" و "چہ گناہ" پر جو سند لاتے ہو:

عشق است و صد ہزار تمنا مرا چہ جرم

اس کی حاجت کیا ہے؟ "جاناں مددے"، "یاراں مددے"۔ یہ تمام غزل اسی طرح کی ہے۔ اگر یہ ترکیب درست نہ ہوتی، تو میں ساری غزل کیوں نہ کاٹ

ڈالتا؟ دیکھو رفیع السودا کہتا ہے:

نہ ضرر کفر کو، نے دین کو نقصاں مجھ سے باعثِ دشمنی، اے گبر و مسلماں مجھ سے[1]

غالب کہتا ہے:

مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ مِلا نہ دیا ہو شراب میں

یعنی "اب جو دو مجھ تک آیا ہے، تو میں ڈرتا ہوں" یہ جملہ سارا مقدر ہے۔ میرا فارسی کا دیوان جو دیکھے گا وہ جانے گا کہ جملے کے جملے مقدر چھوڑ جاتا ہوں۔ مگر

ہر سخن وقتے و ہر نکتہ مکانے دارد

یہ فرق البتہ وجدانی ہے، بیانی نہیں[2]۔

اگر دریافتی بردانشت بوس وگر غافل شدی افسوس افسوس

روز جمعہ ۱۳ر جنوری ۱۸۵۴ء ازاسداللہ

(۲۴)

بندہ پرور،

ایک مہربانی نامہ سکندر آباد سے، اور ایک علی گڑھ سے پہنچا۔ یقین ہے کہ بابو صاحب تمھارے خط کے جواب میں کچھ حال لکھیں گے اور تم موافق اپنے وعدہ کے مجھ کو لکھو گے۔ اب جب اس خط کا جواب تمھارے پاس سے آئے گا۔ تب تمھارے اشعار تم کو پہنچیں گے۔ ہاے ہاے! میر تفضل حسین خاں، ہاے ہاے:

---

[1] یعنی جب دین کفر کو مجھ سے کوئی نقصان پہنچنے کا امکان نہیں تو پھر اے مسلمانو اور غیر مسلمو، میرے ساتھ تم لوگوں کی دشمنی کا سبب کیا ہے؟

[2] یعنی اس فرق کو بیان کے ذریعے سے سمجھانا یا بیان میں لانا مشکل ہے، یہ انسان کے ذوق و وجدان پر موقوف ہے۔

رفتی و مرا خبر نہ کردی بو بیکسیم نظر نہ کردی

یہاں سُنا گیا ہے کہ میر احمد حسین، بڑا بیٹا اُن کا اُن کے کام پر مقرر ہوا اور میر ارشاد حسین بدستور نائب رہے۔

۲۳ فروری ۱۸۵۴ء اسد اللہ

(۲۵)

منشی صاحب،

تمہارا خط اس دن، یعنی کل بدھ کے دن پہنچا کہ میں چار دن سے لرزے میں مبتلا ہوں، اور مزہ یہ ہے کہ جس دن سے لرزہ چڑھا ہے، کھانا مطلق میں نے نہیں کھایا۔ آج پنجشنبہ پانچواں دن ہے کہ نہ کھانا دن کو میسر ہے اور نہ رات کو شراب۔ حرارت مزاج میں بہت۔ بے ناچار احتراز کرتا ہوں۔ بھائی، اس لطف کو دیکھو کہ پانچواں دن ہے کھانا کھائے، ہرگز بھوک نہیں لگی اور طبیعت غذا کی طرف متوجہ نہیں ہوئی۔ بابو صاحب والامناقب کا خط تمہارے نام کا دیکھا۔ اب اس دو سال میں وہ آسانی نہ رہی اور بندہ دشواری سے بھاگتا ہے۔ کیوں تکلیف کریں؟ اور اگر بہرحال ان کی مرضی ہے تو خیر میں فرمان پذیر ہوں۔ اشعار سابق و حال میرے پاس امانت ہیں۔ بعد اچھے ہونے کے ان کو دیکھوں گا اور تم کو بھیج دوں گا۔ اتنی سطریں مجھ سے بہ ہزار جبر ثقیل لکھی گئی ہیں۔

روز پنج شنبہ ۲ مارچ ۱۸۵۴ء اسد اللہ

(۲۶)

میرا سلام پہنچے۔ خط اور کاغذ اشعار پہنچا۔ سابق اور حال ابھی سب یوں ہی دھرے رہیں گے۔ اگرچہ گرمی رفع ہو گئی ہے، مینہ برسنے لگا، ہوا سرد چلنے لگی، مگر دل مکدر ہے اور حواس ٹھکانے نہیں۔ بادشاہ کا قصیدہ سارا اور ولیعہد کا قصیدہ بے خاتمہ آگے سے کہہ رکھا تھا۔ اس کا خاتمہ پرسوں یا اترسوں بھیجوں گا

ان سے لے کر تم بھی دیکھنا۔ میں نے ان کو لکھ بھیجا ہے کہ منشی ہرگوپال صاحب کو بھی دینا کہ وہ پڑھ لیں اور چاہیں تو نقل بھی لے لیں۔ اس کے سوا اور جو کچھ تمہارے خط میں لکھا تھا، وہ جواب طلب نہیں اور یوں ہی ہے جو تم سمجھے ہو۔ اسد اللہ

(۲۷)

صاحب،

دیباچہ و تقریظ کا لکھنا ایسا آسان نہیں ہے کہ جیسا تم کو دیوان کا لکھ لینا۔ کیوں روپیہ خراب کرتے ہو اور کیوں چھپواتے ہو؟ اور اگر یوں ہی جی چاہتا ہے تو ابھی کہے جاؤ۔ آگے چل کر دیکھ لینا۔ اب یہ دیوان چھپوا کر اور تیسرے دیوان کی فکر میں پڑو گے۔ تم تو دو چار برس میں ایک دیوان کہہ لو گے، میں کہاں تک دیباچے لکھا کروں گا؟ مدعا یہ ہے کہ اس دیوان کو اُس دیوان کے برابر ہو لینے دو۔ اب کچھ قصیدہ و رباعی کی فکر کیا کرو۔ دو چار برس میں اس قسم سے جو کچھ فراہم ہو جائے، دوسرے دیوان میں اس کو بھی درج کرو۔

صاحب، جہاں تقطیع میں الف نہ سمائے، وہاں کیوں لکھو؟

اسد سنہ ۱۸۵۵ء

(۲۸)

صاحب!

تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا؟ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت درپیش آئے۔ شعر کہے۔ دیوان جمع کیے۔ اسی زمانے میں ایک بزرگ تھے کہ وہ ہمارے تمہارے دوست دلی تھے اور منشی نبی بخش اُن کا نام اور حقیر تخلص تھا۔ ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا، نہ وہ معاملات، نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط۔ بعد چند مدت

کہ پھر دُوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہٖ مثل پہلے جنم کے ہے یعنی ایک خط میں نے منشی نبی بخش صاحب کو بھیجا، اس کا جواب مجھ کو آیا اور ایک خط تمھارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال اور متخلص بہ تفتہ ہو، آج آیا۔ اور میں جس شہر میں ہوں اس کا نام بھی دلّی اور اس محلے کا نام بلّی ماروں کا محلہ ہے۔ لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔ واللہ ڈھونڈھنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امیر، کیا غریب، کیا اہلِ حرفہ اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔ اب پوچھو تو کیوں کر مسکنِ قدیم میں بیٹھا رہا؟ صاحب بندہ میں حکیم محمد حسن خاں مرحوم کے مکان میں نو دس برس سے کرایہ کو رہتا ہوں اور یہاں قریب کیا دیوار بہ دیوار ہیں گھر حکیموں کے اور وہ نوکر ہیں راجا نرندر سنگھ بہادر والیِ پٹیالہ کے۔ راجا صاحب نے صاحبانِ عالی شان[1] سے عہد لیا تھا کہ بہ وقتِ غارتِ دہلی یہ لوگ بچ رہیں۔ چنانچہ بعد فتح راجا کے سپاہی یہاں آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا، ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں؟ مبالغہ نہ جاننا، امیر غریب سب نکل گئے۔ جو رہ گئے تھے وہ نکالے گئے۔ جاگیردار، پنشن دار، دولت مند، اہلِ حرفہ، کوئی بھی نہیں ہے۔ مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمانِ قلعہ پر شدّت ہے اور باز پرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں، مگر وہ نوکر جو اس ہنگام[2] میں نوکر ہوئے ہیں اور ہنگامے میں شریک رہے ہیں۔ میں غریب شاعر، دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں۔ خواہی اس کو نوکری سمجھو، خواہی مزدوری جانو۔ اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں میں نے دخل نہیں دیا۔ صرف اشعار کی خدمت بجا لاتا رہا اور نظر اپنی بے گناہی

[1] انگریز

[2] یعنی انگریزوں کے خلاف ہنگامہ بپا رہنے کے دوران میں۔

پر شہر سے نکل نہیں گیا۔ میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے، مگر چونکہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات نہیں پائی گئی، لہذا طلبی نہیں ہوئی۔ ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں، میری کیا حقیقت تھی؟ غرض اپنے مکان میں بیٹھا ہوں دروازہ سے باہر نہیں نکل سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے، شہر میں ہے کون؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست[1] یازدہم مئی[2] سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال معلوم نہیں، بلکہ ہنوز ایسے امور کی طرف حکام کو توجہ بھی نہیں دیکھیے، انجام کار کیا ہوتا ہے۔ یہاں باہر سے اندر کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا۔ تم زنہار یہاں کا ارادہ نہ کرنا۔ ابھی دیکھا چاہیے مسلمانوں کی آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں۔ بہرحال منشی صاحب کو میرا سلام کہنا اور یہ خط دکھا دینا۔ اس وقت تمھارا خط پہنچا اور اسی وقت میں نے یہ خط لکھ کر ڈاک کے ہرکارے کو دے دیا۔

شنبہ ۵، دسمبر ۱۸۵۷ء

(۲۹)

آج سنیچر (بارہ) کو دوپہر کے وقت ڈاک کا ہرکارہ آیا اور تمھارا خط لایا۔ میں نے پڑھا اور جواب لکھا اور کلیان کو دیا۔ وہ ڈاک کو لے گیا۔ خدا چاہے تو کل پہنچ جائے۔ میں تم کو لکھ چکا ہوں کہ دلّی کا قصد کیوں کرو اور یہاں آکر کیا کرو گے؟ بنک گھر میں سے خدا کرے تمھارا روپیہ مل جائے۔ بھائی، میرا حال یہ ہے کہ دفتر شاہی میں میرا نام مندرج نہیں نکلا۔ کسی مخبر نے بہ نسبت میرے کوئی خبر بدخواہی کی نہیں دی۔ حکام وقت میرا شہر میں ہونا جانتے ہیں۔ فراری نہیں ہوں۔ روپوش نہیں

---

[1] مارشل لا کا نہایت عمدہ ترجمہ ہے [2] تاریخ ابتدائے ہنگامہ ۱۸۵۷ء

ہوں، بلایا نہیں گیا۔ دار و گیر سے محفوظ ہوں۔ کسی طرح کی باز پرس ہو تو بلایا جاؤں۔ مگر ہاں جیسا کہ بلایا نہیں گیا، خود بھی بروئے کار نہیں آیا۔ کسی حاکم کو نہیں ملا۔ خط کسی کو نہیں لکھا۔ کسی کو درخواست نہیں کی۔ مئی سے پنشن نہیں پایا۔ کہو، یہ دس مہینے کیوں کر گزرے ہوں گے۔ انجام کچھ نظر نہیں آتا کہ کیا ہوگا۔ زندہ ہوں، مگر زندگی وبال ہے۔ ہرگوبند سنگھ یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ایک بار میرے پاس بھی آئے تھے۔ والدعا

غالب

روز شنبہ سی ام جنوری ۱۸۵۸ء وقت نیمروز

(۳۰)

از عمر و دولت برخوردار باشند۔

بدھ کا دن، تیسری تاریخ فروری کی، ڈیڑھ پہر دن باقی رہے ڈاک کا ہرکارہ آیا اور خط معہ رجسٹری دیا۔ خط کھولا۔ سو روپے کی ہنڈوی، بل جو کچھ کہیے وہ ملا۔ ایک آدمی رسید مہری لے کر "نیل کے کٹڑے" میں چلا گیا۔ سو روپے چہرہ شاہی لے آیا۔ آنے جانے کی دیر ہوئی اور بس۔ چوبیس روپے داروغہ کی معرفت اٹھے تھے، وہ دیے گئے۔ پچاس روپے محل میں بھیج دیے۔ چھبیس روپے باقی رہے۔ وہ بکس میں رکھ لیے۔ روپے کے رکھنے کے واسطے بکس کھولا تھا، سو یہ رقعہ بھی لکھ لیا۔ کلیان سودا لینے بازار گیا ہوا ہے، اگر جلد آگیا تو آج، ورنہ کل یہ خط ڈاک میں بھیج دوں گا۔ خدا تم کو جیتا رکھے اور اجر دے۔ بھائی، بری آبنی ہے انجام اچھا نظر نہیں آتا۔ قصہ مختصر یہ کہ قصہ تمام ہوا

غالب

چار شنبہ ۳ فروری ۱۸۵۸ء وقت دوپہر

(۳۱)

صاحب، تم نے لکھا تھا کہ میں جلد آگرہ جاؤں۔ تمہارے اس خط کا جواب

نہ لکھ سکا۔ جواب تو لکھ سکتا تھا مگر کلیان کا پانو سوج گیا تھا۔ وہ چل نہیں سکتا تھا۔ مسلمان آدمی شہر میں سڑک پہ بن ٹکٹ پھر نہیں سکتا۔ ناچار تم کو خط نہ بھیج سکا۔ بعد چند روز کے جو کہار اچھا ہوا، تو میں تم کو آگرے میں سمجھ کر سکندرآباد خط نہ بھیج سکا۔ مولوی قمرالدین خاں کے خط میں تم کو سلام لکھا۔ کل ان کا خط آیا وہ لکھتے ہیں کہ میرزا تفتہ ابھی یہاں نہیں آئے۔ اس واسطے آج یہ رقعہ تم کو بھیجتا ہوں۔ میرا حال بدستور ہے۔ دیکھیے خدا کو کیا منظور ہے۔ حاکم اکبر نے آکر کوئی نیا بندوبست جاری نہیں کیا۔ یہ صاحب میرے آشنائے قدیم ہیں، مگر مل نہیں سکتا۔ خط بھیج دیا ہے۔ ہنوز کچھ جواب نہیں آیا۔ تم لکھو کہ اکبرآباد کب جاؤ گے۔ والدعا

جمعہ ۵ مارچ ۱۸۵۸ء غالب

(۳۲)

جانِ من و جانانِ من،

کل میں نے تم کو سکندرآباد میں سمجھ کر خط بھیجا۔ شام کو تمھارا خط آیا، معلوم ہوا کہ تم اکبرآباد پہنچے۔ خیر وہ خط پوسٹ پڑ گیا ہے، شاید اُلٹا نہ پھرے۔ اگر پھر آئے گا تو خیر۔ آج یہ خط تم کو اکبرآباد بھیجتا ہوں۔ پہنچنے پر جواب لکھنا۔

تقطیع رباعی کی بہت خوب۔ مگو خیر ہر ایک بات کا وقت ہے۔ ہم کو ہر طرح سے لطفِ صحبت و لطفِ شعر اُٹھا لینا۔ بھائی منشی نبی بخش صاحب کے نام کا خط پڑھ کر ان کو دے دینا اور اس کا مضمون معلوم کر لینا۔ جن حاکم کو میں نے یہ خط اور رقعہ بھیجا ہے، اس کے سررشتہ دار کوئی صاحب ہیں۔ من بھول اُن کا نام ہے۔ مجھ سے ناآشنائے محض ہیں۔ اگر تعارف ہوتا تو استدعا کرتا کہ اس تحریر کو پیش کیجیے۔ کاش تم سے آشنائی ہوتی تو تمھیں اُوپر اُوپر ایک خط لکھ کر اُن کو بھیج دیتے کہ غالب ایک

فقیر گوشہ نشین اور بے گناہ محض اور واجب الرحم ہے۔ اس کے حصول مطالب میں سعی سے دریغ نہ کرنا:

مے تواں آورد استغنا سفارش نامہ	چرخ کج رو را اگر دانیم کز یاران کیست

باقی جو حال ہے وہ بھائی کے نام کے ورق میں لکھ چکا ہوں۔ تم پڑھ لوگے دوبارہ لکھنا کیا ضرور۔

شنبہ ۱۷ مارچ ۱۸۵۸ء - جواب طلب

(۳۲)

صاحب،

تمہاری سعادت مندی کو ہزار ہزار آفرین۔ تم کو یوں ہی چاہیے تھا، لیکن میں نے تو ایک بات بطریق تمنا لکھی تھی، جیسا کہ عربی میں "لیت" اور فارسی میں "کاشکے"

اب تم روداد سنو۔ عرضی میری سر ہنری لارنس چیف کمشنر بہادر کو گزری۔ اس پر دستخط ہوئے کہ یہ عرضی مع کاغذ ضمیمہ سائل کے پاس بھیج دی جائے اور یہ لکھا جائے کہ معرفت صاحب کمشنر دہلی کے پیش کرو۔ اب سر رشتہ دار کو لازم تھا کہ میرے نام موافق قاعدہ کے خط لکھتا۔ یہ نہ ہوا۔ وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی میرے پاس آ گئی میں نے خط صاحب کمشنر دہلی چارلس سانڈرس کو لکھا اور وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی اس میں ملفوف کر کے بھیج دی۔ صاحب کمشنر نے کلکٹر کے پاس یہ حکم چڑھا کر بھیجی کہ سائل کے پنشن کی کیفیت لکھو۔ اب وہ مقدمہ صاحب کلکٹر کے ہاں آیا ہے۔ ابھی صاحب کلکٹر نے تعمیل اس حکم کی نہیں کی۔ پرسوں تو ان کے ہاں یہ روبکاری آئی ہے۔ دیکھئے کچھ مجھ سے پوچھتے ہیں یا اپنی ذاتی رائے لکھ بھیجتے ہیں۔ دفتر کہاں رہا ہے جو اس کو دیکھیں گے۔

بہر حال خدا کا شکر ہے کہ بادشاہی دفتر میں سے میرا کچھ شمول فساد میں پایا نہیں

گیا اور میں حکام کے نزدیک یہاں تک پاک ہوں کہ پنشن کی کیفیت طلب ہوئی ہے اور میری کیفیت کا ذکر نہیں ہے۔ یعنی سب جانتے ہیں کہ اس کو لگاؤ نہ تھا[1]۔

مولوی قمرالدین خاں کا کول نہ جانا اور راہ سے پھر آنا معلوم ہوا۔ حق تعالیٰ اُن کو زندہ اور سلامت رکھے۔ میرا اسلام کہنا اور یہ خط پڑھا دینا۔ بھائی منشی نبی بخش صاحب کو میرا اسلام اور اُن کے بچوں کو دعا کہنا اور یہ خط ضرور ضرور پڑھا دینا اور کہنا کہ بھائی ہدایت[2] تو اچھی ہے، نہایت[3] بھی خدا اچھی کرے، وہ عزت اور وہ ربط و ضبط جو ہم رئیس زادوں کا تھا، اب کہاں! روٹی کا ٹکڑا ہی مل جائے تو غنیمت ہے۔ گورنری کلکتہ اور گورنری آگرہ اور ایجنٹی و کمشنری و دیوانی و فوجداری و کلکٹری دہلی سے جو حکم میرے خط اور عرضی پر ہوا ہے مشتمل اس حکم پر خط میرے نام آیا ہے۔ حاکم نے اب بھی یہی حکم دیا تھا کہ لکھا جائے کہ یوں کرو۔ عملہ نے خط نہ لکھا۔ صرف وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی بھیج دی۔ خیر،

ہر چہ از دوست مے رسد نیکوست

سُنو، میرزا تفتہ اب میں جو اپنا حال تم کو لکھا کروں، وہ تم میرے بھائی کو اور مولوی قمرالدین خاں کو دکھا دیا کرو۔ تین تین جگہ ایک بات کو کیوں لکھوں؟

جمعہ ۱۲ مارچ ۱۸۵۸ء

(۳۴)

صاحب،

کیوں مجھے یاد کیا؟ کیوں خط لکھنے کی تکلیف اُٹھائی؟ پھر یہ کہتا ہوں کہ خدا تم کو جیتا رکھے کہ تمہارے خط میں مولوی قمرالدین کا سلام بھی آیا اور بھائی منشی نبی بخش کی خیر و عافیت بھی معلوم ہوئی۔ وہ تو پنشن کے فکر میں تھے۔ ظاہراً یوں مناسب دیکھا ہوگا۔

---

[1] یعنی اہل ہنگامہ سے [2] آغاز، ابتدا [3] انجام

کہ نوکری کی خواہش کی - حق تعالیٰ ان کی جو مراد ہو بر لائے - اُن کو میرا سلام کہہ دینا۔ بلکہ یہ رقعہ پڑھوا دینا - مولوی قمرالدین خاں کو بھی سلام کہنا۔

تم اپنے کلام کے بھیجنے میں مجھ سے پرسش کیوں کرتے ہو؟ چار جزو جب جمع ہو جائیں تو بے تکلف بھیج دو۔ میں شاعرِ سخن سنج اب نہیں رہا، صرف سخن فہم رہ گیا ہوں۔ بڈھے پہلوان کی طرح پیچ بتانے کی گوں کا ہوں - بناوٹ نہ سمجھنا۔ شعر کہنا مجھ سے بالکل چھوٹ گیا - اپنا اگلا کلام دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ یہ میں نے کیوں کر کہا تھا - قصہ مختصر وہ اجزا جلد بھیج دو۔

یک شنبہ ۱۲ ر اپریل ۱۸۵۸ء غالب

(۳۵)

میرزا تفتہ،

عجب اتفاق ہوا - پنجشنبہ کے دن ۲۲ ر اپریل کو کلیان خط ڈاک میں ڈال کر آیا۔ اس کے متعاقب پارسل کا ہرکارہ آیا اور تمہارا بھیجا ہوا پاکٹ لایا - رسید لکھنی میں نے زائد سمجھی اور اس کا دیکھنا شروع کیا - بے کار محض اور تنہا ہوں - پانچ پہر کا دن - میری بڑی دل لگی ہو گئی - خوب دیکھا - سچ تو یوں ہے کہ ان اشعار سے میں نے بہت حظ اُٹھایا - جیتے رہو، تمہارا دم غنیمت ہے - بھائی[1] کا حال مفصل لکھو - پنشن کے طالب ہیں یا نوکری کے؟ منشی عبداللطیف[2] کہاں ہے؟ اور کس طرح ہے؟ علاقہ بنا ہوا ہے یا جاتا رہا؟ صاحب لفٹنٹ گورنری کا محکمہ بالکل الٰہ آباد کو گیا یا ہنوز کچھ یہاں بھی ہے؟ منشی غلام غوث صاحب کہاں ہیں؟ نوکر ہیں یا مستعفی؟ عدالت دیوانی کا محکمہ یہیں رہے گا یا الٰہ آباد جائے گا؟ اس کا اور گورنری کے محکمے کا ساتھ ہے، چاہیے یہ بھی وہیں جائے - آج تمہارے اشعار کا

---

[1] منشی نبی بخش حقیر [2] حقیر کا فرزند ؞

کا کاغذ بمعۂ پاکٹ اسی خط کے ساتھ ڈاک میں بھیجا گیا ہے، یقین ہے کہ یہ خط کل پرسوں اور وہ پاکٹ پانچ چار دن میں پہنچ جائے۔

یک شنبہ ۲۵ اپریل ۱۸۵۸ء غالب

(۳۶)

صاحب،

۲۵۔ اپریل کو ایک خط اور ایک پارسل ڈاک میں ارسال کر چکا ہوں، آج ۳۰۔ ہے۔ یقین ہے خط اور پارسل دونوں پہنچ گئے ہوں گے۔ ایک امر ضروری باعث اس تحریر کا ہے کہ جو میں اس وقت روانہ کرتا ہوں۔ ایک میرا دوست اور تمہارا ہمدرد[1] ہے۔ اس نے اپنے حقیقی بھتیجے کو بیٹا کر لیا تھا۔ ۱۸-۱۹ برس کی عمر، قوم کا کھتری، خوب صورت وضعدار نوجوان۔ ۱۲۷۳ھ میں بیمار پڑ کر مر گیا۔ اب اس کا باپ مجھ سے آرزو کرتا ہے کہ ایک "تاریخ" اس کے مرنے کی لکھوں۔ ایسی کہ وہ فقط "تاریخ" نہ ہو بلکہ مرثیہ ہو کہ وہ اس کو پڑھ پڑھ کر رویا کرے۔ سو بھائی، اس سائل کی خاطر مجھ کو عزیز اور فکرِ شعر متروک۔ معہذا یہ واقعہ تمہارے حسبِ حال ہے۔ جو خوب نکال شعر تم نکالو گے، وہ مجھ سے کہاں نکلیں گے۔ بطریقِ مثنوی بیس بیس شعر لکھ دو۔ مصرعِ آخر میں مادۂ تاریخ ڈال دو۔ نام اس کا برج موہن تھا اور اس کو "بابو بابو" کہتے تھے۔ چنانچہ میں بحرِ ہزج مسدس مخبون میں ایک شعر تم کو لکھتا ہوں چاہو اس کو آغاز میں رہنے دو اور آیندہ اسی بحر میں اور اشعار لکھ دو، چاہو کوئی اور

---

[1] یہاں ہمدرد کے معنے مونس اور غمخوار کے نہیں بلکہ یہ معنے ہیں کہ اسے بھی وہی درد ہے جو تمہیں ہے تفتہ کے ایک بیٹے ہیمبر سنگھ کا انتقال ہو گیا تھا۔ جس کی وفات پر کم و بیش تین سو شعر کا مرثیہ کہا تھا جس شخص کا ذکر غالب نے کیا، اس کے بھی لے پالک بیٹے کا انتقال ہو گیا تھا۔

طرح نکالو۔ لیکن یہ خیال میں رہے کہ سائل کو متوفے کے نام کا درج ہونا منظور ہے اور "بابو برج موہن" سوائے اس بحر کے یا بحر رمل کے اور بحر میں نہیں آ سکتا۔ وہ میرا شعر یہ ہے:

چکد خون دل ریش از لب من   برم چوں نام بابو برج موہن

نگاشتہ، روز جمعہ سی و یکم اپریل ۱۸۵۸ء   غالب

(۳۷)

بھائی،

وہ پہلا خط تم کو بھیج چکا تھا کہ بیمار ہو گیا۔ بیمار کیا ہوا، توقع زیست کی نہ رہی۔ قولنج اور پھر کیسا شدید، کہ پانچ پہر مرغ نیم بسمل کی طرح تڑپا کیا۔ آخر عصارۂ ریوند اور ارنڈی کا تیل پیا۔ اس وقت تو بچ گیا مگر قصہ قطع نہ ہوا۔ مختصر کہتا ہوں، میری غذا تم جانتے ہو کہ تندرستی میں کیا ہے۔ دس دن میں دوبارہ آدھی آدھی غذا کھائی گویا دس دن میں ایک بار غذا تناول فرمائی۔ گلاب اور املی کا پنّا اور آلو بخارے کا افشردہ، اس پر مدار رہا۔ کل سے خوف مرگ گیا ہے۔ صورت زیست کی نظر آتی ہے۔ آج صبح کو بعد دوا پینے کے تم کو یہ خط لکھا ہے۔ یقین تو ہے کہ آج پیٹ بھر کو روٹی کھا سکوں۔

صاحب، وہ جو میں نے ۲۲ شعر مرثیہ کے لکھ کر تم کو بھیجے، اس سے مقصود یہ تھا کہ تم اپنے اشعار دوسرے ماتم زدہ کو دے دو۔ کس واسطے کہ تمھاری تحریر سے معلوم ہوا تھا کہ کوئی اور بھی فلک زدہ ہے اور یہ جو تم لکھتے ہو کہ کچھ اوپر اسّی شعر میں سے ایک شعر بھی تو نے نہ لیا۔ اس کا حال یہ ہے کہ وہ شعر سب دست و گریباں تھے۔ ایک کو ایک سے ربط۔ ایک یا دو شعر اس میں سے کیونکر لیے جاتے؟ اشعار سب میرے پسند، بے سقم، بے عیب۔ وہ جو تم لکھتے ہو کہ:

حرف بالیوریج ہو ہمن سے زخم

اور اس کا دوسرا مصرع بھول گیا ہوں، مگر قافیہ میں "من" ہے، یہ شعر غالب کو بُرا معلوم ہوا ہوگا۔ واللہ باللہ جب تک کہ تم نے نہیں لکھا، میرے خیال میں بھی یہ بات نہ تھی۔ بہ ہر حال بات وہی ہے، جو میں اُوپر لکھ آیا ہوں۔

یارے، اب بھی بھائی منشی نبی بخش صاحب اور مولوی قمرالدین خاں صاحب روزوں کے متوالے، ہوش میں آئے یا نہیں آئے؟ آج ۱۰ شوال ۱۲۷۴ھ کی ہے یعنی عید کا بھی زمانہ گزر گیا۔ خدا کے واسطے اُن کی خیر و عافیت لکھو اور یہ عبارت بھائی صاحب کی نظرِ انور سے گزرانو۔ شاید وہ مجھ کو خط لکھیں۔

محررہ و مرسلہ دوشنبہ ۲۴ مئی ۱۸۵۸ء غالب

(۳۸)

کیوں صاحب،

مجھ سے کیوں خفا ہو؟ آج مہینہ بھر ہو گیا ہوگا یا بعد دو چار دن کے ہو جائے گا کہ آپ کا خط نہیں آیا۔ انصاف کرو، کتنا کثیر الاحباب آدمی تھا۔ کوئی وقت ایسا نہ تھا کہ میرے پاس دو چار دوست نہ ہوتے ہوں۔ اب یاروں میں ایک شیوجی رام برہمن اور بال مکند اس کا بیٹا، یہ دو شخص ہیں کہ گاہ گاہ آتے ہیں۔ اس سے گزر کر لکھنؤ اور کالپی اور فرخ آباد اور کس کس ضلع سے خطوط آتے رہتے تھے، ان دوستوں کا حال ہی نہیں معلوم کہ کہاں ہیں اور کس طرح ہیں۔ وہ آمد خطوط کی موقوف۔ صرف تم تین صاحبوں[1] کے آنے کی توقع۔ اس میں دونوں صاحب گاہ گاہ۔ ہاں ایک تم ہو کہ ہر مہینے میں ایک دو بار مہربانی کرتے ہو۔

سنو صاحب، اپنے پر لازم کر لو ہر مہینے میں ایک خط مجھ کو لکھنا۔ اگر کچھ کام آپڑا "تین خط" ورنہ صرف خیر و عافیت۔

---

[1] ان سے مراد نبی بخش حقیر، مولوی قمرالدین خاں اور تفتہ ہیں۔

لکھی اور ہر مہینے میں ایک بار بھیج دی۔ بھائی صاحب کا خط بھی دس بارہ دن ہوئے کہ آیا تھا۔ اس کا جواب بھیج دیا گیا۔ مولوی قمرالدین خاں یقین ہے کہ الہ آباد گئے ہوں۔ کس واسطے کہ مجھ کو مئی میں لکھا تھا کہ اوائل جون میں جاؤں گا۔ بہرحال اگر آپ آزردہ نہیں تو جس دن میرا خط پہنچے، اس کے دوسرے دن اس کا جواب لکھیے۔ اپنی خیر و عافیت، منشی صاحب کی خیر و عافیت، مولوی صاحب کا احوال، اس سے سوا گوالیار کے فتنہ و فساد کا ماجرا جو معلوم ہوا ہو، وہ الفاظ مناسب وقت میں ضرور لکھنا۔ راجہ جو وہاں آیا ہوا ہے۔ اس کی حقیقت، دھول پور کا رنگ۔ صاحبان عالی شان کا ارادہ وہاں کے بند و بست کا کس طرح پر ہے؟ آگرے کا حال کیا ہے۔ وہاں کے رہنے والے کچھ خائف ہیں یا نہیں؟

نگاشتہ شنبہ ۱۹ / جون ۱۸۵۸ء غالب

(۳۹)

جیتے رہو اور خوش رہو:

اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی

زیادہ خوشی کا سبب یہ کہ تم نے تحریر کو تقریر کا پیرایہ دے دیا تھا۔ کہ ئی ہنگامہ انطباع دیوان وغیرہ میں پہلے جانتا ہوں۔ بنک گھر کا روپیہ مصروف کا غذ و کاپی ہے۔ خدا تم کو سلامت رکھے۔ مغتنمات سے ہو۔ رجب علی بیگ سرور نے جو "فسانہ عجائب" لکھا ہے، آغاز داستان کا شعر مجھ کو بہت مزا دیتا ہے:

یادگار زمانہ ہیں ہم لوگ — یاد رکھنا، فسانہ ہیں ہم لوگ

مصرع ثانی کتنا گرم ہے اور یہ "یاد رکھنا فسانہ" کے واسطے کتنا مناسب ہے۔ منشی عبد اللطیف کے گھر میں لڑکے کے پیدا ہونے کی خبر مجھ کو پہنچ چکی ہے اور تہنیت کا بھائی کو خط لکھ چکا ہوں۔ اب جو اُن سے ملو تو میرا سلام کہہ کر اس خط کے پہنچنے کی اطلاع دے دینا۔

مولوی معنوی[1] جب کانپور سے معاودت فرمائیں، مجھ کو اطلاع دینا۔ میرا حال بدستور: ہماں پہلو، ہماں بستر، ہماں درد

غالب
شنبہ ۲۶ رجون ۱۸۵۸ء روز ورود نامہ

(۴۱)

میرزا تفتہ کو دعا پہنچے۔ بہت دنوں سے خط کیوں نہیں لکھا؟ آگرے میں ہو یا نہیں؟ میرزا حاتم علی صاحب کا شفقت نامہ آیا، یہاں سے اس کا جواب بھیجا گیا۔ وہاں سے جواب آگیا۔ میر مکرم حسین کا خط پرسوں آیا۔ دو چار دن میں اس کا جواب لکھوں گا۔ میرا حال بدستور ہے:

نہ نوید کامیابی، نہ نہیب نا امیدی

بھائی صاحب کا خط کئی دن ہوئے کہ آیا ہے اور میرے خط کے جواب میں ہے۔ وہ ایک دن کے بعد جب جی باتیں کرنے کو چاہے گا، تب ان کو خط لکھوں گا۔ تم اگر ملو تو ان سے کہہ دینا کہ بھائی! قاسم علی خاں کے شعر نے مجھ کو بڑا مزا دیا۔ حسن اتفاق یہ کہ کئی ہوئے تھے، میں نے ایک ولایتی چغہ اور ایک شالی رومال ڈھائی گز اولال کو دیا تھا اور وہ اس وقت روپیہ لے کر آیا تھا۔ میں روپیہ لے کر اور خط پڑھ کر خوب ہنسا کہ خط اچھے وقت آیا۔

غالب
۱۸ رجولائی ۱۸۵۸ء

(۴۲)

میرزا تفتہ، کل قریب دوپہر کے ڈاک کا ہرکارہ، وہ جو خط بانٹتا پھرتا ہے، آیا اور اس نے پارسل موم جامے میں لپٹا ہوا دیا۔ پہلے تو میں بھی حیران رہا کہ پاکٹ خطوں کی ڈاک میں کیوں آیا۔ بارے اس کی تحریر دیکھی، تو تمہارے ہاتھ کا پمفلٹ لکھا ہوا اور دو ٹکٹ لگے ہوئے، مگر اس کے آگے کالی مہر اور کچھ انگریزی لکھا ہوا۔ ہرکارے

[1] مولوی قمر الدین کی طرف اشارہ ہے۔

نے کہا: ایک روپیہ دس آنے دلوا دیجئے۔ دلوا دیئے اور پارسل لے لیا۔ مگو حیران کہ یہ کیا پیچ پڑا۔ قیاس ایسا چاہتا ہے کہ تمہارا آدمی جو ڈاک گھر گیا، اس کو خطوں کے بکس میں ڈال آیا۔ ڈاک کے کارپردازوں نے غور نہ کی اور اس کو بیرنگ خطوں کی ڈاک میں بھیج دیا۔

وہ صاحب جو میرے عرف سے آشنا اور میرے نام سے بیزار ہیں یعنی منشی بھگوان پرشاد متخلص بہ "ان"، میرا سلام قبول کریں۔ میر اسلام قبول کریں۔

۲۸ رجولائی ۱۸۵۸ء غالب

(۴۳)

میرزا تفتہ،

تمہارے اوراق مثنوی کا پلندہ فلٹ پاکٹ پر سوں ۱۵-اگست کو اور جناب میرزا حاتم علی صاحب[۱] کی نثر شاید آغاز اگست میں روانہ کر چکا ہوں۔ اس نثر کی رسید نہیں پائی اور نہیں معلوم کہ میری خدمت مخدوم کے مقبول طبع ہوئی یا نہیں۔ نہیں معلوم بھائی نبی بخش صاحب کہاں ہیں اور کس طرح ہیں اور کس خیال میں ہیں؟ نہیں معلوم مولوی قمر الدین خاں الہ آباد سے آگئے یا نہیں؟ میر منشی قدیم[۲] وہاں پہنچ گئے، اپنا کام کرنے لگے یا کر رہے ہیں؟ آپ کو بتاکید لکھتا ہوں کہ ان تینوں باتوں کا جواب الگ الگ لکھیے اور جلد لکھیے۔ اس خط کے بھیجنے تک اغلب ہے کہ پارسل پہنچ جائے۔ اس کے پہنچنے کی اطلاع دیجئے گا۔

اب ایک اور امر سنو: میں نے آغاز یازدہم مئی ۱۸۵۷ء سے یکم جولائی ۱۸۵۸ء تک روداد شہر اور اپنی سرگزشت یعنی پندرہ مہینے کا حال نثر میں لکھا ہے اور التزام اس کا کیا ہے کہ "دساتیر" کی عبارت یعنی پارسی قدیم لکھی جائے اور کوئی لفظ عربی نہ آئے

۱۔ حاتم علی بیگ مہر ۲۔ منشی غلام غوث خاں بے خبر

جو نظم اس نثر میں درج ہے، وہ بھی بے آمیزش لفظ عربی ہے۔ ہاں، اشخاص کے نام نہیں بدلے جاتے۔ وہ عربی، انگریزی، ہندی، جو ہیں وہ لکھ دیے ہیں مثلاً تمھارا نام "منشی ہرگوپال" منشی لفظ عربی ہے نہیں لکھا گیا، اس کی جگہ "شیوا زبان" لکھ دیا ہے۔ یہی میرا خط جیسا اِس رقعہ میں ہے نہ چھدرا نہ گنجان، اوراق بے مسطر پر اس طرح کہ کسی صفحہ میں ۲۰ سطر اور کسی میں بائیس سطر بلکہ کسی میں انیس سطر بھی آئے۔ چالیس صفحے یعنی بیس ورق ہیں۔ اگر اکیس سطر کے مسطر سے کوئی گنجان لکھے، تو شاید دو جزو میں آ جائے۔ یہاں کوئی مطبع نہیں ہے سنتا ہوں کہ ایک ہے، اس میں کاپی نگار خوش نویس نہیں ہے۔ اگر آگرے میں اس کا چھاپہ ہو سکے، تو مجھ کو اطلاع کرو۔ اس تہی دستی اور بے نوائی میں چھپیں کا میں بھی خریدار ہو سکتا ہوں لیکن صاحب مطبع اتنے پر کیوں مانے گا اور البتہ چاہیے، اگر ہزار نہ ہوں تو پانسو جلد تو چھاپی جائے۔ یقین ہے کہ پانسات سو جلد چھاپنے کی صورت میں تین آنے یا چار آنے[1] قیمت پڑے۔ کاپی تو ایک ہی ہوگی، رہا کاغذ، وہ بھی بہت نہ لگے گا۔ لکھائی متن کی تو آپ کو معلوم ہو گئی۔ حاشیہ پر البتہ لغات کے معنی لکھے جائیں گے۔ بہر حال اگر ممکن ہو تو اس کا تکڈمہ کرو اور حساب معلوم کر کے مجھ کو لکھو۔ اگر منشی قمر الدین خاں آ گئے ہوں تو اُن کو بھی شریک مصلحت کر لو۔ ان تینوں باتوں کا جواب اور پارسل کی رسید اور اس مطلب خاص کا جواب، یہ سب ایک خط میں پاؤں۔ ضرور، ضرور، ضرور، جواب طلب، واسطے تاکید کے بیرنگ بھیجا جاتا ہے۔

نگاشتہ و روان داشتہ۔ سہ شنبہ ہفدہم اگست ۱۸۵۸ء غالب

(۴۴)

بھائی،

تمھارا وہ خط جس میں اوراق مثنوی ملفوف تھے، پہنچا۔ اوراق مثنوی، اور رقعہ

[1] اندازہ

"دستنبو" کے ساتھ پہنچیں گے۔ اب تمہارے مطالب کا جواب جُدا جُدا لکھتا ہوں۔ الگ الگ سمجھ لینا۔

صاحب، تم نے مرزا حاتم علی صاحب سے کیوں کہا۔ بات اتنی تھی کہ مجھ کو لکھ بھیجتے کہ نثر آئی اور مرزا صاحب نے پسند کی۔ اب اُن سے میرا سلام کہو اور یہ کہو کہ آپ کے شکوہ بجا لانے کا شکر بجا لاتا ہوں۔

چھاپے کے باب میں جو آپ نے لکھا۔ وہ معلوم ہوا۔ اس تحریر کو جب دیکھو گے تب جانو گے۔ اہتمام اور عجلت اس کے چھپوانے میں اس واسطے ہے کہ اس میں سے ایک جلد نواب گورنر جنرل بہادر کی نذر بھیجوں گا اور ایک جلد بذریعہ اُن کے جناب ملکہ معظمہ انگلستان کی نذر کروں گا۔ اب سمجھ لو کہ طرز تحریر کیا ہوگی اور صاحبان مطبع کو اس کا انطباع کیوں نا مطبوع ہوگا۔

جیتے رہو۔ اس غمزدگی میں مجھ کو ہنسایا۔ وہ کون ملّا تھا جس نے تم کو پڑھایا:

گرچہ عمل کار خردمند نیست

"عمل کار": "اہل کار"

یہ شعر شیخ سعدیؔ کا بادشاہ کی نصیحت میں ہے:

جز بخردمند مفرما عمل

یعنی خدمت و اعمال سوائے علما۔ اور عقلا کے اور کی تفویض نہ کر، پھر خود کہتا ہے:

گرچہ عمل کار خردمند نیست

"یعنی اگرچہ خدمات و اشغال سلطانی کا قبول کرنا خردمندوں کا کام نہیں اور عقل سے بعید ہے کہ آدمی اپنے کو خطرے میں ڈالے۔ عمل الگ ہے اور "کار" مضاف ہے بطرف خردمند کے۔ ورنہ دہائی خدا کی "عمل کار"، "اہل کار" کے معنی پر نہیں آتا، مگر قتیل[۱] اور واقف[۲] یا اور پورب کے ملکیوں کی فارسی :-

حواشی کے لیے دیکھو اگلا صفحہ

(۴۵)

صاحب،

عجب اتفاق ہے، آج صبح کو ایک خط تم کو اور ایک خط جاگیر کے گانو کی تہنیت میں اپنے شفیق کو ڈاک میں بھیج چکا تھا کہ دوپہر کو رضی الدین نیشاپوری کا کلام ایک شخص بیچتا ہوا لایا۔ میں تو کتاب کو دیکھ لیتا ہوں، مول نہیں لیتا۔ قضارا جب میں نے اس کو کھولا، اسی ورق میں یہ مطلع نکلا:

اگر بہ گنج گہر ہلیم او فتاد چہ باک   کف جواد ترا از برائے آں دارم

۱؎ مطلب یہ ہے کہ تفتہ نے ”گرچہ عمل بکار خرد مند نیست“ میں عمل کار کو ایک لفظ بہ معنے اہل کار سمجھا حالانکہ عمل بہ معنی شغل ملازمت ہے اور ”کار“ ”خردمند“ کی حرف مضاف ہے۔ جیسا کہ غالب نے کھول کر بتا دیا ہے۔

۲؎ قتیل: اصل میں کھتری تھا، فرید آباد کا باشندہ مشہور تھا اور میرا خیال ہے کہ اس سے فرید آباد قصبہ مراد نہیں بلکہ دہلی کے ایک محلے کا نام مراد ہے۔ جسے سیّد فرید بخاری مخاطب بہ مرتضےٰ خاں جہانگیری نے آباد کیا تھا۔ ”مآثر الامرا“ میں بہ سلسلہ احوال مرتضےٰ خاں اس کا ذکر آیا ہے۔ بعد میں قتیل مسلمان ہو گیا اور محمد حسن نام رکھا۔ فارسی نظم و نثر میں شہرت پا کر میرزا محمد حسن قتیل مشہور ہوا۔ لکھنؤ میں ۱۸۲۳ء میں بہ عہد غازی الدین حیدر وفات پائی۔

۳؎ واقف۔ بٹالہ کے قاضی، نور العین نام، قاضی امانت اللہ کے فرزند تھے۔ عام طور پر یہ واقف لاہوری مشہور ہیں۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی کے دوست تھے۔ آزاد نے ان کا حال ”خزانۂ عامرہ“ میں لکھا ہے۔ عبد الحکیم حاکم لاہوری کے ساتھ حج کے لیے نکلے۔ اورنگ آباد ہوتے ہوئے سورت پہنچے۔ حاکم جہاز پر سوار ہو کر حجاز پہنچ گیا۔ واقف ضعف جسمانی اور ہجوم امراض کے باعث سمندر کا سفر نہ کر سکے اور سورت میں ٹھہرے رہے۔ حاکم کی واپسی پر اورنگ آباد گئے۔ وہاں سے پنجاب آ رہے تھے راستے میں ڈاکوؤں نے سب کچھ لوٹ لیا۔ میر غلام علی کو حادثہ کی خبر دیتے ہوئے یہ شعر بھی لکھا:

(دیکھو صفحہ ۱۵۰)

چاہتا تھا کہ تم کو لکھوں کہ ناگاہ تمھارا خط آیا - مجھ کو لکھنا ضرور ہوا - آج تمھیں دو خط بھیجے ہیں - ایک تو صبح کو پوسٹ پیڈ اور ایک اب بارہ پر تین بجے بیرنگ - اس شعر کو اب چاہو رہنے دو -

ہائے ہائے، تم بھائی سے ملے "غیاث اللغات" کھلوائی - جواد کا لغت دیکھا، مگر میرا ذکر نہ کیا کہ وہ تمھارا جو یائے حال ہے - "دستنبو" اور اس کے چھاپے کا ذکر نہ کیا - البتہ تم ذکر کرتے تو وہ دونوں کے باب میں کچھ فرماتے اور مجھ کو دعا سلام کہہ دیتے - چونکہ تم نے اپنے خط میں کچھ نہیں لکھا، اس سے معلوم ہوا کہ بھائی نے کچھ نہیں کہا، اگر انھوں کچھ نہیں کہا تو ان کا ستم اور ان کا کہا ہوا تم نے نہیں لکھا تو تمھارا کرم

بہ ہر حال خوب مصرع حافظ کا تم نے مجھ کو یاد دلایا ہے:

یا رب مباد کس را مخدوم بے عنایت

خواہی تم، خواہی منشی نبی بخش سلمہ اللہ تعالیٰ - یہ یاد رہے یہ مصرع اگر مجھ پر زنجیر سے باندھو گے تو بھی نہیں بندھے گا - اگر "دستنبو" کو سراسر غور سے دیکھو گے تو اپنا نام پاؤ گے اور یہ بھی جانو گے کہ وہ تمھاری اس تحریر سے سو برس پہلے کی ہے -

آخر روز دو شنبہ ۲۳ اگست ۱۸۵۸ء غالب

(۴۶)

نور نظر و لخت جگر مرزا تفتہ،

تم کو معلوم رہے کہ راے صاحب مکرم و معظم راے امید سنگھ بہادر بہ قصد تم کو

(بقیہ صفحہ ۱۴۹) علیٰکے دپارہ سیماب با من ماندہ است

چشم حیران و دل بے تاب با من ماندہ است

سیماب اس لیے ساتھ تھا کہ واقف کو کیمیا گری کا شوق تھا - آزاد نے واپسی کا سر و ساماں کر دیا - اس طرح بٹالہ پہنچے ان کا دیوان چھپا ہوا موجود ہے - غالب - واقف یا قتیل کو فارسی میں مستند نہیں مانتے تھے

بھیجیں گے۔ تم اس رقعہ کو دیکھتے ہی ان کے پاس حاضر ہونا اور جب تک وہاں رہیں، تب تک حاضر ہوا کرنا اور "دستنبو" کے باب میں جو ان کا حکم ہو بجالانا۔ ان کو بڑھا بھی دینا اور فی جلد کا حساب سمجھا دینا۔ پچاس جلد کی قیمت عنایت کر دیں گے وہ لے لینا۔ جب کتاب چھپ چکے۔ دس جلدیں راے صاحب کے پاس اندور بھیج دینا اور چالیس جلدیں بموجب ان کے حکم کے میرے پاس ارسال کرنا اور وہ جو میں نے پانچ جلد کی آرایش کے باب میں تم کو لکھا ہے، اس کا حال مجھ کو ضرور لکھنا۔

ہاں صاحب، ایک رباعی میرے سہو سے رہ گئی ہے۔ اس رباعی کو چھاپا ہونے سے پہلے حاشیہ پر لکھ دینا۔ جہاں یہ فقرہ ہے: نے نے اختر بخت خسرو دربلندی بجاے رسید کہ رُخ از خاکیاں نہفت:

جاے کہ ستارہ شوخ چشمی ورزد — افسر افسار و گرزن ارزن ارزد[1]
خورشید ز اندیشۂ جادر گردش[2] — بر چرخ نہ بینی کہ چساں مےلرزد

چونکہ حاشیہ معنی لغات سے بھرا ہوا ہے، تو تم اس فقرے کے آگے نشان بنا کر اوپر کے حاشیے پر رباعی لکھ دینا اور حاشیہ یمین پر جہاں اور معنی لکھے ہوئے ہیں۔ وہاں رباعی کے لغات کے معنی خفی قلم سے لکھ دینا۔ "افسر" "افسار" "گرزن" (بہ ہر دو فتحہ) "جادر گردش"۔

نگاشتہ ۲۸ اگست ۱۸۵۸ء — غالب

(۴۷)

صاحب، عجب تماشا ہے۔ تمہارے کہے سے منشی شیو نرائن صاحب کو خط لکھا تھا، سو کل اُن کا خط آیا اور انھوں نے "دستنبو" کی رسید لکھی۔ ڈاک کا ہرکارہ تو اُن کے پاس لے نہ گیا ہوگا، آخر تمھیں نے بھیجا ہوگا۔ یہ کیا کہ تم نے مجھ کو اس

---

[1] افسر: تاج، افسار: گھوڑے کے ماتھے کا ساز، گرزن: تاج، ارزن: چینا

[2] جادر گردش: تغیر احوال۔

کی رسید اور میرے خط کا جواب نہ لکھا؟ اگر یہ گمان کیا جائے کہ تم نے رائے امید سنگھ کی ملاقات ہو لینے پر خط لکھنا منحصر رکھا ہے، تو وہ بھی ہو چکی ہو گی۔ مجھے تو صورت ایسی نظر آتی ہے کہ گویا تم الگ ہو گئے ہو۔ کتاب مطبع میں حوالے کر دی۔ اب اس کی تزئین و تصحیح سے کچھ غرض نہیں۔ پس اگر یوں ہے تو میں بس انطباع سے درگزرا۔ سیکڑوں مطالب و مقاصد رہ جائیں گے اور پھر اس وحشت کی وجہ کیا؟ بے تکلف قیاس چاہتا ہے کہ تم مجھ سے خفا ہو گئے ہو؟ خدا کے واسطے خفگی کی وجہ لکھو۔ صبح کو میں نے یہ خط روانہ کیا ہے، بدھ کا دن ستمبر کی پہلی تاریخ۔ اگر شام تک تمھارا خط آیا تو خیر، ورنہ تمھاری رنجش کا بالکل یقین ہو جائے گا اور بہ سبب وجہ نامعلوم ہونے کے جی گھبرائے گا۔ میں تو اپنے نزدیک کوئی سبب ایسا نہیں پاتا۔ خدا کے واسطے جلد خط لکھو۔ اگر خفا ہو تو خفگی کا سبب لکھو۔

جانتا ہوں کہ تم رائے امید سنگھ سے بھی نہ ملے ہو گے۔ عیاذاً باللہ! میں اُن سے شرمندہ رہا کہ میں نے کہا تھا کہ ہاں مرزا تفتہ دستنبو کو اچھی طرح پڑھا دیں گے اگرچہ ایسے حال میں کہ مجھ کو تم پر الگ ہونے اور پہلو تہی کرنے کا گمان گزرا ہے، کوئی مطلب تم کو لکھنا نہ چاہیئے۔ مگر ضرورت کو کیا کروں؟ ناچار لکھتا ہوں صاحب مطبع نے خط کے لفافے پر لکھا ہے "مرزا نوشہ صاحب غالبؔ"۔ للہ غور کرو کہ یہ کتنا بے جوڑ جملہ ہے۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں صفحہ اول کتاب پر بھی نہ لکھ دیں۔ آیا "فارسی دیوان" یا "اردو" یا "پنج آہنگ" یا "مہر نیم روز" چھاپے کی یہ کوئی کتاب اس شہر میں نہیں پہنچی، جو وہ میرا نام لکھ دیتے؟ تم نے بھی ان کو میرا نام نہیں بتایا۔ صرف اپنی نفرت عرف سے وجہ اس واویلا کی نہیں ہے۔ بلکہ سبب یہ ہے کہ دلّی کے حکّام کو تو عرف معلوم ہے لیکن کلکتہ سے ولایت تک، یعنی وزرا کے محکمے ہیں اور ملکہ عالیہ کے حضور میں کوئی اس نالائق عرف کو نہیں جانتا۔ پس اگر صاحب مطبع

نے "مرزا نوشہ صاحب غالب" لکھ دیا تو میں غارت ہوگیا، کھویا گیا۔ میری محنت رائیگاں گئی۔ گویا کتاب کسی اور کی ہو گئی۔ لکھتا ہوں اور پھر سوچتا ہوں کہ دیکھوں تم یہ پیام مطبع میں پہنچا دیتے ہو یا نہیں۔

بُدھ کا دن۔ ستمبر کی پہلی تاریخ ۱۸۵۸ء غالب

(۴۸)

للہ الشکر، تمہارا خط آیا اور دل سودا زدہ نے آرام پایا۔ تم میرا خط اچھی طرح پڑھا نہیں کرتے۔ میں نے ہرگز نہیں لکھا کہ یہ عبارت دو جزو میں آ جائے۔ میں نے یہ لکھا تھا کہ عبارت اس قدر رہے کہ دو جزو میں آ جائے لیکن میں چاہتا ہوں کہ حجم زیادہ ہو۔ بہر حال اس نمونے کی تقطیع اور حاشیہ مطبوع ہے۔ لغات کے معنے حاشیہ پر چڑھیں۔ اس کی روش دل آویز اور تقسیم نظر فریب ہو۔ رباعی حاشیے پر لکھ دی، اچھا کیا۔ بھائی منشی نبی بخش صاحب سے نثر کے دو فقرے جس محل پر کہ ان کو بتائے ہیں، ضرور لکھوا دینا۔ میں نے جو تم کو "میرزائی" کا خطاب دیا ہے۔ ان فقروں میں اس کا اظہار کیا ہے۔

بہت ضروری یہ امر ہے، اور میں منشی شیو نرائن صاحب کو آج صبح لکھ چکا ہوں: تیسرے صفحہ کے آخر یا چوتھے صفحہ کے اوّل یہ جملہ ہے:

"اگر دردم دیگر بہ نہیب مباش ہم زند"

"نہیب" کی جگہ "نوائے" بنا دینا

"بہ نوائے مباش ہم زند"

"نہیب" لفظ عربی ہے۔ اگر رہ جائے گا تو لوگ مجھ پر اعتراض کریں گے۔ نیز چاکو کی نوک سے نہیب کا لفظ چھیلا جائے اور اسی جگہ "نوائے" لکھ دیا جائے۔

راے امید سنگھ نے مجھ پر عنایت اور مطبع کی اعانت کی۔ حق تعالیٰ

ان کو اس کارسازی اور فقیر نوازی کا اجر دے۔ صاحب، کبھی نہ کبھی میرا کام تم سے آپڑا ہے اور پھر کام کیسا کہ جس میں میری جان اُلجھی ہوئی ہے اور میں نے اس کو اپنے بہت سے مطالب کے حصول کا ذریعہ سمجھا ہے۔ خدا کے واسطے پہلو تہی نہ کرو اور بدل توجہ فرماؤ۔ کاپی کی تصحیح کا ذمہ ہو گیا ہے۔ چھ جلدوں کی آراستگی کا ذمہ برخوردار عبداللطیف کا کردو۔ میری طرف سے دعا کہو اور کہو کہ میں تمہارا بوڑھا اور مفلس چچا ہوں، تصحیح بھائی کریں، تزئین تم کرو۔ کہتا ہوں، مگر نہیں جانتا کہ تزئین کیونکر کیا چاہیے۔ سنتا ہوں کہ چھاپے کی کتاب کے حرفوں پر سیاہی کے قلم پھیر دیتے ہیں تاکہ حروف روشن ہو جائیں۔ سیاہ قلم سے جدول بھی کھنچ جاتی ہے۔ پھر جلد بھی پُر تکلف بن سکتی ہے۔ بھتیجے کی دستکاری اور صنّاعی اور ہوشیاری اُن کی کس دن میرے کام آئے گی۔

میرزا تفتہ، تم بڑے بے درد ہو۔ دلّی کی تباہی پر تم کو رحم نہیں آتا، بلکہ تم اس کو آباد جانتے ہو۔ یہاں نیچہ بند تو میسّر نہیں، صحاف اور نقاش کہاں؟ شہر آباد ہوتا تو میں آپ کو تکلیف کیوں دیتا؟ یہیں سب درستی میری آنکھوں کے سامنے ہو جاتی۔ قصّہ مختصر یہ عبارت منشی عبداللطیف کو پڑھا دو۔ میں تو اُن کے باپ کو اپنا حقیقی بھائی جانتا ہوں۔ اگر وہ مجھے اپنا حقیقی چچا جانیں اور میرا کام کریں، تو کیا عجب ہے۔ دو روپے فی جلد، اس سے زیادہ کا مقدور نہیں۔ جب مجھ کو لکھو گے، ہنڈوی بھیج دوں گا۔ چھ روپے، آٹھ روپے، دس روپے، حد بارہ روپے، میاں کو سمجھا دینا۔ کمی کی طرف نہ گریں، چیز اچھی بنے۔ نہایت بارہ روپے میں چھ جلدیں تیار ہوں۔

منشی شیو نرائن کو سمجھا دینا کہ زنہار عرف نہ لکھیں، نام اور تخلص بس۔ اجزائے خطابی کا لکھنا نامناسب، بلکہ مضر ہے، مگر ہاں نام کے بعد لفظ "بہادر"

(دیکھو صفحہ ۱۵۵)

کا اور "بہادر" کے بعد تخلص "اسد اللہ خاں بہادر غالب"

بھائی تم نے اوراقِ مثنوی کی رسید نہ لکھی۔ کہیں وہ پارسل میں سے گر تو نہ گئے ہوں۔ دیکھو، کس لطف سے میرے نام کی حقیقت بیان ہوئی ہے اور ان کے چھاپنے کی ممانعت ضرور ہے، مگر میں اس کی عبارت کیا بتاؤں۔ صاحبِ مطبع اس امر کو اردو میں آخر کتاب پر لکھ دیں۔ منشی جی سے نثر لکھوالو۔ منشی عبد اللطیف، کو یہ خط پڑھوا دو۔ "نہیب" کی جگہ "نوائے" بنا دو۔ صاحبِ مطبع کو میرا نام بتا دو۔ خاتمے پر ممانعت کا حکم صاحبِ مطبع سے لکھوا دو۔ برخوردار عبد اللطیف سے مقدار روپے کی دریافت کر کے مجھ کو لکھ بھیجو۔ اپنی مثنوی کی رسید لکھو۔ اپنے بجان و دل مصروف ہونے کا اقرار کرو۔ ان سب امور کی مجھے خبر دو۔

جمعہ سوم ستمبر ۱۸۵۸ء ہنگام نیمروز غالب

(۴۹)

میرزا تفتہ کو دعا پہنچے۔ دونوں فقرے جس محل پر بتائے ہیں، حاشیے پر لکھ دیے ہوں گے۔ "نہیب" کے لفظ کو چھیل کر "نوائے" بنا دیا ہوگا۔ برخوردار منشی عبد اللطیف کو میرا خط اپنے نام کا دکھا دیا ہوگا۔ اُن کی سعادت مندی سے یقین ہے کہ میری التماس قبول کریں اور ادھر متوجہ ہوں۔ کاپی لکھی جانی اور چھاپا ہونا شروع ہو گیا ہوگا۔ اگر پتھر بڑا ہے تو چاہیے آٹھ آٹھ صفحے بلکہ بارہ بارہ صفحے چھاپے جائیں اور کتاب جلد منطبع ہو جائے۔

بھائی، منشی صاحب کی شفقت کا حال پوچھنا ضرور نہیں۔ مجھ پر مہربان اور حسنِ کلام کے قدر دان ہیں۔ اس کی تصحیح میں بے پروائی کریں گے، تو کیا

---

(۱) صفحہ گزشتہ) مطلب یہ ہے کہ "میرزا نوشہ" نہ لکھیں۔ نہ "نجم الدولہ دبیر الملک" "نظام جنگ" جو میرزا کے اجزائے خطاب تھے۔

میری تفضیح کے روادار ہوں گے؟ بھائی، تم نے بھی اور منشی شیو نرائن صاحب نے بھی لکھا۔ میں ایک عبارت لکھتا ہوں اگر پسند آئے تو خاتمہ کتاب میں چھاپ دو۔
"نامہ نگار غالب خاکسار کا یہ بیان ہے کہ یہ جو میری سرگذشت کی داستان ہے، اس کو میں نے مطبع مفید خلائق میں چھپوایا ہے اور میری لائے میں اس کا یہ قاعدہ قرار پایا ہے کہ اور صاحبان مطابع جب تک مجھ سے طلب رخصت نہ کریں، اپنے مطبع میں اس کے چھاپنے پر جرأت نہ کریں"۔
اس کے سوا اگر کوئی طرح کی تحریر منظور ہو تو منشی شیو نرائن صاحب کو اجازت ہے کہ میری طرف سے چھاپ دیں۔ یہ سب باتیں پہلے بھی لکھ چکا ہوں۔ اب دو امر ضروری الاظہار تھے، اس واسطے یہ خط لکھا ہے: ایک تو اردو عبارت، دوسرے یہ کہ میرے شفیق مکرم سیّد مکرم حسین صاحب کا خط میرے نام آیا ہے اور انھوں نے ایک بات جواب طلب لکھی ہے۔ اس کا جواب اسی خط میں لکھتا ہوں۔ تم کو چاہیے کہ ان سے کہہ دو، بلکہ یہ عبارت اُن کو دکھا دو۔
بندہ پرور نواب عطا اللہ خاں میرے بڑے دوست اور شفیق ہیں۔ اُن کے فرزند رشید میر غلام عباس المخاطب بہ سیف الدولہ یہ دونوں صاحب صحیح وسالم ہیں۔ شہر سے باہر دو چار کوس پر کوئی گاؤں ہے، وہاں رہتے ہیں۔ شہر میں اہل اسلام کی آبادی کا حکم نہیں اور ان کے مکانات قرق ہیں۔ نہ ضبط ہو گئے ہیں نہ واگذاشت کا حکم ہے۔

(۵۰)

مشفق میرے، کرمفرما میرے۔
تمھارا خط اور تین دو ورقے چھاپے کے پہنچے۔ شاید میرے دکھانے کے واسطے بھیجے گئے ہیں، ورنہ رسم تو یوں ہے کہ پہلے صفحہ پر کتاب کا نام اور

مصنّف کا نام اور مطبع کا نام چھاپتے ہیں اور دوسرے صفحہ پر لوح سیاہ قلم سے بنتی ہے اور کتاب لکھی جاتی ہے۔ اس کا بھی چھاپا اسی طرح ہو گا۔ غرضکہ تقطیع اور شمار سطور اور کاپی کا حسن خط اور الفاظ کی صحت سب میرے پسند۔ صحت الفاظ کا کیا کہنا ہے، واللہ بے مبالغہ کہتا ہوں کہ اگر بھائی منشی نبی بخش صاحب بدل متوجہ ہوں تو اگر احیاناً اصل نسخہ میں سہو کاتب سے غلطی واقع ہوئی ہو تو اس کو بھی صحیح کر دیں گے۔ تم میری طرف سے ان کو سلام کہنا بلکہ یہ خط دکھا دینا۔ خدا کرے انجام تک یہی قلم اور یہی خط اور یہی طرز تصحیح چلی جائے۔ جدول بھی مطبوع ہے۔ پہلے صفحہ کی صورت اور دوسرے صفحہ کی لوح بھی خدا چاہے تو دل پسند اور نظر فریب ہو گی۔ کاغذ کے باب میں یہ عرض ہے کہ "فرنچ" کاغذ اچھا ہے۔ چھ جلدیں جو نذرِ حکام ہیں، وہ اس کاغذ پر ہوں اور باقی چاہو "شیو رامپوری" پر اور چاہو نیلے کاغذ پر چھاپو اور یہ بات کہ دو جلدیں جو ولایت جانے والی ہیں اس کاغذ پر چھاپی جائیں اور باقی شیو رام پوری پر یا نیلے کاغذ پر، یہ تکلف محض ہے۔ یہاں کے حاکموں نے کیا کیا ہے کہ اُن کی نذر کی کتابیں اچھے کاغذ پر نہ ہوں؟ مگر جو ایسا ہی صرف اور خرچ زائد پڑتا ہو تو خیر دو جلدیں اس کاغذ پر اور چار جلدیں شیو رامپوری پر ہوں۔ باقی جلدوں میں تمھیں اختیار ہے۔ ہاں صاحب اگر ہو سکے تو کاپی کی سیاہی ذرا اور سیاہ اور درخشندہ ہو اور آخر تک رنگ نہ بدلے۔ آگے اس سے میں نے برخوردار منشی عبدالطیف کو لکھا تھا کہ ان چھ کتابوں کی کچھ تزئین اور آرائش کی فکر کریں۔ معلوم نہیں تم نے وہ پیام ان کو پہنچایا یا نہیں۔ آپ اور منشی عبداللطیف اور میرزا حاتم علی صاحب مہر باہم صلاح کریں اور کوئی بات خیال میں آوے تو بہتر ورنہ ان چھ نسخوں کی جلدیں انگریزی ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو روپے کی لاگت سے بنوا دینا اور اس کا روپیہ

تیاری سے پہلے مجھ سے منگو الینا۔

آنکہ ہمہ را در یک دم بہ نوید بشو پدید آورد اگر دردم دگر بہ نہیب مباش بہم زند الخ اس میں "نہیب" کا لفظ کچھ میری سہل انگاری سے اور کچھ سہو کاتب سے رہ گیا ہے۔ اس کو تیز چاقو سے چھیل کر "بہ نوائے" لکھ دینا۔ یعنی "بہ نوائے مباش بہم زند"۔ ضرور ضرور اور اس کا انتظار نہ کیجیو کہ جب یہاں چھاپا آئے گا تو بنا دیں گے۔ نہ اصل کتاب میں غلط رہے، نہ چھاپے میں غلط ہو۔ اگر اجزائے اصل میر امیر علی صاحب کاپی نویس کے پاس ہوں تو ان کو یا بھائی نبی بخش صاحب کو یہ رقعہ دکھا کر سمجھا دینا اور بنوا دینا۔

روز سہ شنبہ ہفتم ستمبر ۱۸۵۸ء   از غالب

(۵۱)

اچھا، میرا بھائی "نہیب" والے دو ورقے چار سو ہوں، پانسو ہوں سب بدلوا ڈالنا۔ کاغذ کا جو نقصان ہو وہ مجھ سے منگوا لینا۔ اس لفظ کے رہ جانے میں ساری کتاب نکمی ہو جائے گی اور میرے کمال کو دھبہ لگ جائے گا۔ یہ لفظ عربی ہے، ہرچند مسودہ میں بنا دیا تھا لیکن کاتب کی نظر سے رہ گیا۔

لکھتے ہو کہ مرزا صاحب دو جلدیں درست کریں گے۔ یہ صورت اور ہے۔ یعنی میں نے چھ جلدیں بارہ روپے کی لاگت میں بکار سازی و ہنر پردازی منشی عبداللطیف چاہیں تھیں۔ منتظر تھا کہ اب ان کا قبول کرنا مجھ کو لکھو گے اور روپیہ مجھ سے منگواؤ گے۔ ظاہرا عبداللطیف نے پہلو تہی کی۔ مرزا صاحب اگر کفیل ہوئے تو چھ جلدیں بنواتے، نہ کہ دو۔ البتہ اس احتمال کی گنجایش ہے کہ دو بہت پُر تکلف اور چار بہ نسبت اس کے کچھ کم۔ اگر یوں ہے تو یہ مدعائے دلی میرا ہے، مگر اطلاع ضرور ہے۔

والے امید سنگھ کے نام کا خط باحتیاط رہنے دو۔ جب وہ آئیں ان کو دے دو۔ جو تم لکھتے ہو کہ "نہیب" کا لفظ لکھ دیا گیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چھاپا شروع ہو کر دُور تک پہنچ گیا۔ کیا عجب ہے کہ کتابیں جلد منطبع ہو جائیں۔

ہمارے منشی شیو نرائن صاحب اپنے مطبع کے اخبار میں اس کتاب کے چھاپے کا اشتہار کیوں نہیں چھاپتے تا کہ درخواستیں خریداروں کی فراہم ہو جائیں؟

میرزا تفتہ، سنو: ان دنوں میں میرے محسن حکیم احسن اللہ خاں "آفتاب عالمتاب" کے خریدار ہوئے ہیں اور میں نے بموجب اُن کے کہنے کے برادرِ دینی مولانا مہر کو لکھا ہے۔ حضرت نے لا و نعم جواب میں نہیں لکھا۔ تم اُن سے کہو کہ وہ ستمبر ۱۸۵۸ء سے خریدار ہیں۔ آج ۱۶ ستمبر کی ہے۔ دو نمبر اخبار کے، حکیم صاحب کے نام کا سرنامہ، خان چند کے کوچے کا پتہ لکھ کر روانہ کریں۔ آیندہ ہفتہ بہ ہفتہ بھیجے جائیں اور حکیم احسن اللہ خاں کا نام خریداروں میں لکھ لیں۔ دوسرے اخبار مذکور میں ایک صفحہ، ڈیڑھ صفحہ، بادشاہ دہلی کے اخبار کا ہوتا ہے جس دن سے کہ وہ اخبار شروع ہوا ہے، اُس دِن سے صرف اخبار شاہی کا صفحہ نقل کر کے ارسال کریں۔ کاتب کی اجرت اور کاغذ کی قیمت یہاں سے بھیج دی جائے گی۔ بھائی، تم مرزا صاحب سے اس کو کہہ کو جواب لو اور مجھ کو اطلاع دو۔ "نہیب" کے نہیب سے مرا جاتا ہوں اس کی درستی کی خبر بھیجو۔ باقی جو چھاپے کے حالات ہوں، اس کی آگہی ضرور ہے۔

پنجشنبہ۔ ۱۶ ستمبر ۱۸۵۸ء غالب

(۵۲)

بھائی، مجھ میں تم میں نامہ نگاری کا ہے کو ہے، مکالمہ ہے۔ آج صبح کو ایک

خط بھیج چکا ہوں، اب اس وقت تمہارا خط اور آیا۔ سنو صاحب! لفظ مبارک میم، حا، میم، دال (یعنی محمّد) اس کے ہر حرف پر میری جان نثار ہے، مگر چونکہ یہاں سے ولایت تک حکام کے ہاں سے یہ لفظ یعنی "محمد اسد اللہ خاں" نہیں لکھا جاتا، میں نے بھی موقوف کر دیا ہے[1]۔ رہا "میرزا" و "مولانا" و "نواب" اس میں تم کو اور بھائی کو اختیار ہے، جو چاہو سو لکھو۔

بھائی کو کہنا اُن کے خط کا جواب صبح روانہ کر چکا ہوں۔ مرزا تفتہ اب تم تزئین جلد ہائے کتاب کے باب میں برادر زادہ سعادت مند[2] کو تکلیف نہ دو۔ مولانا مہرباں کو اختیار ہے، جو چاہیں سو کریں۔

خط تمام کر کے خیال میں آیا کہ وہ جو مرزا صاحب سے مجھ کو مطلوب ہے، تم پر بھی ظاہر کروں۔ صاحب، وہاں ایک اخبار موسوم بہ "آفتاب عالمتاب" نکلتا ہے اس کے مہتمم نے التزام کیا ہے کہ ایک صفحہ یا ڈیڑھ صفحہ بادشاہ دہلی کے حالات کا لکھتا ہے۔ نہیں معلوم آغاز کس مہینے سے ہے۔ حکیم احسن اللہ خاں یہ چاہتے ہیں کہ سابق کے جو اوراق ہیں، جب سے ہوں، وہ چھاپے خانے میں مسودہ رہتے ہیں۔ اس کی نقل کاتب سے لکھوا کر یہاں بھیجی جائے۔ اجرت جو لکھی آئے گی، وہ بھیجی جائے گی۔ اور ابتدائے ۱۸۵۵ء سے اُن کا نام خریداروں میں لکھا جائے۔ دو ہفتہ کے دو نمبر اُن کو ایک لفافہ میں بھیج دیے جائیں اور پھر ہر مہینے، ہفتہ در ہفتہ اُن کو لفافہ اخبار کا پہنچا کرے۔ یہ مراتب جناب مرزا حاتم علی صاحب کو لکھ چکا ہوں اور اب تک آثار قبول ظاہر نہیں ہوئے، نہ لفافے حکیم صاحب کے پاس پہنچے، نہ اُن صفحات کی نقل میرے پاس آئی۔ آپ کو اس میں سعی ضرور ہے۔ اور ہاں صاحب "آفتاب عالمتاب" کا مطبع

---

[1] مطلب یہ ہے کہ تفتہ نے پوچھا تھا۔ کتاب پر محمد اسد اللہ خاں لکھا جائے، نیز میرزا، مولانا اور نواب میں سے کیا لکھا جائے؟ [2] یعنی مرزا حاتم علی بیگ مہر

تو "کشمیری بازار" میں ہے، مگر آپ مجھ کو لکھیں کہ مفید خلائق کا مطبع کہاں ہے؟ عجب ہے کہ ان صاحب شفیق نے میری تحریرات کا جواب نہیں لکھا۔ فرمایش حکیم احسن اللہ خاں صاحب کی بہت اہم ہے۔ عند الملاقات میرا سلام کہہ کر اس کا جواب، بلکہ وہ اخبار ان سے بھجواؤ۔

جمعہ ۱۷ ستمبر ۱۸۵۸ء غالب

(۵۳)

بھائی،

آج صبح کو بہ سبب حکیم صاحب کے تقاضے کے شکوہ آمیز خط جناب مرزا صاحب کی خدمت میں لکھ کر بھیجا۔ کل یا ان خط ڈاک میں ڈال کر آیا ہی تھا کہ ڈاک کا ہرکارہ ایک خط تمھارا اور ایک خط مرزا صاحب کا لایا۔ اب کیا کروں! خیر چپ ہو رہا۔ شکوہ محبت بڑھائے گا۔ مرزا صاحب کی عنایت کا شکر بجا لاتا ہوں۔ یقین ہے کہ جلد میرے خاطر خواہ بن جائیں گی۔ کس واسطے کہ جو آج کے خط میں انھوں نے لکھا ہے، وہ بعینہٖ میرا مکنونِ ضمیر ہے۔ خدا ان کو سلامت رکھے۔ میرا سلام کہہ دینا۔ اُن کے خط کا جواب کل پرسوں بھیجوں گا۔

رائے امید سنگھ بہادر خوبانِ روزگار میں سے ہیں۔ فقیر کا سلام نیازمندانہ ان کو کہہ دینا۔ خدا کرے ان کے سامنے کتابیں چھپ چکیں۔ بارے، جب وہ گوالیار کو تشریف لے جائیں تو مجھ کو اطلاع لکھنا۔

"نہیب" کے جگہ "نوائے" بن جانے سے خاطر جمع ہو گئی۔ بھائی، میں فارسی کا محقق ہوں۔ کاتب اُن اجزا کا، جن کی رو سے پہلی کاپی لکھی جاتی ہے، فارسی کا عالم ہے۔ علم اس کا غیاث الدین رامپوری[۱] اور حکیم محمد حسین[۲] دکنی سے زیادہ ہے۔

۱ صاحب غیاث اللغات ۲ صاحب برہان قاطع۔

تصحیح سے غرض یہ ہے کہ کاپی سراسر موافق ان اوراق کے ہو، نہ یہ کہ فرہنگوں میں دیکھا جائے۔ آگے اس سے تم کو بھی اور بھائی کو بھی لکھ چکا ہوں۔ اب صرف اس تحریر کا اشارہ لکھنا منظور تھا۔ آج جس طرح مجھ کو تمھارا اور مرزا صاحب کا خط پہنچا، لازم تھا کہ حکیم صاحب کو بھی لفافہ اخبار پہنچ جاتا۔ مگر اس وقت تک نہیں پہنچا اور یہ دوپہر کا وقت ہے۔ خیر پہنچ جائے گا۔ میں نے تمھارا خط اُن کے پاس بھیج دیا تھا۔ انھوں نے تمھاری رائے منظور کی۔ اب تم وہ اخبار کہ جس طرح تم نے لکھا ہے ان کے پاس بھیج دو اور صاحب مطبع قیمت اخبار اور اجرت کاتب ان کو لکھ بھیجے۔ اپنے نام اور مسکن سے ان کو اطلاع دے۔ پس اس کو اپنے طور پر روپیہ بھیج دیں گے۔ ہم تم واسطہ شناسائی ہمدگر ہو گئے۔ ہاں اگر احیاناً روپے کے بھیجنے میں دیر ہوگی تو میں کہہ کر بھجوا دوں گا۔ یہ البتہ میرا ذمہ ہے۔

(۵۴)

صاحب،

قصیدہ کے چھاپے جانے کی بشارت صاحب مطبع نے مجھ کو بھی دی ہے۔ خدا ان کو سلامت رکھے۔ کل مرزا صاحب کے خط میں ان کو ایک مصرع کسی استاد کا لکھ چکا ہوں۔ میرا سلام کہنا اور لفافہ اخبار کے نہ پہنچنے کی اطلاع دینا۔ میرے نام کا کوئی لفافہ ضائع نہیں جاتا۔ خدا جانے اس پر کیا بجگ پڑا۔ ظاہرا انھوں نے پوسٹ پیڈ بھیج دیا ہوگا۔ پھر پوسٹ پیڈ بھی کیوں تلف ہو۔

"شیہہ" بمعنی "صدائے اسپ" لغت فارسی ہے بہ شین مکسورہ و یائے معروف و ہائے ہوز مفتوح اور ہائے ثانی زدہ اور عربی میں اس کو "صہیل" کہتے ہیں۔ "صیہہ" کوئی لغت نہیں ہے نہ عربی، نہ فارسی۔ اگر غنیمت کے کلام میں "صیہہ" لکھا ہے تو کاتب کی غلطی ہے

[۱] یعنی محکمہ تعلیمات میں ہیں۔

غنیمت کا کیا گناہ؟ اصل مصرع یوں ہے: ور خود ز روے ہندسہ گاہے شمار یافت۔ میں نے سہو سے، خدا جانے، کیوں کر لکھ دیا ہے۔ بھائی "مہرخوان" کے دو معنی ہیں ایک تو "خطاب" جو سلاطین امرا کو دیں اور دوسرے وہ نام جو لڑکوں کا پیار سے رکھیں، یعنی "عرف"۔ حاشیے پر شوق سے لکھوا دو، مگر تم نے دیکھا ہو گا کہ اس عبارت سے، جو تمہارے ذکر میں ہے، پہلے مہرخوان کے معنی حاشیہ پر چڑھ گئے ہیں۔ مکرر لکھنے کی حاجت کیا ہے؟ اور اگر لکھ بھی دو تو قباحت کیا ہے؟ بھائی صاحب کیوں مضائقہ فرمائیں؟ حال اوراق کی تحریر کا معلوم ہوا۔ صاحبان کونسل کی رائے ولایت آگرہ یعنی میرے محکمے میں منظور و مقبول۔ نام میرا جس طرح چاہو لکھ دو[1]

سی ام ستمبر ۱۸۵۸ء

(۵۵)

کیوں صاحب، اس کا کیا سبب ہے کہ بہت دن سے ہماری آپ کی ملاقات نہیں ہوئی نہ مرزا صاحب ہی آئے، نہ منشی صاحب ہی تشریف لائے۔ ہاں ایک بار منشی شیو نرائن صاحب نے کرم کیا تھا اور خط میں یہ رقم کیا تھا کہ اب ایک فرمہ باقی رہا ہے، اس راہ سے میں یہ تصور کر رہا ہوں کہ اگر ایک فرمہ نثر کا باقی تھا تو اب قصیدہ چھاپا جاتا ہو گا اور اگر فرمہ قصیدہ کا تھا تو اب جلدیں بننی شروع ہو گئی ہوں گی۔

تم سمجھے، میں تمہارے اور بھائی منشی نبی بخش صاحب اور جناب مرزا حاتم علی صاحب کے خطوط کے آنے کو تمہارا اور ان کا آنا سمجھتا ہوں۔ تحریر گویا وہ مکالمہ ہے جو باہم ہوا کرتا ہے۔ پھر تم کہو مکالمہ کیوں موقوف ہے؟ اور اب کیا دیر ہے؟ اور وہاں کیا ہو رہا ہے؟ بھائی صاحب کو کاپی کی تصحیح سے فراغت ہو گئی۔ مرزا صاحب

[1] اس جگہ مہر کے نام رقعہ تھا جو مہر کے مکاتیب میں ملے گا۔

نے جلدیں صحاف کو دے دیں۔ اب میں ان کتابوں کا آنا کب تک تصوّر کروں؟ دسہرے میں ایک دو دن کی تعطیل مقرر ہوتی ہوگی۔ کہیں دوالی کی تاریخ تک نوبت نہ پہنچ جائے۔

ہاں صاحب، تم نے کبھی کچھ حال قمرالدین خاں صاحب کا نہ لکھا۔ آگے اس سے تم نے اگست، ستمبر میں ان کا آگرے کا آنا لکھا۔ پھر وہ اکتوبر تک کیوں نہ آئے؟ وہاں تو منشی غلام غوث خاں صاحب اپنا کام بدستور کرتے ہیں، پھر یہ اس فکر میں کیا کر رہے ہیں؟ کہیں کسی اور کام پر معین ہو گئے ہیں؟ اس کا حال جلد لکھو۔ مجھ کو یاد پڑتا ہے کہ تم نے لکھا تھا کہ منشی غلام غوث خاں صاحب کو ایک گاؤں جاگیر میں ملا ہے، مولوی قمرالدین خاں صاحب اس کے بندوبست کو آیا چاہتے ہیں، اس کا ظہور کیوں نہ ہوا؟ ان سب باتوں کا جواب جلد لکھیے۔ جناب مرزا صاحب کو میرا سلام کہیے اور یہ پیغام کہیے کہ کتاب کا حسن کانوں سے سُنا، دل کو دیکھے زیادہ یقین آیا، مگر آنکھوں کو رشک ہے کانوں پر اور کان چشمک زنی کر رہے ہیں آنکھوں پر۔ یہ ارشاد ہو کہ آنکھوں کا حق آنکھوں کو کب تک ملے گا بھائی صاحب کو بعد از سلام کہیے گا کہ حضرت اپنے مطلب کی تو مجھ کو جلدی نہیں ہے، آپ کی تخفیف تصدیع چاہتا ہوں۔ یعنی اگر کاپی کا قصّہ تمام ہو جائے تو آپ کو آرام ہو جائے۔ جناب منشی شیو نرائن صاحب کی عنایتوں کا شکر میری زبانی ادا کیجیے گا اور یہ کہیے گا کہ آپ کا خط پہنچا۔ چونکہ میرے خط کا جواب تھا اور معہذا کوئی امر جواب طلب نہ تھا۔ اس واسطے اس کا جواب نہیں لکھا۔ زیادہ، زیادہ

نگاشتہ و رواں داشتہ صبح شنبہ ۱۶ ؍ اکتوبر ۱۸۵۸ء — غالب

(۵۶)

اللہ اللہ! ہم تو کول سے تمھارے خط کے آنے کے منتظر تھے، ناگاہ کل جو خط

آیا، معلوم ہُوا کہ دو دن کول میں رہ کر سکندر آباد گئے ہو اور وہاں سے تم نے خط لکھا ہے۔ دیکھئے اب یہاں کب تک رہو اور آگے کب جاؤ۔ پرسوں برخوردار شیو نرائن کا خط آیا تھا لکھتے تھے کہ کتابوں کی شیرازہ بندی ہو رہی ہے، اب قریب ہے کہ بھیجی جائیں۔ مرزا مہر بھی ایک ہفتہ بتاتے ہیں۔ دیکھیے کس دن کتابیں آجائیں۔ خدا کرے سب کام دلخواہ بنا ہو۔

ہاں صاحب، منشی بالمکند بے صبر کے ایک خط کا جواب ہم پر فرض ہے۔ میں کیا کروں کہ اس خط میں انھوں نے اپنا سیر و سفر میں مصروف ہونا لکھا تھا پس میں ان کے خط کا جواب کہاں بھیجتا؟ اگر تم سے ملیں تو میرا سلام کہہ دینا اور مطبع آگرہ سے کتابوں کا حال تو تم خود دریافت کر ہی لو گے، میرے کہنے اور لکھنے کی کیا حاجت؟

غالب

چہار شنبہ سیوم نومبر ۱۸۵۸ء

(۵۷)

کیوں صاحب، کیا یہ آئین جاری ہُوا ہے کہ سکندر آباد کے رہنے والے دلّی کے خاک نشینوں کو خط نہ لکھیں؟ بھلا اگر یہ حکم ہُوا ہوتا، تو یہاں بھی تو اشتہار ہو جاتا کہ زنہار کوئی خط سکندر آباد کو یہاں کی ڈاک میں نہ جائے۔ بہ ہر حال:

کس بشنود یا نشنود من گفتگوے می کنم

کل جمعہ کے دن ۱۲ تاریخ نومبر کو تینتیس جلدیں بھیجی ہوئی برخوردار شیو نرائن کی، پہنچیں۔ کاغذ، خط، تقطیع، سیاہی، چھاپا سب خوب۔ دل خوش ہُوا اور شیو نرائن کو دعا دی۔ سات کتابیں جو مرزا حاتم علی صاحب کی تحویل میں ہیں، وہ بھی یقین ہے کہ آج کل پہنچ جائیں۔ معلوم نہیں منشی شیو نرائن نے اندور کو واسطے اُمید سنگھ کے کس طرح بھیجی ہیں یا ابھی نہیں بھیجیں۔

صاحب، تم اس خط کا جواب جلد لکھو اور اپنے قصد کا حال لکھو۔ سکندر آباد

کب تک رہو گے، آگرہ کب جاؤ گے؟

شنبہ ۱۳ر نومبر ۱۸۵۸ء جواب طلب۔

(۵۸)

آج پنجشنبہ کے دن ۱۸ر نومبر کو تمھارا خط آیا اور میں آج ہی جواب لکھتا ہوں۔ کیا تماشا ہے کہ تمھارا خط پہنچتا ہے اور میرا خط نہیں پہنچتا۔ میرے خط نہ پہنچنے کی دلیل یہ ہے کہ تم نے اصلاحی غزل کی رسید نہیں لکھی۔ میں نے کتب کا پہنچنا تم کو لکھا تھا، اس کا تم نے ذکر نہ لکھا۔ صاحب تینتیس کتابیں پہنچ گئیں اور تقسیم ہو گئیں۔ سات کتابیں مرزا تفتہ کی بھیجی ہوئی موافق ان کی تحریر کے آج شام تک، اور مطابق منشی شیو نرائن کی اطلاع کے کل تک، میرے پاس پہنچ جائیں گی اور منشی شیو نرائن نے اندورہ کی کتابوں کی روانگی کی بھی اطلاع دی ہے۔

منشی نبی بخش صاحب تمھارے خط نہ لکھنے کا بہت گلہ رکھتے ہیں۔ شاید میں تم کو بھی لکھ چکا ہوں۔ میر قاسم علی صاحب کی بدلی کا حال معلوم ہوا۔ یہ میرے بڑے دوست ہیں۔ دلی ان دنوں میں آئے تھے۔ مجھ سے مل گئے ہیں۔ اُن کو ایک کتاب ضرور بھیج دینا۔

بھائی میں ہرگز نہیں جانتا کہ میر بادشاہ دہلوی کون ہیں اور پھر ایسے کہ جو کہیں کے منصف ہوں۔ کچھ ان کے خاندان کا حال اور ان کے والد کا نام لکھو تو میں کچھ غور کروں، ورنہ میں تو اس نام کے آدمی سے آشنا نہیں ہوں۔

غالب

پنجشنبہ ۱۸ر نومبر ۱۸۵۸ء دوپہر

(۵۹)

برخوردار،

تمھارا خط پہنچا۔ اصلاحی غزلوں کی رسید معلوم ہوئی مقطع اب اچھا ہو گیا،

رہنے دو۔ کل جمعہ کے دن ۱۹ نومبر کو سات کتابوں کا پارسل بھیجا ہوا مولانا مہر کا پہنچا۔ زبان نہیں جو تعریف کروں۔ شاہانہ آرائش ہے، آفتاب کی سی نمائش ہے۔ مجھے یہ فکر کہ کہیں ان کا روپیہ تیاری میں صرف نہ ہوا ہو۔ اچھا میرے بھائی اس کا حال جو تم کو معلوم ہے مجھ کو لکھ بھیجو۔

رقعات کے چھاپے جانے میں ہماری خوشی نہیں ہے۔ لڑکوں کی سی ضد نہ کرو اور اگر تمہاری خوشی اسی میں ہے تو صاحب مجھ سے نہ پوچھو، تم کو اختیار ہے۔ یہ امر میرے خلاف رائے ہے۔

میر بادشاہ کی اور اپنی ناشناسائی آگے تم کو لکھ چکا ہوں۔ اب اس خط سے معلوم ہوا کہ وہ تمہارے اور امراؤ سنگھ کے آشنا ہیں۔ کچھ ان کے خاندان کا نام و نشان دریافت ہو تو مجھ کو بھی لکھ بھیجو تاکہ میں جانوں کہ یہ کس گروہ میں سے ہیں۔ میاں وہ "راست دروغ برگردن راوی" نے مجھ کو بہت پریشان کیا ہے۔ واسطے خدا کے جو راوی نے روایت کی ہے، وہ مجھ کو ضرور لکھو اور تاج گنج کے رہنے والوں کی ابتری کی حقیقت سے بھی اطلاع دو۔ حکم عفو تقصیر عام ہو گیا ہے۔ لوٹنے والے آتے جاتے ہیں اور آلات حرب وبیکار دے کر توقیع آزادی پاتے ہیں۔ یہ دو شخص کیسے مجرم تھے جو مقید ہوئے؟

غالب

محررہ صبح شنبہ ۲۰ نومبر ۱۸۵۸ء

(۶۰)

میرزا تفتہ، تمہارا خط آیا، فقیر کو حقیر کا حال معلوم ہوا۔ خدا فضل کرے۔ اگر تم اس راز کے اظہار کو منع نہ کرتے تو بھی میرا شیوہ ایسا لغو نہیں ہے کہ میں ان کو لکھتا۔ لکھتے ہیں کہ میرزا مہر کے دو چار روپے زائد صرف ہو گئے تو کیا اندیشہ ہے؟ حال یہ ہے کہ میں نے اُن سے استفسار کیا تھا، انھوں نے مجھ کو لکھا کہ کتابوں کی درستی

میں بارہ روپے صرف ہوتے ہیں۔ محصول کی ایک رقمِ خفیف اگر میں نے اپنے پاس سے دی تو اس کا مضائقہ؛ مجھ کو تمہارا قول مطابقِ واقع نظر آتا ہے۔ البتہ ان کے دو تین روپے اٹھ گئے ہوں گے۔

لالہ گنگا پرشاد، شاد تخلص، اپنے کو تمہارا شاگرد بتاتے ہیں، گو ریختہ کہتے ہیں۔ کئی دن ہوئے یہاں آئے اور بالمکند بے صبر کی غزلیں اصلاح کو لائے اور دیکھ کر ان کے حوالے کر دیں۔

ہنری اسٹوارٹ ریڈ صاحب ممالکِ مغربی کے مدرسوں کے ناظم اور گورنمنٹ کے بڑے مصاحب ہیں۔ امن کے دنوں میں ایک ملاقات میری ان کی ہوئی تھی۔ میں نے اب ایک کتاب سادہ بے جلد ان کو بھیجی تھی۔ کل ان کا خط مجھ کو اس کتاب کی رسید میں آیا۔ بہت تعریف لکھتے تھے اور وہاں بھی ایک تماشا اور رہے، مجھ کو لکھتے تھے کہ یہ "دستنبو" پہلے اس سے کہ تم بھیجو، مطبع مفید خلائق نے ہمارے پاس بھیجی ہے اور ہم اس کو دیکھ رہے اور خوش ہو رہے تھے کہ تمہارا خط مع کتاب کے پہنچا۔ ان کے اس لکھنے سے یہ معلوم ہوا کہ مطبع میں سے گورنر کی نذر بھی ضرور گئی ہوگی۔ کیا اچھی بات ہے کہ وہاں بھی میرے بھیجنے سے پہلے میرا کلام پہنچ جائے گا۔ چیف کمشنر پنجاب کو یہ کتاب بھیج چکا ہوں اور نواب گورنر کی نذر اور ملکہ کی نذر اور سکرٹریوں کی نذر یہ پارسل انشاء اللہ تعالیٰ آج روانہ ہو جائیں گے۔ دیکھوں، چیف کمشنر کیا لکھتے ہیں اور گورنر کیا فرماتے ہیں

تا نہال دوستی کے بر دہد　　حالیا رفتیم و تخمے کاشتیم

غالب
شنبہ ۲۸ نومبر ۱۸۵۸ء

۱۔ سخنِ شعرا میں ہے کہ بال مکند لالہ کانجی مل کے بیٹے۔ سکندر آباد ضلع بلند شہر کے باشندے اور ہر گوپال تفتہ کے شاگرد تھے۔ زیادہ تر فارسی شعر کہتے تھے۔ میرزا کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بے صبر خود ان سے اصلاح لیتے تھے۔

(۱۶)

صاحب،

تمھارا خط آیا۔ میں نے اپنے سب مطالب کا جواب پایا۔ امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے مجھ کو رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ! ایک وہ ہیں کہ دو بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں۔ ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے، نہ تو پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے۔ اس کو سمجھاؤ کہ میں تیرے بچوں کو پال لوں گا تو کیوں بلا میں پھنستا ہے؟

وہ جو مصرع تم نے لکھا ہے وہ حکیم سنائی[1] کا ہے اور وہ نقل "حدیقہ" میں مرقوم ہے:

پسرے با پدر بزاری گفت ۔۔۔ کہ مرا یار شو بہ ہمرہ جفت
گفت بابا، زنا کن و زن نے ۔۔۔ پند از خلق گیرد از من نے
در زنا، گر بگیروت عسسے ۔۔۔ بھلد، کو گرفت چوں تو بسے
زن کنی ہر گزت رہا نہ کند ۔۔۔ در تو بگذاریش چہا نہ کند

بس تو اب تم سکندر آباد میں رہے۔ کہیں اور کیوں جاؤ گے؟ بنک گھر کا روپیہ اٹھا چکے ہو، اب کہاں سے کھاؤ گے؟ میاں نہ میرے سمجھانے کو دخل ہے، نہ تمھارے سمجھنے کی جگہ ہے۔ ایک چرخ ہے کہ وہ چلا جاتا ہے۔ جو ہونا ہے وہ ہوا جاتا ہے۔ اختیار ہو تو کچھ کیا جائے، کہنے کی بات ہو تو کچھ کہا جائے۔ مرزا عبدالقادر بیدل خوب کہتا ہے:

---

[1] حکیم سنائی غزنوی اکابر صوفی شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ مولانا روم فرماتے ہیں:

عطار روح بود و سنائی دو چشم، ۔۔۔ ما از پس سنائی و عطار آمدیم

"حدیقۃ الحقیقہ" ان کی سب سے مشہور اور مستند کتاب ہے۔

رغبتِ جاہ چہ و نفرتِ اسباب کدام — زیں ہوسہا بگذر، یا مگذر، مے گزرد

مجھ کو دیکھو کہ نہ آزاد ہوں نہ مقید، نہ رنجور ہوں نہ تندرست، نہ خوش ہوں نہ ناخوش، نہ مردہ ہوں نہ زندہ۔ جیے جاتا ہوں، باتیں کیے جاتا ہوں۔ روٹی روز کھاتا ہوں، شراب گاہ گاہ پیے جاتا ہوں جب موت آئے گی مر رہوں گا۔ نہ شکر ہے نہ شکایت ہے، جو تقریر ہے بہ سبیل حکایت ہے۔ بارے جہاں رہو جس طرح رہو، ہر ہفتے میں ایک بار خط لکھا کرو۔

یک شنبہ ۱۹ دسمبر ۱۸۵۸ء — غالب

(۶۲)

کیوں صاحب، روٹھے ہی رہو گے یا کبھی منو گے بھی؟ اور اگر کسی طرح نہیں منتے تو روٹھنے کی وجہ تو لکھو۔ میں اس تنہائی میں صرف خطوں کے بھروسے جیتا ہوں۔ یعنی جس کا خط آیا میں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لایا۔ خدا کا احسان ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا، جو اطراف و جوانب سے دو چار خط نہیں آ رہتے ہوں بلکہ ایسا بھی دن ہوتا ہے کہ دو دو بار ڈاک کا ہرکارہ خط لاتا ہے، ایک دو صبح کو ایک دو شام کو۔ میری دل لگی ہو جاتی ہے۔ دن ان کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں گزر جاتا ہے۔ یہ کیا سبب؟ دس دس دِن بارہ بارہ دِن سے تمہارا خط نہیں آیا، یعنی تم نہیں آئے۔ خط لکھو صاحب، نہ لکھنے کی وجہ لکھو۔ آدھ آنے میں بخل نہ کرو۔ ایسا ہی ہے تو بیرنگ بھیجو۔

سوموار ۲۷ دسمبر ۱۸۵۸ء — غالب

(۶۳)

دیکھو صاحب،

یہ باتیں ہم کو پسند نہیں۔ ۱۸۵۸ء کے خط کا جواب ۱۸۵۹ء میں بھیجتے ہو

اور مزا یہ ہے کہ جب تم سے کہا جائے گا تو یہ کہو گے کہ میں نے دوسرے ہی دِن جواب لکھا ہے۔ لُطف اِس میں ہے کہ میں بھی سچا اور تم بھی سچّے۔

آج تک راے امید سنگھ یہیں ہیں اور ابھی نہیں جائیں گے۔ تمہارا مدعا حاصل ہو گیا ہے۔ جس دِن وہ آئے تھے، اسی دِن مجھ سے کہہ گئے تھے۔ میں بھُول گیا اور اس خط میں تم کو نہ لکھا۔ صاحب وہ فرماتے تھے کہ میں نے کئی مجلد مرزا تفتہ کے دیوان کے اور کئی نسخے تضمین اشعار گلستان کے ان کی خواہش کے بموجب، کوئی پارسی ہے بمبئی میں، اُس کے پاس بھیج دیے ہیں۔ یقین ہے کہ وہ ایران کو ارسال کر دے گا۔ اُمید سنگھ نے اس پارسی کا نام بھی لیا تھا، میں بھول گیا۔ اب جو تم کو اس خیال میں مبتلا پایا تو ان کا بیان مجھ کو یاد آیا۔ جانتا ہوں کہ وہ کہاں رہتے ہیں۔ دو بار اُن کے گھر بھی گیا ہوں، مگر محلے کا نام نہیں جانتا۔ نہ میرے آدمیوں میں کوئی جانتا ہے۔ اب کسی جاننے والے سے پوچھ کر تم کو لکھ بھیجوں گا۔

میر بادشاہ سے عندالملاقات میری دعا کہہ دینا۔

لاحول ولا قوۃ الا باللہ لکھنے کے قابل بات پھر بھُول گیا۔ کل میر کرامت علی صفا تخلص کہ میں نے آگے ان کو کبھی نہیں دیکھا تھا، ناگاہ مجھ سے آ کر ملے اور تمہارا پوچھتے رہے۔ میں نے کہہ دیا کہ بخیر و عافیت سکندرآباد میں ہیں۔ جب میں نے اُن سے کہا کہ کیا وہ تمہارے آشنا ہیں۔ انھوں نے کہا صاحب وہ بزرگ اور استاد ہیں، میں اُن کا شاگرد ہوں۔ کہیں مدرسے کے علاقے میں نوکر ہیں[1]۔ بسبیل ڈاک آئے تھے اور آج ہی بسبیل ڈاک انبالے کو گئے۔ انبالہ اُن کا وطن ہے اور نوکر بھی وہ اسی ضلع میں ہیں۔

نگاشتہ دوشنبہ ۲۶ جنوری ۱۸۵۹ء غالب

---

[1] یعنی محکمہ تعلیمات میں۔

(۶۴)

صاحب،

تمھارا خط مع رقعہ مردِ سخن فہم پہنچا۔ سچ کہتا ہوں کہ تمھارے کلام کی تحسین کرنے والا فی الحقیقت اپنے فہم کی تعریف کرتا ہے۔ جواب میں درنگ اس راہ سے ہوئی کہ میں مصطفےٰ خاں کی ملاقات کو بہ سبیل ڈاک میرٹھ گیا تھا۔ تین دن وہاں رہا کل وہاں سے آیا۔ آج تم کو یہ خط بھجوایا۔

محررہ و مرسلہ چہار شنبہ ۲۶ جنوری سنہ ۱۸۵۹ء غالب

(۶۵)

صاحب،

میرٹھ سے آکر تم کو خط لکھ چکا ہوں۔ شاید نہ پہنچا ہو، اس واسطے از روے احتیاط لکھتا ہوں کہ نواب مصطفےٰ خاں کے ملنے کو بہ سبیل ڈاک میرٹھ گیا اور سہ شنبہ کے دن دلی آگیا اور چہار شنبہ کے دن تم کو خط بھیجا۔ کل آخر روز راجہ امید سنگھ بہادر میرے گھر آئے تھے تمھارا خط ان کے دکھانے کو رکھ چھوڑا تھا، وہ ان کو دکھایا۔ پڑھ کہ یہ فرمایا کہ کسی اور مندر میں قصد اقامت نہیں ہے۔ نیا ایک تکیہ بنایا چاہتا ہوں[1]۔ آدمی بند را بن گئے ہیں۔ کوئی مکان مول لیں گے۔ وہاں اپنی وضع پر رہونگا میرا سلام لکھنا اور یہ پیغام لکھنا کہ آپ کا کلام بمبئی تک پہنچ گیا۔ اب طہران کو بھی روانہ ہو جائے گا!

سواد ہند گرفتی بہ نظم خود تفتہ بیا کہ نوبت شیراز و وقت تبریز است

صبح یک شنبہ سی ام۔ جنوری سنہ ۱۸۵۹ء غالب

(۶۶)

صاحب، تم اچھے خاصے عارف ہو اور تمھارا کشف سچا ہے۔ میں راہ دیکھ رہا

---

[1] مطلب یہ ہے کہ اپنا مکان بنایا چاہتا ہوں

تھا کہ تمھارا خط آئے تو جواب لکھوں۔ کل تمھارا خط شام کو آیا۔ آج صبح کو جواب لکھا گیا۔ بات یہ ہے کہ نامور آدمی کے واسطے محلے کا پتہ ضرور نہیں۔ میں غریب آدمی ہوں، مگر فارسی، انگریزی جو خط میرے نام کے آتے ہیں، تلف نہیں ہوتے۔ بعض فارسی خط پر پتہ محلے کا نہیں ہوتا۔ انگریزی خط پر تو مطلق پتہ ہوتا ہی نہیں، شہر کا نام ہوتا ہے۔ تین چار خط انگریزی ولایت سے مجھ کو آئے۔ جانے ان کی بلا کہ بلّی ماروں کا محلہ کیا چیز ہے۔ وہ تو[1] بہ نسبت میرے بہت بڑے آدمی ہیں سیکڑوں خطوط انگریزی ہر روز ان کو آتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ میں نے پھر ان کے پاس آدمی بھیجا اور آپ کا خط اپنے نام کا بھیج دیا۔ انھوں نے میرے آدمی کو کہا کہ نواب صاحب کو میرا سلام کہنا اور کہنا کہ میں اس کا جواب کیا لکھوں۔ محلے کا پتہ آپ ہی لکھ بھیجیے۔ سو میں پہلے امرِ واقعی تم کو لکھ کر تمھاری خواہش کے موافق لکھتا ہوں۔ ان کے مکان کا پتہ بلّی ماروں کا محلہ، دستوں کا کوچہ۔

"دستنبو" کا حال یہ ہے کہ میں نے ایک بار سات روپے کی ہنڈوی بھیج کر بارہ جلدیں اور ایک جنتری ان سے منگوائی۔ پھر ان کو اٹھارہ آنے کے ٹکٹ بھیج کر دو جلدیں لکھنؤ کو انھیں کے ہاتھوں، وہیں سے بھجوائیں اور اس کے بعد پھر اٹھارہ آنے کے ٹکٹ بھجوا کر دو جلدیں وہیں سے سردھنے کو بھجوائیں۔ غرض اس تحریر سے یہ ہے کہ میں بعد اس پچاس جلد کے سولہ جلدیں اور ان سے لے چکا ہوں مگر نقد۔ ہرگز قرض میں نے نہیں منگوائی ہیں۔ ایک بار ہنڈوی اور دو بار ٹکٹ بھیج چکا ہوں۔ تم کو میری جان کی قسم سہل طور پر[2] ان کو لکھ بھیجنا کہ غالب نے کتنی جلدیں منگوائی ہیں اور نقد منگوائی ہیں یا قرض اور جو وہ لکھیں مجھ کو لکھ بھیجنا۔

شنبہ ۱۹ فروری ۱۸۵۹ء غالب

---

[1] اس سے مراد راجا امید سنگھ ہیں جیسا کہ اگلے خط سے صاف واضح ہو جاتا ہے "نامور آدمی کے واسطے محلے کا پتہ ضرور نہیں" راجا امید سنگھ ہی کے لیے لکھا تھا۔ [2] سرسری ڈر پر۔

(۶۷)

صاحب،

تمہارا خط آیا، دل خوش ہوا۔ تمھاری تحریر سے معلوم ہوتا تھا کہ تم کو آگرے سے کتابوں کا منگوانا بے ارسالِ قیمت مظنون ہے۔ چنانچہ "حقِ تصنیف" تم نے لکھا ہے بھائی کیا میں تم کو جھوٹ لکھوں گا؟ اور شیو نرائن نے اگر ذکر ارسالِ قیمت کا نہیں لکھا، یہ بھی تو نہیں لکھا کہ بے ارسالِ قیمت منگوائی ہیں۔ تم کو میرے سر کی قسم اور میری جان کی قسم، شیو نرائن سے اتنا پوچھو کہ اس پچاس جلد کے بعد کے جلدیں غالب نے اور منگوائیں اور قیمت بھیج کر منگوائیں یا قیمت اس سے لینی ہے؟ دیکھو میں نے قسم لکھی ہے، یوں ہی عمل میں لانا۔

راجہ امید سنگھ صاحب یہیں ہیں۔ مجھ سے اِن دنوں میں ملاقات نہیں ہوئی جو تمھارے خط کا ذکر آتا۔ یقین ہے کہ پہنچ گیا ہوگا اور یہ جو تم نے مجھ کو لکھا تھا کہ اگر دستون کا کوچہ نہ ملے گا تو وہ خط تیرے پاس آئے گا۔ سو وہ میرے پاس نہیں آیا۔ صاحب، تم کو وہم کیوں ہے؟ ایک امیر نامور آدمی ہے، اس کے نام کا خط کیوں نہ پہنچے گا؟

محررہ غالب

(۶۸)

اجی مرزا تفتہ،

بھائی منشی نبی بخش صاحب کو تمھارے حال کی بڑی پرسش ہے۔ تم نے ان کو خط لکھنا کیوں موقوف کیا ہے؟ وہ مجھ کو لکھتے تھے کہ اگر آپ کو مرزا تفتہ کا حال معلوم ہو تو مجھ کو ضرور لکھیے گا۔

یک شنبہ ۲۷ فروری ۱۸۵۹ء غالب

(۶۹)

کیوں مرزا تفتہ، تم بے وفا یا میں گنہ گار؟ یہ بھی تو مجھ کو معلوم نہیں کہ تم کہاں ہو۔ ابھی ایک صاحب میری ملاقات کو آئے تھے۔ تقریباً[1] تمھارا ذکر درمیان میں آیا۔ وہ کہنے لگے کہ وہ کول میں ہیں۔ اب میں حیران ہوں کہ خط کول بھیجوں یا سکندر آباد! اگر کول بھیجوں تو مسکن کا پتہ کیا لکھوں؟ بہ ہر حال سکندر آباد بھیجتا ہوں۔ خدا کرے پہنچ جائے۔ تمھارا دیوان بطریق پارسل میرے پاس آیا۔ میں نے ہرکارے کو راجہ امید سنگھ بہادر کے گھر کا پتہ بتا کر وہاں بھجوا دیا۔ یقین ہے کہ پہنچ گیا ہوگا۔ پانچ چار دن سے سنتا ہوں کہ وہ متھرا اور اکبر آباد کی طرف گئے ہیں۔ مجھ سے مل کر نہیں گئے۔ بہ ہر حال اِس خط کا جواب جلد لکھو اور ضرور لکھو۔

بھائی، تم سیاح آدمی ہو۔ جہاں جایا کرو، مجھ کو لکھ بھیجا کرو کہ میں وہاں جاتا ہوں یا جہاں جاؤ وہاں سے خط لکھو۔ تمھارے خط کے نہ آنے سے مجھے تشویش رہتی ہے۔ میری تشویش تم کو کیوں پسند ہے؟

محررہ یک شنبہ ۲۷ مارچ ۱۸۵۹ء غالب

(۷۰)

صاحب،

تمھارا خط صبح کو آیا۔ میں دوپہر کو جواب لکھتا ہوں۔ تمھاری ناسازگاری طبیعت سن کر دل کڑھا۔ حق تعالیٰ تم کو زندہ اور تندرست اور خوش رکھے۔ اوراق مثنوی بھیجے ہوئے بہت دن ہوئے، جس میں حکایت طالب علم اور رُسنار کی تھی، واقعہ بلند شہر کا اور وہ اوراق میں نے پمفلٹ پاکٹ نہیں بھیجے) خط میں لپیٹ کر، چونکہ خط ڈبل تھا، دو ٹکٹ لگا کر ارسال کیے ہیں۔ رسید ملے تو اس کو دیکھ کر تاریخ معلوم ہو جائے۔

---

[1] تقریباً کا مطلب یہاں "قریب" نہیں بلکہ "بہ سبیل ذکر" ہے۔

قیاس سے ایسا جانتا ہوں کہ پانچ سات دن ہوئے ہوں گے۔

منشی نبی بخش کا خط بہت دن سے نہیں آیا۔ گھر ان کا تاج گنج، وہ خود معہ بعض متعلقین آگرے، ایک بار تاج گنج کے پتے سے خط ان کو بھیجا تھا، جواب نہ آیا اب ناچار برخوردار شیو نرائن سے اُن کا حال پوچھوں گا۔ تم باہمہ کمالات خفقانی بھی ہو۔ رائے امید سنگھ سے خط کی اُمید کیوں رکھتے ہو؟ جب آگرے جاؤ گے اور وہ وہاں ہوں گے تو ملاقات ہو جائے گی۔ میں خود واقف نہیں کہ وہ کہاں ہیں؟ ازروے قیاس کہہ سکتا ہوں کہ آگرے یا بندرابن۔ کبھی کہیں سے اُن کا کوئی خط مجھ کو آیا تو میں کہہ دوں گا۔

یک شنبہ سیوم ذی القعدہ، پنجم جون سال حال (۱۸۵۹ء) غالب

(۷۱)

صاحب،

ہم تمہارے اخبار نویس ہیں اور تم کو خبر دیتے ہیں کہ برخوردار میر بادشاہ آئے ہیں۔ ان کو دیکھ کر خوش ہوا۔ وہ اپنے بھائیوں سے مل کر شاد ہوئے۔ تمہارا حال سن کر مجھ کو رنج ہوا۔ کیا کروں۔ نہ اپنے رنج کا چارہ کر سکتا ہوں، نہ اپنے عزیزوں کی خبر لے سکتا ہوں:

ہر آنچہ ساقیِ ما ریخت عین الطاف است

آج چوتھا دن ہے یعنی منگل کے دن کوئی پہر بھر دن چڑھا ہوگا کہ راجا امید سنگھ بہادر ناگاہ میرے گھر تشریف لائے۔ پوچھا گیا کہ کہاں سے آئے ہو؟ فرمایا کہ آگرے سے آتا ہوں۔ "بساون کی گلی" میں جو "حکیموں کی گلی" کے قریب ہے "جورس صاحب" کی کوٹھی انھوں نے مول لی ہے اور اس کے قریب کی زمین افتادہ بھی خریدی ہے اور اس کو بنوا رہے ہیں۔ تمہارا ابن نے ذکر کیا کہ ہر خط میں

تم کو پوچھتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ میں نے کئی خط بھیجے، جواب نہیں آیا۔ بولے کہ ایک خط اُن کا آیا تھا، اس کا جواب لکھ چکا ہوں۔ پھر اُن کا کوئی خط نہیں آیا۔ بہ ہر حال میرے پھوڑے نکل رہے ہیں۔ میں بازدید کو نہیں گیا۔ شاید آج وہ گئے ہوں یا جاویں۔ پھر اکبر آباد کو جائیں گے۔ میں آج آدمی اُن کے پاس بھیجوں گا۔ کل مرزا حاتم علی مہر کا خط آیا تھا، تم کو بہت پوچھتے تھے کہ آیا میرزا تفتہ کہاں ہیں اور کس طرح ہیں؟ بھائی ان کو خط لکھ بھیجو۔

غالب

محررہ ۱۷؍جون ۱۸۵۹ء

(۷۲)

صاحب،

ایک خط تمھارا پرسوں آیا۔ اس میں مندرج تھا کہ میرٹھ جاؤں گا۔ آج صبح کو ایک خط تمھارا آیا۔ اس میں مندرج تھا کہ پہلی جولائی کو جاؤں گا اور تجھ سے ملتا جاؤں گا۔ پرسوں کے خط میں بھی اور آج کے خط میں بھی پارسل کا ذکر تھا۔ کہ ۲۰؍جون کو ہم نے بھیجا ہے۔ بیسویں جون کو آج دسواں دن ہے۔ اس دس دن میں کوئی پارسل، کوئی پمفلٹ، پاکٹ میرے پاس نہیں پہنچا۔ آخری پمفلٹ پاکٹ دو مثنویوں کا وہ تھا جس میں ایک مثنوی شہر کے واقعہ کی تھی کہ ایک لڑکا مر گیا۔ اس کی ارتھی بھکتی رہی، اس کا عاشق سے کہ بتاتا رہا۔ سو ان دونوں مثنویوں کو میں نے اصلاح دے کر تمھارے پاس بھیج دیا۔ بلکہ یوں یاد پڑتا ہے کہ تم نے اس کی رسید بھی لکھ بھیجی ہے۔ لیکن مجھ کو گمان یہ ہے کہ یہ امر ۲۰۔جون سے آگے کا ہے۔ بہ ہر تقدیر، بعد اس پارسل کے کوئی اور پارسل نہیں آیا۔ اصلاحی کاغذ ہر طرف کے عموماً اور تمھارے خصوصاً دو دن سے زیادہ میں نہیں رکھتا۔ جو کاغذ مجھ تک نہ پہنچے، میں ناچار ہوں۔ بلکہ خود میرے ایک خط کا جواب تم پر فرض ہے

یا تو وہ نہ پہنچا، یا تم نے اس کا جواب لکھنا ضرور نہ جانا۔ وہ خط جس میں میر بادشاہ کا دلی آنا اور اُن کا مجھ سے ملنا اور تمہارا ذکر مجھ میں اور ان میں ہونا، معتمد راجا امید سنگھ کا دلی آنا اور بے خبر میرے گھر آجانا اور تمہارا ان سے ذکر ہونا اور ان کا یہ کہنا کہ ان کا کل ایک خط میرے پاس آیا تھا سو میں نے اس کا جواب لکھ بھیجا تھا۔ اب میں کیا جانوں کہ تم کو یہ خط پہنچا یا نہیں پہنچا۔ تمہارا وہ پارسل جس کو تم اب مانگتے ہو میرے پاس ہرگز نہیں آیا۔

چہار شنبہ ۲۹ جون ۱۸۵۹ء وقت نیمروز غالب

(۷۳)

میاں،

تمہارے انتقالات ذہن نے مارا۔ میں نے کب کہا تھا کہ تمہارا کلام اچھا نہیں؟ میں نے کب کہا تھا کہ دنیا میں کوئی سخن فہم و قدردان نہ ہوگا؟ مگر بات یہ ہے کہ تم مشق سخن کر رہے ہو اور میں مشق فنا میں مستغرق ہوں۔ بوعلی سینا[1] کے علم کو اور نظیری[2] کے شعر کو ضائع اور بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں۔ زیست بسر کرنے کو کچھ تھوڑی سی راحت درکار ہے اور باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری، سب خرافات ہے۔ ہندوؤں میں اگر کوئی اوتار ہوا تو کیا اور مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا؟ دنیا میں نام آور ہوئے تو کیا اور گمنام جیے تو کیا؟ کچھ وجہ معاش ہو اور کچھ صحت جسمانی، باقی سب وہم ہے اے یار جانی۔ ہر چند وہ بھی وہم ہے مگر میں ابھی اسی پایے پر ہوں، شاید آگے بڑھ کر یہ پردہ بھی اُٹھ جائے اور وجہ

---

[1] بوعلی سینا مشہور حکیم و طبیب۔

[2] فارسی کا مشہور شاعر جو نیشاپور کا رہنے والا تھا۔ اکبر کے عہد میں ہندوستان آیا اور خانخاناں کے ساتھ وابستہ ہوگیا۔ احمد آباد گجرات میں متوطن ہوگیا تھا۔ وہیں جہانگیر کے عہد میں فوت ہوا۔

معیشت اور صحت و راحت سے بھی گزر جاؤں، عالمِ بیرنگی میں گزر پاؤں جس سناٹے میں ہوں وہاں تمام عالم بلکہ دونوں عالم کا پتہ نہیں۔ ہر کسی کا جواب مطابق سوال کے دیے جاتا ہوں اور جس سے جو معاملہ ہے، اس کو ویسا ہی برت رہا ہوں، لیکن سب کو وہم جانتا ہوں۔ یہ دریا نہیں ہے، سراب ہے۔ ہستی نہیں ہے پندار ہے۔ ہم تم دونوں اچھے خاصے شاعر ہیں۔ مانا کہ سعدی و حافظ کے برابر مشہور رہیں گے۔ اُن کو شہرت سے کیا حاصل ہوا کہ ہم تم کو ہو گا؟

قطعات تاریخ آ گئے کیونکہ بھیجوں؟ پھر تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔

خالق معنی بمعنی "معنی آفرین" صحیح اور مسلم اور جائز۔ لیکن جس طرح اللہ میں مشدد لام کو دو لام کے قائم مقام قرار دیا ہے الٰہ اور الٰہی میں الف ممدودہ کو دوسرا الف کیونکر سمجھیں؟ قیاس کام نہیں آتا۔ اتفاق سلف شرط ہے۔ جب اور کسی نے الٰہی میں دو الف نہیں مانے تو ہم کیوں کر مانیں؟

دویم "بروزن جویم" غلط "دوم" ہے بغیر تحتانی۔ بالفرض تحتانی بھی لکھیں گے تو "دُیم" پڑھیں گے، اگرچہ لکھیں گے دویم۔ واو کا اعلان ٹکسال باہر ہے۔ ہاں "دومی" درست ہے مگر نہ بہ حرف تحتانی۔ مثل "زمین" یعنی "زمی" بہ حذف نون بلکہ بطریق قلب بعض "دویم" کا "دومی" ہو گیا۔ کنوے کی تاریخ کو بے تامل بھیج دو اور تاریخ وفات کا اور مادہ سوچو، کس واسطے کہ جب الٰہی میں سے ایک الف لیا تو ایک عدد کم ہو جائے گا۔ والدعا

روز ورود نامہ بعد خواندن نوشتہ شد یک شنبہ از غالب

(۴۷)

بھائی تمہارے ذہن نے خوب انتقال کیا۔ میں نے جس وقت یہ شعر پڑھا:

بہ ہند آمدند زائراں دیار

"آمدند" کی جگہ "آمدندے" بصیغۂ استمرار ٹکسال باہر معلوم ہوا:

رسیدند در ہند ز ایراں دیار

اس کی جگہ لکھ دیا۔ واقعی، پوستین کا بیچنا راہ میں واقع ہوا۔ پھر "رسیدند در ہند" بیجا، تمہارا تصرف مستحسن جس طرح تم نے لکھا ہے اسی طرح رہنے دو۔

صاحب، "سنبلستان" سے کیوں گھبراتے ہو؟ میں تمہارے گھبرانے سے گھبراتا ہوں۔ "رخ" کو "گل"۔ "زلف" کو "سنبل" فرض کرتے ہیں۔ "سنبلستان" میں کیا عیب ہے؟ اور اگر نہیں پسند تو یہ قصہ ہی جانے دو۔ اس وقت تک کہ اکتوبر کی آٹھویں، ہفتے کے دن، تیسرے پہر کا وقت ہے، میر قاسم علی صاحب تشریف نہیں لائے۔ ہاتوس کے "منصف" اور دلّی کے نامنصف ہیں۔

روز شنبہ۔ ہشتم اکتوبر ۱۸۵۹ء آخر روز غالب

(۷۵)

صاحب،

تمہارا خط آیا، حال معلوم ہوا:

جہانیاں ز تو برگشتہ اند اگر غالب ترا چہ باک؟ خدا ہے کہ داشتی داری

خدا کے واسطے میرے باب میں لوگوں نے کیا خبر مشہور کی ہے؟ بہ نسبت حکیم احسن اللہ خاں، یہ جو بات مشہور ہے، وہ محض غلط۔ ہاں مرزا الٰہی بخش جو شہزادوں میں ہیں۔ ان کو حکم کہ ابھی بندہ رہ جانے کا ہے اور وہ انکار کر رہے ہیں۔ دیکھیے کیا ہو؟ حکیم جی کو ان کی حویلیاں مل گئی ہیں۔ اب وہ مع قبائل ان مکانوں میں جا رہے ہیں۔ اتنا حکم ان کو ہے کہ شہر سے باہر نہ جائیں۔ رہا میں

تو بیکسی و غریبی ترا کہ می پرسد

نہ جزا، نہ سزا، نہ نفرین، نہ آفرین، نہ عدل، نہ ظلم، نہ لطف، نہ قہر،

پندرہ دن پہلے تک دن کو روٹی، رات کو شراب ملتی تھی، اب صرف روٹی ملے جاتی ہے، شراب نہیں۔ کپڑا ایامِ تنعم کا بنا ہوا ابھی ہے، اس کی کچھ فکر نہیں ہے۔ مگر تم کو میرے سر کی قسم، یہ لکھ بھیجو کہ میری خبر تم نے کیا سُنی؟ مجھے اُس کے معلوم ہونے سے مزا ملے گا۔

شنبہ ۵ نومبر ۱۸۵۹ء غالب

(۷۶)

میری جان،

کیا سمجھے ہو؟ سب مخلوقات تفتہ و غالب کیوں کر بن جائیں؟:

ہر یکے را بہر کارے ساختند

انت متا سو متا مصری میٹھی، نمک سلونا کبھی کسی شے کا مزا نہ بدلے گا۔ اب جو میں اس شخص کو نصیحت کروں، وہ کیا نہ سمجھے گا کہ غالب کیا جانے کہ عبدالرحمٰن کون ہے اور مجھ سے اس سے کیا رسم و راہ ہے۔ بے شبہ جانے گا کہ تفتہ نے لکھا ہوگا۔ میں اس کی نظر میں سُبک ہو جاؤں گا اور تم سے وہ اور بھی سرگراں ہو جائے گا اور یہ جو تم لکھتے ہو کہ تو نے اس شخص کو اپنے عزیزوں میں گنا ہے، بندہ پرور میں بنی آدم کو مسلمان یا ہندو یا نصرانی عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں۔ دوسرا مانے یا نہ مانے۔ باقی رہی وہ عزیزداری جس کو اہلِ دُنیا قرابت کہتے ہیں، اس کو قوم اور ذات اور مذہب اور طریق شرط ہے، اور اس کے مراتب و مدارج ہیں۔ نظر اس دستور پہ اگر دیکھو تو مجھ کو اس شخص سے خس برابر علاقہ عزیزداری کا نہیں۔ از راہِ حسنِ اخلاق اگر عزیز لکھ دیا یا کہہ دیا تو کیا ہوتا ہے؟ زین العابدین خاں عارف میری سالی کا بیٹا، یہ شخص اس کی سالی کا بیٹا۔ اس کو جو چاہو سمجھ لو۔ خلاصہ یہ کہ جب ادھر سے آدمیت نہ ہوئی تو اب اس کو لکھنا لغو و بے فائدہ بلکہ مضر ہے۔

تمھارا میرٹھ جانا اور نواب مصطفےٰ خاں سے ملنا ہم پہلے ہی دریافت کر چکے ہیں۔ اب تمھارے خط سے مراد آباد ہو کر سکندر آباد آنا معلوم ہو گیا۔ حق تعالیٰ شانہٗ تم کو خوش و خرم رکھے۔

مرقومہ جمعہ ۲۳ر دسمبر ۱۸۵۹ء غالب

(۷۷)

بھائی،

میں نے دلی کو چھوڑا اور رام پور کو چلا۔ پنجشنبہ ۱۹ کو مراد نگر اور جمعہ ۲۰ر کو میرٹھ پہنچا۔ آج شنبہ ۲۱ کو بھائی مصطفےٰ خاں کے کہنے سے مقام کیا۔ یہاں سے یہ خط تم کو لکھ کر بھیجا۔ کل شاہجہانپور، پرسوں گڑھ مکتیشر رہوں گا۔ پھر مراد آباد ہوتا ہوا رامپور جاؤں گا۔ اب جو مجھ کو خط بھیجو، رام پور بھیجنا۔ سرنامے پر رام پور کا نام اور میرا نام کافی ہے۔ اب اسی قدر لکھنا کافی تھا، باقی جو کچھ لکھنا ہے وہ رام پور سے لکھوں گا۔

مرقومہ چاشتگاہ شنبہ ۲۱ر جنوری ۱۸۶۰ء راقم غالب

(۷۸)

صاحب،

تمھارے یہ اوراق سکندر آباد سے دلّی اور دلّی سے رام پور پہنچے ہوں گے۔ سوائے ایک مصرع کے مجھے اور جگہ کی اصلاح یاد نہیں۔ تم جو اپنے فرزند کو ناشناسائے مزاج روزگار کہتے ہو، خود اس میں اس سے کیا کم ہو؟ پہلے یہ تو بتاؤ کہ رام پور میں مجھے کون نہیں جانتا؟ کہاں مولوی وجیہہ الزماں صاحب، کہاں میں! اُن کا مسکن میرے مسکن سے دُور، پھر در دولت رئیس کہاں اور میں کہاں! چار دن والی شہر نے اپنی کوٹھی میں اتارا۔ میں نے مکان جداگانہ مانگا۔ دو تین حویلیاں برابر مجھ کو عطا ہوئیں۔ اب اس میں رہتا ہوں۔ بحسب اتفاق ڈاک گھر مسکن کے پاس

ہے۔ ڈاک منشی آشنا ہو گیا ہے۔ برابر دلی سے خط چلے آتے ہیں۔ صرف رام پور کا نام اور میرا نام، محلے کی اور عرف کی حاجت نہیں۔ بلکہ ورود دولت اور مولوی صاحب کے نشان سے شاید خط تلف ہو جائے۔ دوسری بات جو تم نے لکھی ہے، وہ بھی مطابق و مناسب حال نہیں۔ اگر اقامت قرار پائی تو تم کو بلا لوں گا۔

(سنہ ۱۸۶۰ء) غالب ۱۲

(۷۹)

میری جان،

آخر لڑکے ہو، بات کو نہ سمجھے۔ میں اور تفتہ کا اپنے پاس ہونا غنیمت نہ جانوں؟ میں نے یہ لکھا تھا کہ بشرط اقامت بلا لوں گا اور پھر لکھتا ہوں کہ اگر میری اقامت یہاں کی ٹھہری، تو بے تمہارے نہ رہوں گا، نہ رہوں گا، زنہار نہ رہوں گا۔ منشی بال مکند بے صبر کا خط بلند شہر سے دلی اور دلی سے رام پور پہنچا، تلف نہیں ہوا۔ اگر میں یہاں رہ گیا تو یہاں سے اور اگر دلی چلا گیا تو وہاں سے اصلاح دے کر ان کے اشعار بھیج دوں گا۔ بے صبر کو اب کی بار مہینے بھر کا صبر چاہیے۔ وہ لفافہ بدستور رکھا ہوا ہے۔ ازبسکہ یہاں کے حضرات مہربانی فرماتے ہیں اور ہر وقت آتے ہیں، فرصت مشاہدہ اوراق نہیں ملی۔ تم اسی رقعے کو ان کے پاس بھیج دینا۔

سہ شنبہ ۱۴ فروری سنہ ۱۸۶۰ء غالب

(۸۰)

برخوردار سعادت آثار منشی ہر گوپال سلمہ اللہ تعالیٰ۔

اس سے آگے تم کو حالات مجمل لکھ چکا ہوں۔ ہنوز کوئی رنگ قرار نہیں پایا۔ بالفعل نواب لفٹنٹ گورنر بہادر مراد آباد اور وہاں سے رام پور آئیں گے۔ بعد

ان کے جانے کے کوئی طور اقامت یا عدم اقامت کا ٹھہرے گا۔ منظور مجھ کو یہ ہے کہ اگر یہاں رہنا ہوا تو فوراً تم کو بلا لوں گا۔ جو دن زندگی کے باقی ہیں، وہ باہم بسر ہو جائیں۔ والدعا

یکم مارچ ۱۸۶۰ء راقم غالب

(۸۱)

میرزا تفتہ،

اس غمزدگی میں مجھ کو ہنسانا تمہارا ہی کام ہے۔ بھائی "تضمین گلستاں" چھپوا کر کیا فائدہ اٹھایا ہے، جو انطباع "سنبلستان" سے نفع اٹھاؤ گے؟ روپیہ جمع رہنے دو۔ آمد اچھی چیز ہے اگرچہ قلیل ہو اور اگر روپیہ لینا منظور ہے تو ہرگز اندیشہ نہ کرو اور درخواست دے دو۔ بعد نو مہینے کے روپیہ تم کو مل جائے گا۔ یہ میرا ذمہ کہ اس نو مہینے میں کوئی انقلاب واقع نہ ہوگا۔ اگر احیاناً ہوا بھی تو ہوتے ہوتے اس کو مدت چاہیے۔ "رستخیز بیجا"[1] ہو چکا۔ اب ہو تو رستخیز ہو یعنی قیامت اور اس کا حال معلوم نہیں کہ کب ہوگی۔ اگر اعداد کے حساب سے دیکھو تو بھی رستخیز کے ۱۲۷۷ ہوتے ہیں۔ احتمال فتنہ سال آئندہ پر رہا، سو بھی موہوم۔

میاں، میں جو آخر جنوری کو رامپور جا کر آخر مارچ کو یہاں آ گیا ہوں، تو کیا کہوں کہ یہاں کے لوگ میرے حق میں کیا کچھ کہتے ہیں۔ ایک گروہ کا قول ہے کہ یہ شخص والی رامپور کا استاد تھا اور وہاں گیا تھا۔ اگر نواب نے کچھ سلوک نہ کیا ہوگا تو بھی پانچ ہزار روپے سے کم نہ دیا ہوگا۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ نوکری کو گئے تھے مگر نوکر نہ رکھا۔ ایک فرقہ کہتا ہے کہ نواب نے نوکر رکھ لیا تھا۔ دو سو روپے مہینہ کر دیا تھا۔ لفٹنٹ گورنر الہ آباد جو رامپور آئے اور ان کو غالب کا

---

[1] یعنی "غدر"۔ غالب نے اس کی تاریخ "رستخیز بیجا" نکالی تھی۔

وہاں ہونا معلوم ہوا تو انھوں نے نواب صاحب سے کہا کہ اگر ہماری خوشنودی چاہتے ہو تو اس کو جواب دو۔ نواب نے برطرف کر دیا۔ یہ تو سب سن لیا۔ اب تم اصل حقیقت سنو۔ نواب یوسف علی خاں بہادر تیس اکتیس برس کے میرے دوست اور پانچ چھ برس سے میرے شاگرد ہیں۔ آگے گاہ گاہ کچھ بھیج دیا کرتے تھے، اب جولائی ۱۸۵۹ء سے سو روپے مہینہ ماہ بماہ بھیجتے ہیں۔ بلاتے رہتے تھے۔ اب میں گیا۔ دو مہینے رہ کر چلا آیا۔ بشرط حیات بعد برسات کے پھر جاؤں گا۔ وہ سو روپیہ مہینہ یہاں رہوں وہاں رہوں، خدا کے ہاں سے میرا مقرر ہے۔

غالب

۳۰ مارچ ۱۸۶۰ء

(۸۲)

میرزا تفتہ

ایک امر عجیب تم کو لکھتا ہوں اور وہ امر بعد تعجب مفرط کے موجب نشاط مفرط ہوگا۔ میں اجرائے پنسن سرکار انگریزی سے مایوس تھا۔ بارے وہ نقشہ پنسن داروں کا، جو یہاں سے بن کر صدر کو گیا تھا اور یہاں کے حاکم نے بہ نسبت میرے لکھ دیا کہ یہ شخص پنسن پانے کا مستحق نہیں ہے۔ گورنمنٹ نے برخلاف یہاں کے حاکم کی رائے کے میرے پنسن کے اجرا کا حکم دیا اور وہ حکم یہاں آیا اور مشہور ہوا۔ میں نے بھی سنا۔ اب کہتے ہیں کہ ماہ آیندہ یعنی مئی کی پہلی کو تنخواہوں کا بٹنا شروع ہوگا۔ دیکھا چاہیے پچھلے روپے کے باب میں کیا حکم ہوتا ہے۔

غالب

۱۶ اپریل ۱۸۶۰ء

(۸۳)

بھائی، آج اس وقت تمھارا خط پہنچا۔ پڑھتے ہی جواب لکھتا ہوں۔ زر سہ سالہ مجتمعہ ہزاروں کہاں سے ہوئے۔ سات سو پچاس روپے سال پاتا ہوں۔ تین برس

کے دو ہزار دو سو پچاس ہوئے۔ سو روپے مجھے مدد خرچ ملے تھے، وہ کٹ گئے۔ ڈیڑھ سو متفرقات میں گئے۔ رہے دو ہزار روپے۔ میرا مختار کار ایک بنیا ہے اور میں اس کا قرضدار قدیم ہوں۔ اب جو وہ دو ہزار (روپے) لایا۔ اس نے اپنے پاس رکھ لیے اور مجھ سے کہا کہ میرا حساب کیجیے۔ سات کم پندرہ سو اس کے سود مول کے ہوئے۔ قرض متفرق کا اسی سے حساب کروایا گیا۔ گیارہ سو کئی روپے وہ نکلے۔ پندرہ اور گیارہ چھبیس[۲۶] سو ہوئے۔ اصل میں یعنی دو ہزار میں چھ سو کا گھاٹا۔ وہ کہتا ہے پندرہ سو میرے دے دو، پانسو سات روپے باقی کے تم لے لو۔ میں کہتا ہوں۔ متفرقات گیارہ سو چکا دے، نو سو باقی رہے، آدھے تو لے لے آدھے مجھ کو دے۔ پرسوں جوکھی کو وہ روپے لایا ہے، کل تک قصہ نہیں چکا۔ میں جلدی نہیں کرتا۔ دو ایک مہاجن بیچ میں ہیں۔ ہفتے میں جھگڑا فیصل ہو جائے گا۔ خدا کرے یہ خط تم کو پہنچ جائے۔ جس دن برات سے پھر کر آؤ، اسی دن مجھ کو اپنے ورود مسعود کی خبر دینا۔ والدعا

شنبہ ششم مئی ۱۸۶۰ء ہنگام نیمروز غالب

(۸۴)

برخوردار میرزا تفتہ،

دوسرا مسودہ بھی کل پہنچا۔ تم سچے اور میں معذور۔ اب میری کہانی سنو۔ آخر جون میں صدر پنجاب سے حکم آگیا کہ پنشن داران قدیم ماہ بماہ نہ پائیں، سال میں دو بار بطریق ششماہہ فصل بفصل پایا کریں۔ ناچار ساہوکار سے سود کاٹ کر روپیہ لیا گیا تا رام پور کی آمد میں مل کر صرف ہو۔ یہ سود چھ مہینے تک اسی طرح کٹواں دینا پڑے گا، ایک معقول رقم گھاٹے میں جائے گی:

رسم ہے مردے کی چھ ماہی ایک خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار

مجھ کو دیکھو کہ ہوں بقید حیات   اور چھ ماہی ہو سال میں دوبار

دس بارہ برس سے اِس تنگنا میں رہتا تھا۔ سات برس تک ماہ بماہ چار روپیہ دیا گیا۔ اب تین برس کا کرایہ کچھ اُوپر سو روپے یک مشت دیا گیا۔ مالک نے مکان بیچ ڈالا۔ جس نے لیا ہے۔ اُس نے مجھ سے پیام بلکہ ابرام کیا کہ مکان خالی کر دو۔ مکان کہیں ملے تو میں اُٹھوں۔ بے درد نے مجھ کو عاجز کیا اور مدد لگادی۔ وہ صحن بالاخانے کا جس کا دو گز کا عرض اور دس گز کا طول ہے اُس میں باڑ بندھ گئی۔ رات کو وہیں سویا۔ گرمی کی شدت، باڑ کا قرب۔ گمان یہ گزرتا تھا کہ کٹکر ہے اور صبح کو مجھ کو پھانسی ملے گی۔ تین راتیں اسی طرح گزریں۔ دوشنبہ ۹۔ جولائی کو دوپہر کے وقت ایک مکان ہاتھ آگیا، وہاں جا رہا۔ جان بچ گئی۔ یہ مکان بہ نسبت اُس مکان کے بہشت ہے اور یہ خوبی کہ محلہ وہی بلی ماروں کا۔ اگرچہ ہے یوں کہ میں اگر اور محلہ میں جا رہتا تو قاصدان ڈاک وہیں پہنچتے۔ یعنی اب اکثر خطوط "لال کنوے" کے پتے سے آتے ہیں اور بے تکلف پہنچتے ہیں۔ بہرحال تم وہی دلی "بلی ماروں" کا محلہ لکھ کر خط بھیجا کرو۔ دو مسودے تمھارے اور ایک مسودہ بے صبر کا یہ تین کاغذ درپیش ہیں دو ایک دن میں بعد اصلاح ارسال کیے جائیں گے، خاطر عاطر جمع رہے۔

غالب

جمعہ ۲۰ جولائی سنہ ۱۸۶۰ء

(۸۵)

مرزا تفتہ،

کل تمھارا خط مع کاغذ اشعار آیا۔ آج تم کو یہ خط لکھتا ہوں اور اسی خط کے ساتھ خط موسومہ میر بادشاہ بھیجتا ہوں۔ کاغذ اشعار کل یا پرسوں روانہ ہوگا۔ فن تاریخ کو دونِ مرتبہ شاعری جانتا ہوں اور تمھاری طرح سے یہ بھی میرا عقیدہ نہیں ہے کہ تاریخ

وفات لکھنے سے اداے حقِ محبّت ہوتا ہے۔ بہ ہر حال میں نے منشی نبی بخش مرحوم کی تاریخِ رحلت میں یہ قطعہ لکھ کر بھیجا۔ منشی قمرالدین خاں صاحب نے ناپسند کیا۔ قطعہ یہ ہے:

شیخ نبی بخش کہ با حسنِ خلق　　داشت مذاقِ سخن و فہمِ تیز
سالِ وفاتش زپئے یادگار　　با دلِ زار و مژۂ دجلہ ریز
خواستم از غالبِ آشفتہ سر　　گفت مدہ طول و بگو "رستخیز"

ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ کوئی لفظ جامعِ اعداد نکال لیا کرتے ہیں، بلکہ قیدِ معنی دار ہونے کی بھی مرتفع ہے جیسا کہ یہ مصرع:

در سالِ غرس ہر آنکہ ماند بیند

انوریؔ کے قصائد کو دیکھو۔ دو چار جگہ ایسے الفاظ قصیدہ کے آغاز میں لکھے ہیں جس میں اعدادِ سالِ مطلوب نکل آتے ہیں اور معنی کچھ نہیں ہوتے۔ لفظ "رستخیز" کیا پاکیزہ معنی دار لفظ ہے اور پھر واقع کے مناسب۔ اگر تاریخِ ولادت یا تاریخِ شادی میں یہ لفظ لکھتا تو بے شبہ نامستحسن تھا۔ قصہ مختصر، اگر تاریخ کی فکر موجبِ اداے حقِ مودت ہے تو میں حقِ دوستی ادا کر چکا۔ زیادہ کیا لکھوں۔

صبح دوشنبہ پنجم جمادی الاول و نوزدہم نومبر سالِ رواں ۱۸۶۰ء　　غالب

(۸۶)

صاحب،

تمھارا خط میرٹھ سے آیا۔ "مرآۃ الصحائف" کا تماشا دیکھا۔ "سنبلستان" کا چھاپہ

ؔ فارسی کا مشہور قصیدہ گو شاعر جسے مدت تک یکے از سہ پیغمبرانِ شعرِ فارسی قرار دیتے رہے:

در شعر سہ کس پیمبرانند　　ہر چند کہ لا نبی بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را　　فردوسی و انوری و سعدی

خدا تم کو مبارک کرے اور خدا ہی تمہاری آبرو کا نگہبان رہے۔ بہت گزر گئی ہے تھوڑی رہی، اچھی گزری، اچھی گزر جائے گی۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ عرفی کے قصائد کی شہرت سے عرفی کے ہاتھ کیا آیا، جو میرے قصائد کے اشعار سے مجھ کو نفع ہوگا۔ سعدی نے "بوستان" سے کیا پھل پایا جو تم "سنبلستان" سے پاؤ گے۔ اللہ کے سوا جو کچھ ہے موہوم و معدوم ہے۔ نہ سخن ہے نہ سخن ور ہے، نہ قصیدہ ہے نہ قصد ہے لاموجود الا اللہ۔ جناب بھائی صاحب یعنی مصطفےٰ خاں بہادر سے ملاقات ہو تو میرا سلام کہہ دینا۔ ہمشیرہ[1] کے پنسن کا جاری ہونا بہت خوشی کی بات ہے، مگر خوشی سے تعجب زیادہ ہے۔ کیا عجب ہے کہ اس سے بھی زیادہ خوشی اور زیادہ تعجب کی بات بروے کار آوے، یعنی آپ کا پنسن بھی واگزاشت ہو جاوے۔ اللہ اللہ اللہ

صبح یک شنبہ ۲۰ جنوری ۱۸۶۱ء

غالب

(۸۷)

اجی مرزا تفتہ

تم نے روپیہ بھی کھویا اور اپنی فکر کو اور میری اصلاح کو بھی ڈبو دیا۔ ہائے کیا بری کاپی ہے۔ اپنے اشعار کی اور اس کاپی کی مثال جب تم پر کھلتی کہ تم یہاں ہوتے اور بیگمات قلعہ کو چلتے پھرتے دیکھتے۔ صورت ماہ دو ہفتہ کی سی اور کپڑے میلے، پائنچے لیر لیر، جوتی ٹوٹی، یہ مبالغہ نہیں بلکہ بے تکلف "سنبلستان" ایک معشوق خوبرو ہے، بدلباس ہے۔ بہ ہر حال دونوں لڑکوں[2] کو دونوں جلدیں دے دیں اور معلم کو حکم دیا کہ اسی کا سبق دے۔ چنانچہ آج سے شروع ہو گیا۔

مرقومہ صبح سہ شنبہ ۹ ماہ اپریل ۱۸۶۱ء

غالب

---

[1] یعنی نواب مصطفےٰ خاں کی ہمشیرہ۔

[2] باقر علی اور حسین علی۔

(۸۸)

میاں مرزا تفتہ،

ہزار آفریں۔ کیا اچھا قصیدہ لکھا ہے۔ واہ واہ! چشم بد دور، تسلسل معنی، سلاست الفاظ۔ ایک مصرع میں تم کو محمد اسحٰق شوکت[1] بخاری سے توارد ہوا۔ یہ بھی محل فخر و شرف ہے کہ جہاں شوکت پہنچا وہاں تم پہنچے۔ وہ مصرع یہ ہے:

چاک گر دیدم و از جیب بداماں رفتم

پہلا مصرع تمہارا اگر اس کے پہلے مصرع سے اچھا ہوتا تو میرا دل اور زیادہ خوش ہوتا۔ خدا تم کو اتنا جلائے کہ ایک دیوان بیس جزو قصائد کا کہہ لو۔ مگر خبردار قصائد بقید حروف تہجی نہ جمع کرنا۔

صاحب، مجھے اس بزرگوار کا معاملہ، اور یہ جو تم نے اس کا وطن اور پیشہ اب لکھا ہے، سابق کا تمہارا لکھا ہوا سب یاد ہے۔ میں نے اس کو "دوست" بطریق طنز لکھا ہے۔ بہ ہر حال وہ جو میں نے خاقانی[2] کا شعر لکھ کر اس کو بھیجا، اس کی ماں مرے اگر میرے اس خط کا جواب لکھا ہو۔ بڑا پرانا قصہ تم نے یاد دلایا۔ داغ کہنہ حسرت کو چمکایا۔ یہ قصیدہ منشی محمد حسن کی معرفت روشن الدولہ[3] کے پاس اور روشن الدولہ کے توسط سے نصیر الدین حیدر[4] کے پاس گزرا اور جس دن گزرا اسی دن پانچ ہزار روپے بھیجنے کا حکم ہوا۔ متوسط یعنی منشی محمد حسن نے مجھ کو اطلاع نہ دی۔ مظفر الدولہ مرحوم لکھنؤ سے آئے۔ انھوں نے یہ راز مجھ پر ظاہر کیا اور کہا: خدا کے واسطے میرا نام منشی محمد حسن کو نہ لکھنا۔ ناچار میں نے شیخ امام بخش ناسخ کو لکھا کہ

---

[1] فارسی کا مشہور شاعر [2] فارسی کا مشہور شاعر و استاد

[3] وزیر اعظم سلطنت اودھ در عہد نصیر الدین حیدر

[4] فرمانروائے اودھ، غازی الدین حیدر کا بیٹا اور سعادت علی خاں کا پوتا۔

تم دریافت کو کے لکھو کہ میرے قصیدے پر کیا گزری۔ انھوں نے جواب لکھا کہ پانچ ہزار ملے۔ تین ہزار روشن الدولہ نے کھائے، دو ہزار منشی محمد حسن کو دیے اور فرمایا کہ اس میں سے جو مناسب جانو غالب کو بھیج دو۔ کیا اس نے ہنوز تم کو کچھ نہیں بھیجا؟ اگر نہ بھیجا ہو تو مجھ کو لکھو۔ میں نے لکھ بھیجا کہ مجھے پانچ روپے بھی نہیں پہنچے۔ اس کے جواب میں انھوں نے لکھا کہ اب تم مجھے خط لکھو، اس کا مضمون یہ ہو کہ میں نے بادشاہ کی تعریف میں قصیدہ بھیجا ہے اور یہ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ وہ قصیدہ حضور میں گزرا مگر یہ میں نے نہیں جانا کہ اس کا صلہ کیا مرحمت ہوا۔ میں کہ ناسخ ہوں، اپنے نام کا خط بادشاہ کو پڑھوا کر ان کا کھایا ہوا روپیہ ان کے حلق سے نکال کر تم کو بھیج دوں گا۔ بھائی یہ خط لکھ کر میں نے ڈاک میں روانہ کیا۔ آج خط روانہ ہوا۔ تیسرے دن شہر میں خبر اُڑی کہ نصیر الدین حیدر مر گیا۔ اب کہو میں کیا کروں اور ناسخ کیا کرے۔

غالب

دوشنبہ ۱۹ اگست ۱۸۶۱ء

(۸۹)

مرزا تفتہ صاحب! اس قصیدے کے باب میں بہت باتیں آپ کی خدمت میں عرض کرنی ہیں۔ پہلے تو یہ کہ "خنجر" را و "گوہر" را کو تم نے از قسم تنافر سمجھا اور اس پر اشعار اساتذہ سند لائے۔ یہ خدشہ نہیں پیدا ہوتا، مگر لڑکوں کے اور مبتدیوں کے دل میں۔ سلیم:

شراب نقل نخواہد بگیر ساغر را — کہ احتیاج نشکو نیست شیر مادر را

یہ غزل شاہجہاں کے عہد کی طرحی ہے۔ صائب و قدسی و شعرائے ہند نے اس پر غزلیں لکھی ہیں۔

دوسرے یہ کہ ممدوح کا پورا نام بے تکلف آتے ہوئے خالی کیوں اُڑا دو۔

"ضیاء الدین احمد خاں" نام ہے۔ ہندی میں رخشاں تخلص۔ فارسی میں نیرّ تخلص:

ہمانا نیرّ رخشاں ضیاء الدین احمد خاں

دیکھو تو کیا پاکیزہ مصرع ہے یہ نہ کہنا کہ جو شعر اممدوح کا نام ننگا لکھ جاتے ہیں وہ بحسب ضرورتِ شعر ہے۔ جس نحریر میں پورا نام نہ آئے، اس میں شوق سے نہ لکھو جائز، وا مستحسن، جس تحریر میں نام ممدوح کا درست آئے، اس میں فروگذاشت کیوں کرو؟

دوشنبہ نہم ستمبر ۱۸۶۱ء   غالب

(۹۰)

صاحب،

قصیدے پر قصیدہ لکھا اور خوب لکھا۔ آفرین ہے پھر استاد کے شعر کی تضمین کیوں کرتے ہو؟ نہ اس کی کچھ حاجت، نہ اس میں کوئی افزایش حسن۔ تمہارے ایک شعر کو ایک شعر کے بعد رکھ دیا ہے تاکہ مقطع کلام ہو جائے۔ پہلا قصیدہ تمہارا "برآ و دم" "درآ اور دم" کی ردیف کا سست ہے۔ اس کو ہم نے نامنظور کیا۔ مگر نظرِ ثانی میں جو شعر قابل دیکھنے کے ہوں گے۔ وہ شعر تم کو لکھ کر بھیج دیں گے۔ بالفعل ایک شعر کی قباحت تم پر ظاہر کرتے ہیں تاکہ آیندہ اس پالغز سے احتراز کرو:

نورِ سعادت از جبۂ قاصدم چکد

یہ کیا ترکیب ہے "جبہہ" بروزن "چشمہ" یعنی دو ہائے ہوز ہیں "جبۂ قاصد" ایک ہائے ہوز کہاں گئی:

ہر کجا چشمۂ بود شیریں

"چشمہ" کی جگہ "چشمہ" لکھتے ہو۔ یہ بات ہمیشہ کو یاد رہے۔ اتنے بڑے مشّاق سے ایسی غلطی بہت تعجب کی بات ہے ۱۲

میاں : برگ دنیا نہ ساز دیش بود

یہ کوئی لغت نہیں، ایک لفظ نہیں کہ کسی فرہنگ میں سے نکل آئے۔ یہ طرزِ تحریر ہے کس کو یاد ہے کہ اس کا نظیر کہاں موجود ہے۔ اس امر سے قطع نظر، وہ شخص ایسا کہاں کا فارسی دان اور عالم ہے کہ میں لڑکوں کی طرح بیت بخشی کروں۔ دو جوتیاں آپ لگادیں ایک جوتی تم سے لگوادی۔ اب قطع نظر کرو اور سکوت اختیار فرماؤ۔

میں "برہان" کا خاکہ" اڑا رہا ہوں "چار شربت" اور "غیاث اللغات" کو حیض کالتہ سمجھتا ہوں۔ ایسے گمنام چھوکروں سے کیا مقابلہ کروں گا۔ "برہان قاطع" کے اغلاط بہت نکالے ہیں۔ دس جزو کا ایک رسالہ لکھا ہے۔ اس کا نام "قاطع برہان" رکھا ہے۔ اب اس کے چھاپے کی فکر ہے۔ اگر یہ مدعا حاصل ہو گیا تو ایک جلد چھاپے کی تم کو بھیج دوں گا۔ بہت سودمند نسخہ ہے ۱۲

اس قصیدۂ متبرکہ کو موافق اصلاح کے، اس کاغذ سے اور کاغذ پر نقل کرکے اور جو مطالب کہ اس کاغذ پر مرقوم ہیں ان کو حافظہ کے سپرد کرکے، اس ورق کو پھاڑ ڈالو اور اس قصیدے پر ناز کیا کرو۔ یہ قصیدہ تمہارا ہم کو بہت پسند آیا ہے

غالب

جمعہ ۴ راکتوبر ۱۸۶۱ء

(۹۱)

صاحب!

یہ قصیدہ تم نے بہت خوب لکھا ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ اس کا تمہیں صلہ دے۔ نواب مصطفےٰ خاں صاحب کے ہاں سے قصیدے کی رسید آ گئی۔ یقین ہے کہ تم کو بھی وہ خط لکھیں۔ وریں ولا آیا چاہتے ہیں اور مجھ کو یہ لکھا تھا کہ قصیدہ پہنچا، کیا کہنا ہے، ایسا ہے، اور ایسا ہے۔ میں چند روز میں وہاں آتا ہوں۔ عندالملاقات اس قصیدے کے باب میں باتیں ہوں گی۔ ضیاء الدین خاں صاحب کا بھی مقدمہ آج کل فیصل ہوا چاہتا

ہے۔ وہ قصیدہ جو میرے پاس امانت ہے۔ ان کو دیا جائے گا۔ انشاء اللہ العلی العلیم

از من فراغ برُد بریدم من از فراغ

"بریدم من از فراغ" یعنی "قطع نظر کردم از فراغ" و "نومید شدم از فراغ"

غالب

(۹۲)

تم کو معلوم رہے کہ ایک ممدوح تمہارے یہاں آئے ہیں۔ اُن کو میں نے تمہاری فکر اور تلاش کا مداح پایا۔ جنوری ۱۸۶۲ء میں کچھ تمہاری خدمت میں بھیجیں گے۔ تم کو قبول کرنا ہوگا۔ سمجھے یہ کون؟ یعنی نواب مصطفےٰ خاں صاحب اور دوسرے ممدوح یعنی نواب ضیاء الدین خاں، وہ آخر دسمبر ۱۸۶۱ء میں یا اوائل جنوری ۱۸۶۲ء میں حاضر ہوں گے۔

غالب

(۹۳)

بھائی،

"کیمیا" و "سیمیا" خرافات ہے۔ اگر ان کی کچھ اصل ہوتی تو ارسطو اور افلاطون اور بو علی یہ بھی کچھ اس باب میں لکھتے۔ "کیمیا" اور "سیمیا" دو علم شریف ہیں۔ جو اشیاء کی تاثیر سے تعلق رکھے، وہ "کیمیا" اور جو اسما سے متعلق ہو وہ "سیمیا"۔

جاں غم "سیمیا" نخورد گہے | دل سوے "کیمیا" نیاوردم

شعر بامعنی ہوگیا۔ یہ نہ سمجھا کرو کہ اگلے جو لکھ گئے ہیں، وہ حق ہے۔ کیا آگے آدمی احمق نہیں پیدا ہوتے تھے؟ "زماں و زمانہ" کو میں پاگل ہوں جو غلط کہوں گا؟ ہزار جگہ میں نے نظم و نثر میں "زماں" و "زمانہ" لکھا ہوگا۔

وہ شعر کس واسطے کاٹا گیا؟ سمجھو، پہلا مصرع لغو، دوسرے مصرع میں "نبرد" کا فاعل معدوم۔ حلقہ زا کی زے پر نقطہ نہ تھا، میں نے غصہ میں لکھا کہ نہ "حلقہ را" درست

نہ "حلقہ زا" درست مگر بہ فارسی "بیدلا" ہے۔ خیر، رہنے دو۔ مرتا ہوں، مجھے سمجھاتے ہو کہ "صد جا در کلام اہل زباں خواہند یافت" مگر میں بانی کلام اہل زبان نہیں۔

گردشِ چرخ استخواں سائید

اس سے یہ بہتر ہے:

سودہ شد استخواں نہ گردشِ چرخ

باقی اور مصرعے سب اچھے بنائے ہیں۔ غالب

(۹۴)

صاحب،

دو زبانوں سے مرکب ہے یہ فارسی متعارف: ایک [illegible]، ایک عربی۔ بہر حال منطق[1] میں لغات ترکی بھی آجاتے ہیں مگر کمتر۔ میں عربی کا عالم نہیں، مگر نرا جاہل بھی نہیں بس اتنی بات ہے کہ اس زبان کے لغات کا محقق نہیں ہوں۔ علماء سے پوچھنے کا محتاج اور سند کا طلب گار رہتا ہوں۔ فارسی میں مبداء فیاض سے مجھے وہ دستگاہ ملی ہے اور اس زبان کے قواعد و ضوابط میرے ضمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں جیسے فولاد میں جوہر۔ اہلِ پارس میں اور مجھ میں دو طرح کے تفاوت ہیں ایک تو یہ کہ ان کا مولد ایران اور میرا مولد ہندوستان۔ دوسرے یہ کہ وہ لوگ آگے پیچھے، سو دو سو، چار سو، آٹھ سو برس پہلے پیدا ہوئے ہیں۔

جود لغت عربی ہے بمعنی بخشش۔ "جواد" صیغہ ہے صفت مشبہ کا بے تشدید اس وزن پر صیغہ فاعل میری سماعت میں جو نہیں آیا تو میں اس کو خود نہ لکھوں گا مگر جبکہ نظیری شعر میں لایا اور وہ فارسی کا مالک اور عربی کا عالم تھا، تو میں نے مانا۔ کیا ہنسی آتی ہے کہ تم مانند اور شاعروں کے مجھ کو بھی یہ سمجھے ہو کہ استاد کی

---

[1] یعنی بول چال میں

غزل یا قصیدہ سامنے رکھ لیا یا اس کے قوافی لکھ لیے اور ان قافیوں پر لفظ جوڑنے لگے ۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ ۔ بچپن میں جب میں ریختہ لکھنے لگا ہوں ، لعنت ہے مجھ پر اگر میں نے کوئی ریختہ یا اس کے قوافی پیشِ نظر رکھ لیے ہوں ۔ صرف بحر اور ردیف قافیہ دیکھ لیا اور اس زمین میں غزل ، قصیدہ لکھنے لگا ۔ تم کہتے ہو نظیری کا دیوان وقتِ تحریرِ قصیدہ پیشِ نظر ہوگا اور جو اس کے قافیہ کا شعر دیکھا ، اس پر لکھا ہوگا ۔ واللہ اگر تمھارے اس خط کے دیکھنے سے پہلے ، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس زمین میں نظیری کا قصیدہ بھی ہے ۔ چہ جائے آنکہ وہ شعر ۔ بھائی شاعری معنی آفرینی ہے ، قافیہ پیمائی نہیں ہے ۔

"زمان" لفظِ عربی "ازمنہ" جمع ، دونوں طرح فارسی میں مستعمل "زمانے" "یک زماں" "ہر زماں" "زماں زماں" "دریں زماں" "دراں زماں" سب صحیح اور فصیح ۔ جو اس کو غلط کہے ، وہ گدھا ۔ بلکہ اہلِ فارس نے مثل "موج" و "موجہ" یہاں بھی "ہ" بڑھا کر "زمانہ" استعمال کیا ہے ۔ یک زماں کو میں نے کبھی غلط نہ کہا ہوگا ۔ سعدی کے شعر لکھنے کی کیا حاجت ؟

سنو میاں : میرے ہم وطن یعنی ہندی لوگ جو وادی فارسی دانی میں دم مارتے ہیں ، وہ اپنے قیاس کو دخل دے کر ضوابط ایجاد کرتے ہیں ۔ جیسا وہ گھاگس ، الو عبدالواسع ہانسوی لفظ "نامراد" کو غلط کہتا ہے اور یہ الو کا پٹھا "قتیل" "عفونت کدہ" "شفقت کدہ" "نشتر کدہ" کو اور "ہمہ عالم" و "ہمہ جا" کو غلط کہتا ہے ۔ کیا میں بھی ویسا ہی ہوں جو "یک زمان" کو غلط کہوں گا ؟ فارسی کی میزان یعنی ترازو میرے ہاتھ میں ہے ۔ للہ الحمد و للہ المنہ ۔

مرقومہ چہار شنبہ ۲۷ ماہ اگست ۱۸۶۲ء

غالب

(۹۵)

میرزا تفتہ،

جو کچھ تم نے لکھا۔ یہ بے دردی ہے اور بدگمانی۔ معاذ اللہ تم سے اور آزردگی؟ مجھ کو اس پر ناز ہے کہ میں ہندوستان میں ایک دوست صادق الولا رکھتا ہوں، جس کا ہرگوپال نام اور تفتہ تخلص ہے۔ تم ایسی کون سی بات لکھو گے کہ موجب ملال ہو۔ رہا غماز کا کہنا، اس کا حال یہ ہے کہ میرا حقیقی بھائی کل ایک تھا۔ وہ تیس برس دیوانہ رہ کر مر گیا۔ مثلاً وہ جیتا ہوتا اور ہوشیار ہوتا اور تمھاری بُرائی کہتا تو میں اس کو جھڑک دیتا اور اس سے آزردہ ہوتا۔ بھائی! مجھ میں اب کچھ باقی نہیں ہے۔ برسات کی مصیبت گزر گئی لیکن بڑھاپے کی شدت بڑھ گئی۔ تمام دن پڑا رہتا ہوں، بیٹھ نہیں سکتا۔ اکثر لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔ بعد ازا یہ بھی ہے کہ اب مشق تمھاری پختہ ہو گئی۔ خاطر میری جمع ہے کہ اب اصلاح کی حاجت نہ پاؤں گا۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ قصائد سب عاشقانہ ہیں، بکار آمدنی نہیں۔ خیر کبھی دیکھ لوں گا۔ جلدی کیا ہے۔ تین بات جمع ہوئیں۔ میری کاہلی، تمھارے کلام کا محتاج بہ اصلاح نہ ہونا، کسی قصیدے سے کسی طرح کے نفع کا تصور نہ ہونا۔ نظرِ ان مراتب پر کاغذ پڑے رہے۔ لالہ بالمکند بے صبر کا ایک پارسل آیا ہے کہ جس کو بہت دن ہوئے۔ آج تک سرنامہ بھی نہیں کھولا۔ نواب صاحب[۱] کی دس پندرہ غزلیں پڑی ہوئی ہیں:

ضعف نے غالب نکمّا کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

یہ قصیدہ تمھارا کل آیا۔ آج اس وقت کہ سورج بلند نہیں ہوا۔ اس کو دیکھا، اصلاح کیا، آدمی کے ہاتھ ڈاک گھر بھجوایا۔

۲۷ نومبر سنہ ۱۸۶۲ء

غالب

[۱] نواب یوسف علی خاں والیِ رام پور۔

(۹۶)

میرزا تفتہ کہ پیوستہ بہ دل جا دارد ہر کجا ہست خدایا بسلامت دارش

صاحب،

کئی بار جی چاہا کہ تم کو خط لکھوں مگر متحیر کہ کہاں بھیجوں۔ اب جو تمھارا خط آیا، معلوم ہوا کہ حضرت ابھی لکھنؤ میں رونق افروز ہیں۔ خط نہ بھیجوں تو گنہ گار، میں نے یہ عرض کیا ہے کہ مجھ میں اصلاح کی مشقت کی طاقت نہیں رہی۔ معہذا تمھارا کلام پختگی کو پہنچ گیا ہے۔ اصلاح طلب نہیں رہا ہے۔ شیر اپنے بچے کو ایک مدت تک آئین شکار سکھاتا ہے۔ جب وہ جوان ہو جاتا ہے تو خود بے اعانت شیر شکار کیا کرتا ہے۔ یہ میں نے نہیں کہا کہ تم مجھے اپنے کلام کے دیکھنے سے محروم رکھو۔ جو غزل، قصیدہ لکھا کرو، نہ مسودہ بلکہ ایک نقل اس کی ضرور مجھ کو بھیجا کرو۔

غالب

(۹۷)

صاحب بندہ،

میں نے بکس کا ایک ایک خانہ دیکھا۔ سوائے تین کاغذوں کے اور کوئی کاغذ تمھارا نہ نکلا اور اس وقت بہ سبب کم فرصتی کے میں ردیف ان تینوں قصیدوں کی نہیں بتا سکتا۔ اور وہ مقدمہ پچاس کا باقتضائے حالات زمانہ سست ہو گیا ہے، مٹ نہیں گیا۔ دیر آید درست آید۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

اب میرا حال سنو،

در نومیدی بسے امید است پایانِ شبِ سیہ سپید است

ہمیشہ نواب گورنر جنرل کی سرکار سے دربار میں مجھ کو سات پارچے اور تین رقم جواہر خلعت ملتا تھا۔ لارڈ ڈلہوزی کے "صاحب میرا دربار اور خلعت بند کر گئے ہیں۔ ناامید

ہو کر بیٹھ رہا اور مدت العمر کو مایوس ہو رہا۔ اب جو یہاں لفٹنٹ گورنر پنجاب آئے ہیں، میں جانتا تھا کہ یہ بھی مجھ سے نہ ملیں گے۔ کل انھوں نے مجھ کو بُلا بھیجا۔ بہت سی عنایت فرمائی اور فرمایا کہ لارڈ صاحب دلّی میں دربار نہ کریں گے۔ میرٹھ ہوتے ہُوئے اور میرٹھ میں ان اضلاع کے علاقہ داروں اور مالگزاروں کا دربار کرتے ہُئے انبالہ جائیں گے۔ دِلّی کے لوگوں کا دربار وہاں ہوگا۔ تم بھی انبالے جاؤ، شریکِ دربار ہو کر خلعت معمولی لے آؤ۔ بھائی، کیا کہوں کہ کیا میرے دل پہ گزری، گویا مردہ جی اُٹھا۔ ساتھ اس مسرّت کے یہ بھی سنّاٹا گزرا کہ سامانِ سفر انبالہ اور مصارف بے انتہا کہاں سے لاؤں؟ اور طرّہ یہ کہ نذر معمولی میرا قصیدہ ہے۔ ادھر قصیدے کی فکر، ادھر روپے کی تدبیر۔ حواس ٹھکانے نہیں۔ شعر کام دل و دماغ کا ہے، وہ روپے کی فکر میں پریشان۔ میرا خدا یہ مشکل بھی آسان کرے گا۔ مگر اِن دنوں میں نہ دِن کو چین ہے، نہ رات کو نیند ہے۔ یہ کئی سطریں تمھیں اور ایسی ہی کئی سطریں جناب نواب گورنر صاحب کو لکھ کر بھیج دی ہیں۔ جیتا رہا تو انبالے سے آکر خط لکھوں گا۔

روز چارشنبہ ۱۳ رمضان ۱۲۷۹ھ، ۴ مارچ ۱۸۶۳ء غالب

(۹۸)

لو صاحب، ہم نے لفٹنٹ گورنر کی ملازمت اور خلعت پر قناعت کر کے انبالے جانا موقوف کیا اور بڑے گورنر کا دربار اور خلعت اور وقت پہ موقوف رکھا۔ بیمار ہوں ہاتھ پہ ایک زخم، زخم کیا ایک غار ہو گیا ہے۔ دیکھیے انجام کار کیا ہوتا ہے۔ غالب

(۹۹)

حضرت،

پرسوں صبح کو تمھارے سب کاغذ ایک لفافے میں بند کر کے ڈاک گھر بھجوا دیے سمجھا کہ اب چند روز کو جان بچی۔ اسی دن شام کو ایک خط آپ کا اور پہنچا۔ اس کو

بھی روانہ کرتا ہوں۔ اپنا حال پرسوں کے خط میں مفصّل لکھ چکا ہوں۔ ادنیٰ بات یہ ہے کہ جو کچھ لکھتا ہوں، وہ لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ میرا لکھا ہوُا میرا حال باور نہیں اور کسی نے جو کہہ دیا کہ غالب کے پانو کا ورم اچھا ہو گیا اور اب وہ شراب دن کو بھی پیتا ہے، تو حضور نے اِن باتوں کو یقین جانا۔ بیس برس آگے یہ بات تھی کہ ابر و باراں ہیں یا پیش از طعام چاشت یا قریب شام تین گلاس پی لیتا تھا اور شراب شبانہ معمولی بیں مجرانہ لیتا تھا۔ اس بیس برس میں بیس برساتیں ہوئیں بڑے بڑے مینہ برسے۔ پینا ایک طرف دل میں بھی خیال نہ گزرا۔ بلکہ رات کی شراب کی مقدار کم ہو گئی۔ پانو کا ورم حد سے زیادہ گزر گیا۔ مادہ تحلیل کے قابل نہ نکلا۔ کھولن شروع ہو گئی۔ حکما جو دو تین یہاں ہیں، اُن کی رائے کے مطابق کل سے نیب کا بھُرتا بندھے گا۔ وہ پکالائے گا۔ تب اس کے پھوڑنے کی تدبیر کی جائے گی۔ تلوا زخمی یا پنڈلی زخمی۔ اگر وہ نامرد بے درد جھوٹا ہے تو اس پر ہزار لعنت اور اگر میں جھوٹا ہوں تو مجھ پر سو ہزار لعنت ۱۲

غالب

(۱۰۰)

حضرت،

آپ کے سب خط پہنچے، سب قصیدے پہنچے۔ بعد اصلاح بھیج دیے گئے۔ ستّر برس کی عمر، آلام روحانی، نہ میں کہوں، نہ کوئی باور کرے۔ امراض جسمانی میں کیا کلام ہے۔ بائیں پانو میں مہینہ بھر سے ورم ہے۔ کھڑے ہوتے میں رگیں پھٹنے لگتی ہیں۔ افعال دماغ ناقص ہو گئے۔ حافظہ گویا کبھی تھا ہی نہیں۔ قصّہ مختصر، ایک قصیدہ سابق کا اور ایک کل کا آیا ہوُا، یہ دونوں ایک لفافے میں آج روانہ کرتا ہوں

جمعہ ۳ر جولائی ۱۸۶۳ء

غالب

مرزا تفتہ،

یہ غلطی تمھارے کلام میں کبھی نہیں دیکھی تھی کہ شعر ناموزوں ہو۔ بڑی قباحت یہ کہ "اعمّ" بہ تشدید لفظ عربی ہے:

دیگہ نتواں گفت اخص را کہ اعم است

مگر بحر او رہو جاتی ہے۔ مانا کہ فارسی نویسان عجم نے یوں بھی لکھا ہو۔ کاف کے اسقاط کی کیا توجیہ کرو گے؟ اور پھر اس صورت میں بھی تو بحر بدل جاتی ہے۔ ناچار اس شعر کو نکال ڈالو۔ ہمیں نے قصائد لکھنے کو کہا تھا، اب ہم منع کرتے ہیں کہ عاشقانہ قصائد نہ لکھا کرو۔ مدح بشرط ضرورت لکھو، مگر بہ فکر و غور ۱۲ غالب

(۱۰۲)

سچ ہے، اگر آپ استاد کا مصرع نہ لکھتے تو میں "بروے استادن زنگ" کو کہاں سے سمجھتا:

بہ از من نصیحت گوے بایدت ندانم پس از من چہ پیش آیدت

میں نے جو لکھا کہ میں اچھا ہوں، اس کو آپ سچ سمجھ کر خدا کا شکر بجا لائے۔ وہ جو میں نے لکھا تھا کہ شدتِ مرض کا بیان مبالغہ شاعرانہ ہے، اس کو بھی آپ نے سچ جانا ہو گا حالانکہ یہ دونوں کلمے از راہ طنز تھے۔ میں جھوٹ سے بیزار ہوں اور جھوٹے کو ملعون جانتا ہوں۔ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ جب تم نے کسی طرح بیان واقعی کو باور نہ کیا تو میں نے تمھیں لکھ بھیجا کہ اچھا ہوں اور یہ کلمہ تمھیں میں نے جب لکھا ہے کہ عہد کر لیا ہے کہ جب تک دم میں دم اور ہاتھ میں جنبش قلم ہے، جب تک موقع اصلاح خیال میں آسکتا ہے، آج جو تمھارا دفتر پہنچے گا۔ اس کو کل روانہ کر دیا کروں گا۔

مجملاً حال میرا یہ ہے کہ قریب مرگ ہوں۔ دونوں ہاتھوں میں پھوڑے،

پانو میں ورم۔ نہ وہ اچھے ہوتے ہیں نہ یہ رفع ہوتا ہے۔ بیٹھ نہیں سکتا۔ لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔ کل تمہارا دوسرا رقعہ آیا۔ آج صبح کو لیٹے لیٹے اس کو دیکھ کر تمہیں بھجوایا۔ زنہار تم مجھے تندرست سمجھے جاؤ اور دفتر کے دفتر بھیجے رہو۔ ایک دن سے زیادہ توقف نہ کروں گا۔ قریب مرگ ہوں تو بلا سے۔

پنجشنبہ ۲۳ جولائی سنہ ۱۸۶۳ء غالب

(۱۰۳)

"انگشتری" اور "خاتم" دونوں ایک ہیں۔ تم نے "خاتم" بمعنی "نگین" باندھا۔ یہ غلط "جنس دغائے کس مخر" کیا ترکیب ہے؟ "جنس کس مخر دغا" البتہ درست ہے نظر اول میں بہ سبب تکدر حواس اور کثرت درد ورم پا کے میں نے خیال نہ کیا ہوگا ۱۲

یہ خط لکھ کر بنا رکھا کہ کل صبح روانہ کروں گا۔ چشم بد دور! آج اسی وقت کہ دو گھڑی دن ہے، آپ کا نوازش نامہ پہنچا، دوسرا جو میں نے خالی چھوڑ دیا ہے۔ اس کو کتر کر، یہ سطریں لکھ کر، پھر بند کرتا ہوں:-

سبحان اللہ: "دیگر نتواں گفت خموش اکہ اعم ست ایں"

اس کا وزن کب درست ہے؟ کیا فرماتے ہو؟ غور کرو، بعد غور کے اس کی ناموزونی کا خود اقرار کروگے۔

شرف قزوینی کے مطلع میں "ساغر غم درکشیدہ ایم" "دم درکشیدہ ایم" دوسرے شعر میں: "پیمانہ ہائے زہر ستم درکشیدہ ایم"

"درکشیدن" کو ربط پیمانہ کے ساتھ ہے یا زہر کے ساتھ؟ اگر "زہر درکشیدن" جائز ہوتا تو "دم سم" کے قافیہ کو کیوں چھوڑتا؟ "تیسرے شعر میں "قلم درکشیدن" ہے۔ چوتھے شعر میں "آب درکشیدن" ہے۔ پانچویں شعر میں "سر درکشیدن" ہے۔ کیا زہر پانی ہے؟ اگر بمثل زہراب ہوتا تو روا تھا۔

سبحان اللہ! یہ عبارت "جاییکہ شرف قزوینی ساغرو پیمانہ زہر درکشید" اے برادر! شرف زہر کجا درکشید بلکہ پیمانہ عزہر درکشید۔ ثماہم ساغر سم درکشید۔ سم درکشیدن کجا و پیمانہ غم درکشیدن کجا! ہم نے تو تم کو اجازت دی ہے، خیر رہنے دو۔ ہند میں اس کو کون سمجھے گا۔ چاہو یوں کر دو۔

دانی من و دل آنچہ بہم درکشیدہ ایم　　در یک نفس دو ساغر سم درکشیدہ ایم

سبحان اللہ! تم جانتے ہو کہ میں اب دو مصرعے موزوں کرنے پر قادر ہوں جو مجھ سے مطلع مانگتے ہو:

گمان زیست بود بر منت ز بے دردی　　بد است مرگ ولے بد تر از گماں تو نیست

خیر شرف قزوینی کی سند پر وہ مطلع رہنے دو ۱۲ غالب ۱۲

میں ایسا جانتا ہوں کہ "ورّاعہ" بہ تشدید ہے اور وہ "درع" بوزن "زرع" اور لغت ہے ۱۲

صاحب، یہ قصیدہ تم نے ایسا لکھا ہے کہ میرا دل جانتا ہے۔ کیا کہنا ہے۔ ایک خیال رکھا کرو کہ شعر اخیر میں کوئی ایسی بات آجائے کہ جس سے اختتام کے معنی پیدا ہوا کریں۔ ایک قصیدہ اصلاح دے کر بھیج چکا ہوں اور اسی ورق پر فلانے صاحب کے باب میں تم کو ایک نصیحت کر چکا ہوں۔ ادھر کے جواب کا ہرگز خیال نہ رکھو اور ادھر سے اگر قصیدے کے ارسال میں دیر ہو جائے، تو گھبرایا نہ کرو۔ اب میرے پاس دو قصیدے ہیں ایک "نشکر برادرم" اور ایک کل آیا ہے "برجا ماند و درجا ماند" خوب کہی کہ مضمون سے پہلے ممدوح ڈھونڈھنا پڑتا ہے۔ اگر میں تم کو ممدوح بتا سکتا تو قصیدہ اس کے نام کا تم سے منگوا چکا ہوتا اور اس ممدوح تک پہنچا چکا ہوتا۔ بھائی، ایک دقیقہ ہے کہ لکھنے کے قابل نہیں، ہاں، ملاقات ہوئے پر کہہ سکتا ہوں۔ اللہ اللہ!

غالب　　جولائی ۱۸۶۳ء

(۱۰۴)

صاحب،

"گوہر زا" "خاور زا" یہ قصیدہ بہت اصلاح طلب تھا۔ ہم نے اصلاح دے کے تمھارے پاس بھیج دیا ہے۔ جب تم صاف کر کے بھیجو گے، ہم تمھارے ممدوح کو دے دیں گے۔ کل تمھارا قصیدہ پہنچا۔ ہم نے دوپہر کو دیکھ کر درست کیا۔ آج پنجشنبہ ۱۲۔ستمبر کو ڈاک میں بھجوا دیا۔

صاحب، آج میر بادشاہ آئے۔ تمھاری خیر و عافیت اُن کی زبانی معلوم ہوئی۔ اللہ تمھیں خوش رکھے اور مجھ کو تمھارے خوش رکھنے کی توفیق دے۔ ممدوح کا نام کیا لکھوں؟ بات اِسی قدر ہے کہ رام پور میں کوئی صورت کسی طرح بنتی نظر نہیں آتی، ورنہ کیا تمھارا قصیدہ وہاں نہ بھجواتا؟

'دراعہ' کو یہ نہ کہو کہ تشدید نہیں ہے۔ اصل لغت مشدد ہے۔ شعرا اس کو مخفف بھی باندھتے ہیں۔ سعدی کے مصرع سے اتنا مقصود حاصل ہوا کہ "دراعہ" بے تشدید بھی جائز ہے۔ یاد رہے "جادہ" اور "دراعہ" دونوں عربی لغت ہیں۔ وہ دال کی تشدید سے اور وہ رے کی تشدید سے۔ مگر خیر "جادہ" "دراعہ" بھی لکھتے ہیں۔ یہ نہ کہو کہ درّاعہ ہرگز نہیں ہے۔ یہ کہو کہ درّاعہ بے تشدید بھی جائز ہے۔

غالب

۱۲۔ستمبر ۱۸۶۳ء

(۱۰۵)

بھائی صاحب،

"درکشیدن" کی جگہ "درکشیدن" بلکہ "برکشیدن" کی جگہ "درکشیدن" نہ چاہیے۔ "برآمدن" و "درآمدن" کا استعمال بعض متاخرین نے عام کر دیا ہے۔ یعنی "درآید" سے "برآید" کے معنی لیے ہیں۔ لیکن "درکشیدن" اور ہے اور "برکشیدن" اور

میں قریب بمرگ ہوں۔ پانو کے ورم نے اور ہاتھ کے پھوڑے نے مار ڈالا ہے۔ باور رکھنا اور میرے سب آدمی بلکہ بعض دوست جو روز آتے ہیں وہ بھی گواہ ہیں کہ میں صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک پڑا رہتا ہوں۔ خطوط کی تحریر لیٹے لیٹے ہوتی ہے۔ اشعار اصلاح کو بہت جگہ سے آتے تھے، سب کو منع کر دیا۔ ایک رئیس رام پور اور ایک تم ان کی اصلاح رہ گئی۔

غالب

(۱۰۶)

لا حول ولا قوة، کس ملعون نے بہ سبب ذوق شعر اشعار کی اصلاح منظور رکھی۔ اگر میں شعر سے بیزار نہ ہوں تو میرا خدا مجھ سے بیزار۔ میں نے تو بطریق قہر درویش بجان درویش لکھا تھا۔ جیسے اچھی جورو بُرے خاوند کے ساتھ مرنا بھرنا اختیار کرتی ہے۔ میرا تمھارے ساتھ وہ معاملہ ہے۔

(۱۰۷)

نور چشم غالب از خود رفتہ مرزا تفتہ،

خدا تم کو خوش اور تندرست رکھے۔ نہ دوست بخیل نہ میں کاذب۔ مگر بقول میر تقی:

اتفاقات ہیں زمانہ کے

بہ ہر حال کچھ تدبیر کی جائے گی اور انشاءاللہ صورت وقوع جلد نظر آئے گی۔ تعجب ہے کہ اس سفر میں کچھ فائدہ نہ ہوا:

یا کرم خود نماند در عالم یا مگس درین زمانہ نہ کرد

اغنیائے دہر کی مدح سرائی موقوف کرو۔ اشعار عاشقانہ بطریق غزل کہا کرو اور خوش رہا کرو۔

سہ شنبہ ۲۴ نومبر ۱۸۶۳ء نجات کا طالب غالب

(۱۰۸)

صاحب،

کل پارسل اشعار کا ایک آنے کا ٹکٹ لگا کر اور اس پر یہ لکھ کر کہ یہ پارسل ہے، خط نہیں ہے، ڈاک میں بھیج دیا۔ ڈاک منشی نے کہا کہ خطوں کے صندوق میں ڈال دو۔ خدمت گار ناخواندہ آدمی اس کا حکم بجا لایا اور اس کو خطوں کے صندوق میں ڈال دیا وہ لفظ کہ یہ خط نہیں ہے پارسل ہے، دست آویز معقول ہے۔ اگر وہاں کے ڈاک والے تم سے خط کا محصول مانگیں تو تم اس جملہ کے ذریعے سے گفتگو کر لینا۔

مکان میرے گھر کے قریب، حکیم محمود خاں کے گھر کے نزدیک، عطار بھی پاس، بازار بھی قریب، ڈھائی روپے کرایہ کو موجود۔ مگر مالک مکان سے یہ وعدہ ہے کہ ہفتہ بھر کسی اور کو نہ دوں گا۔ بعد ایک ہفتے کے اگر تمھارا مسافر نہ آیا تو مجھے اور کرایہ دار کے دینے کا اختیار ہے۔

رام پور کے باب میں مختصر کلام یہ ہے کہ نہ میں والی رام پور کو لکھ سکتا ہوں، نہ اس لکھنے کی وجہ تم کو لکھ سکتا ہوں۔ اگر ریل میں بیٹھ کر آ جاؤ گے تو زبانی کہہ دوں گا۔ غالب

(۱۰۹)

بھائی،

تم سچ کہتے ہو کہ بہت مسودے اصلاح کے واسطے فراہم ہوئے ہیں۔ مگر یہ نہ سمجھنا کہ تمھارے ہی قصائد پڑے ہیں، نواب صاحب کی غزلیں بھی اسی طرح دھری ہوئی ہیں۔ برسات کا حال تمھیں بھی معلوم ہے اور یہ بھی تم جانتے ہو کہ میرا مکان گھر کا نہیں ہے، کرایے کی حویلی میں رہتا ہوں۔ جولائی سے مینہ شروع ہوا۔ شہر میں سینکڑوں مکان گرے اور مینہ کی نئی صورت۔ دن رات میں دو چار بار برسے اور

ہر بار اس زور سے کہ ندی نالے بہہ نکلیں۔ بالاخانے کا جو دالان میرے اٹھنے، بیٹھنے، سونے، جاگنے، جینے، مرنے کا محل ہے اگرچہ گرا نہیں لیکن چھت چھلنی ہو گئی۔ کہیں لگن، کہیں چلمچی، کہیں اگالدان رکھ دیا۔ قلمدان، کتابیں اٹھا کر توشے خانے کی کوٹھڑی میں رکھ دیے۔ مالک مرمت کی طرف متوجہ نہیں۔ کشتیٔ نوح میں تین مہینے رہنے کا اتفاق ہوا۔ اب نجات ہوئی ہے۔ نواب صاحب کی غزلیں اور تمہارے قصائد دیکھے جائیں گے۔

میر بادشاہ میرے پاس آئے تھے۔ تمہاری خیر و عافیت ان سے معلوم ہوئی تھی۔ میر قاسم علی صاحب مجھ سے نہیں ملے۔ پرسوں سے نواب مصطفیٰ خاں صاحب یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ایک ملاقات ان سے ہوئی ہے۔ ابھی یہیں رہیں گے۔ بیمار ہیں۔ احسن اللہ خاں معالج ہیں۔ فصد ہو چکی ہے۔ جونکیں لگ چکی ہیں۔ اب مسہل کی فکر ہے۔ سوا اس کے سب طرح کی خیریت و عافیت ہے۔ میں ناتواں بہت ہو گیا ہوں۔ گویا صاحب فراش ہوں۔ کوئی شخص نیا تکلف کی مودت کا آ جائے تو اٹھ بیٹھتا ہوں، ورنہ پڑا رہتا ہوں۔ لیٹے لیٹے خط لکھتا ہوں۔ لیٹے لیٹے مسودات دیکھتا ہوں۔ اللہ اللہ۔

صبح جمعہ ۱۴ ماہ اکتوبر ۱۸۶۴ء غالب

(۱۱۰)

منشی صاحب،

میں سال گزشتہ بیمار رہا۔ بیماری میں خدمت احباب سے مقصر نہیں رہا۔ اب مردہ ہوں۔ مردہ کچھ کام نہیں کر سکتا۔ کمشنر و ڈپٹی کمشنر وغیرہ حکام شہر سے ترک ملاقات ہے۔ مگر ڈپٹی کلکٹر شہر سے کہ وہ مہتمم خزانہ ہے، ہر مہینے میں ایک بار ملنا ضرور ہے۔ اگر نہ ملوں تو مختار کار کو تنخواہ نہ ملے۔ ڈگرہ دور صاحب ڈپٹی کلکٹر

چھ مہینے کی رخصت لے کر پہاڑ پر گئے - اُن کی جگہ ریٹیگن صاحب مقرر ہوئے - ان سے ناچار ملنا پڑا - وہ تذکرہ شعرائے ہند کا انگریزی میں لکھتے ہیں - مجھ سے بھی انھوں نے مدد چاہی - میں نے سات کتابیں بھائی ضیاء الدین خاں صاحب سے مستعار لے کر ان کے پاس بھیج دیں - پھر انھوں نے مجھ سے کہا کہ جن شعراء کو تو اچھی طرح جانتا ہے ان کا حال لکھ بھیج - میں نے سولہ آدمی لکھ بھیجے ۔ بقیداس کے کہ اب زندہ موجود ہیں اور اس سواد کی صورت یہ ہے: نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر رئیس لوہارو فارسی و اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں - فارسی میں نیّر اور اُردو میں رخشاں تخلص کرتے ہیں، اسداللہ خاں غالب کے شاگرد، نواب مصطفےٰ خاں بہادر علاقہ دار جہانگیر آباد اُردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے ہیں، اُردو میں مومن خاں کو اپنا کلام دکھاتے تھے - منشی ہرگوپال عرف تفتہ قانونگو سکندر آباد کے، فارسی شعر کہتے ہیں تفتہ تخلص کرتے ہیں، اسداللہ خاں غالب کے شاگرد - ظاہرا بعد اس فہرست کے بھیجنے کے انھوں نے کچھ اپنے منشی سے تم کو لکھوایا ہوگا - پھر کچھ آپ لکھا ہوگا - مجھ کو اس حال سے کچھ اطلاع نہیں - تمھارے خط کی رو سے میں نے اطلاع پائی - اب میں مولوی مظہرالحق ان کے منشی کو بلواؤں گا اور سب حال معلوم کروں گا - اصل یہ ہے کہ تذکرہ انگریزی زبان میں لکھا جاتا ہے - اشعار ہندی اور فارسی کا ترجمہ شامل نہ کیا جائے گا - صرف شاعر کا اور اس کے استاد کا نام اور شاعر کے مسکن، وطن کا نام مع تخلص درج ہوگا - خدا کرے کچھ تم کو فائدہ ہو جائے - ورنہ بظاہر سوائے درج ہونے نام کے اور کسی بات کا احتمال نہیں ہے - ریٹیگن صاحب اب عدالت خفیفہ کے جج ہو گئے - ڈگردر صاحب بہادر پہاڑ سے آ گئے، اپنا کام کرنے لگے - ریٹی گن صاحب شہر سے باہر دو کوس کے فاصلے پر جا رہے - معہذا جاڑے کا موسم، بڑھاپے کا عالم وہاں تک جانا دشوار - اور پھر کوئی مطلب نکلتا ہُوا نظر میں نہیں آتا - بہ ہر حال ہولوں گی

مظہر الحق پرسوں یک شنبہ کے دِن میرے پاس آئیں گے۔ حال معلوم کرکے اگر میرا جانا یا لکھنا تمہاری فلاح کا موجب ہوگا تو ضرور جاؤں گا۔

روز جمعہ ۹ دسمبر ۱۸۶۴ء غالب

(۱۱۱)

آؤ میرزا تفتہ، میرے گلے لگ جاؤ۔ بیٹھو اور میری حقیقت سُنو۔ یک شنبہ کو مولوی مظہر الحق آئے تھے۔ اُن سے سب حال معلوم ہُوا۔ پہلا خط تم کو ان کے بھائی مولوی انوار الحق نے بموجب حکم ڈپٹی کمشنر صاحب کے لکھا تھا۔ پھر ایک خط صاحب نے آپ مسودہ کرکے اپنی طرف سے تم کو لکھا۔ دونوں دیوان تمہارے اور نشترِ عشق اور ایک تذکرہ یہ چار کتابیں تمہاری بھیجی ہوئی ان کو پہنچیں۔ صاحب تم سے بہت خوش اور تمہارے معتقد ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں، اتنا بڑا شاعر کوئی اور ہندوستان میں نہ ہوگا کہ جو پچاس ہزار بیت کا مالک ہو۔ فائدہ اِس التفات کا یہ کہ تمہارا ذکر بہت اچھی طرح لکھیں گے۔ باقی ما بخیر شما بسلامت۔ ہاں ان کے تحت میں پندرہ بیس روپے مشاہرے کے علاقے ہیں، اگر تمہاری اجازت ہو تو اس امر میں اُن سے کلام کروں۔

میرا عجب حال ہے حیران ہوں کہ تمہیں میرا کلام کیوں یاد نہیں آتا؟

گمانِ زیست بود بر منت ز بیدردی بدست مرگ وے بر تر از گماں تو نیست

سامعہ مر گیا تھا، اب باصرہ بھی ضعیف ہو گیا۔ جتنی قوتیں انسان میں ہوتی ہیں، سب مضمحل ہیں۔ حواس سراسر مختل ہیں۔ حافظہ گویا کبھی نہ تھا۔ شعر کے فن سے گویا کبھی مناسبت نہ تھی۔ رئیس رام پور سو روپیہ مہینہ دیتے ہیں، سال گزشتہ ان کو لکھ بھیجا کہ اصلاحِ نظم حواس کا کام ہے اور میں اپنے میں حواس نہیں پاتا۔ متوقع ہوں کہ اس خدمت سے معاف رہوں۔ جو کچھ مجھے آپ کی سرکار سے ملتا

ہے عوض خدمات سابقہ میں شمار کیجیے تو میں سکہ لمبر سہی ورنہ خیرات خوار سہی اور اگر یہ عطیہ بشرط خدمت ہے تو جو آپ کی مرضی ہے، وہی میری قسمت ہے۔ بوس دن سے ان کا کلام نہیں آتا۔ فتوح مقرری نومبر تک آئی۔ اب دیکھیے آگے کیا ہوتا ہے۔ آج تک نواب صاحب از راہ جوانمردی دیے جاتے ہیں اور بھائی تمھاری مشق، چشم بد دور، صاف ہو گئی۔ رطب و یابس تمھارے کلام میں نہیں رہا اور اگر خواہی نخواہی تمھارا عقیدہ یہی ہے کہ اصلاح ضرور ہے، تو میری جان میرے بعد کیا کرو گے؟ میں چراغ دم صبح و آفتاب سر کوہ ہوں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

۱۴ رجب ۱۲۸۱ھ۔ مطابق ۱۴ دسمبر ۱۸۶۴ء نجات کا طالب غالب

(۱۱۲)

منشی صاحب سعادت و اقبال نشان منشی ہرگوپال صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ۔

غالب کی دعائے درویشانہ قبول کریں۔ ہم آپ کو سکندر آباد فانوگویوں کے محلے میں سمجھے ہوئے ہیں اور آپ لکھنؤ راجہ مان سنگھ کی حویلی۔ مطبع اودھ اخبار میں بیٹھے ہوئے مدار یہ حقہ لکھنؤ کا پی رہے ہیں اور منشی نولکشور صاحب سے باتیں کر رہے ہیں۔ بھلا منشی صاحب کو میرا سلام کہنا۔ آج یک شنبہ ہے اخبار کا لفافہ ابھی تک نہیں پہنچا۔ ہر ہفتے کو پنجشنبہ حد جمعہ کو پہنچتا تھا۔

مرزا تفتہ کیا فرماتے ہو؟ کیسے رِیٹی گن صاحب، کہاں رِیٹی گن صاحب! پنجشنبہ کے دِن ۹ جنوری سنہ حال کو وہ پنجاب کو گئے۔ ملتان یا پشاور کے ضلعے میں کہیں کے حاکم ہوئے ہیں۔ اپنی نادانی کے سبب اُن کی ملاقات تودیع کو نہیں گیا۔ انوار الحق گھاٹ پر نوکر ہیں۔ پندرہ روپے مشاہرہ پاتے ہیں۔ زیادہ زیادہ

صبح یک شنبہ ۱۲ فروری ۱۸۶۵ء

نجات کا طالب غالب

(۱۱۳)

صاحب،

واقعی "سداب" کا ذکر کتب طبی میں بھی ہے اور عرفی کے ہاں بھی ہے۔ تمہارے ہاں اچھا نہیں بندھا تھا، اس واسطے کاٹ دیا۔ قراب کون سا لفظ غریب ہے جس کو اس طرح پوچھتے ہو؟ خاقانی کے کلام میں اور اساتذہ کے کلام میں ہزار جگہ آیا ہے۔ قراب اور سداب دونوں لغت عربی الاصل صحیح ہیں۔ غالب ۱۲

(۱۱۴)

حضرت، اس غزل میں پروانہ و پیمانہ و بت خانہ تین قافیے اصلی ہیں "دیوانہ" چونکہ علم قرار پاکر ایک لغت جداگانہ مشخص ہو گیا ہے، اس کو بھی قافیہ اصلی سمجھ لیجیے۔ باقی غلامانہ و مستانہ و "مردانہ" و "رکانہ" و "دلبرانہ" و "شکرانہ" سب ناجائز نامستحسن۔ ایطا اور ایطا بھی قبیح۔ مجھے بہت تعجب ہے کہ انھیں قافیوں میں ایطا کا حال تم کو لکھ چکا ہوں اور پھر تم نے غزل مبنی انھیں قوافی پر رکھی۔ "کاشانہ" و "شانہ" و "افسانہ" و "جانانہ" و "فرزانہ" یہ قافیے کیوں ترک کیے؟ یاد رہے، ساری غزل میں مردانہ یا مستانہ یا اُن کے نظائر میں سے ایک جگہ آوے، دوسری بیت میں زنہار نہ آوے۔ یہ غزل نظری ہو گئی اور غزل لکھ کر بھیجو تا اصلاح دی جائے ۱۲

عفو کا طالب غالب

(۱۱۵)

مرزا تفتہ

پیرشو و بیاموز۔ تم خوش گو اور زود گو مقرر ہو لیکن جس کو تم تحقیقات کہتے ہو، وہ محض توہمات اور تخیلات ہیں۔ قیاس دوڑاتے ہو۔ وہ قیاس کہیں مطابق واقع ہوتا

ہے، کہیں خلاف۔ عرفی کہتا ہے:

روح را ناشتا فرستادی

یعنی رُوح کو تو نے بھُوکا بھیجا۔ "ناشتا" اس کو کہتے ہیں جس نے کچھ کھایا نہ ہو۔ ہندی اس کی "نہار منہ" تم لکھتے ہو: کہ "عجب ناشتا فرستادی"

یعنی غذاے صبح جیسا کہ ہندی میں مشہور ہے۔ اس نے ناشتا بھی کیا ہے یا نہیں۔

واقف کہتا ہے:

نے محرمِ قفس، نہ بہ دام آشنا شدیم نفریں کنیم ساعتِ پرواز خویش را

یہ بھی ہندی کی فارسی ہے "بُری گھڑی" اور "مُبشِر گھڑی" اہل زبان ایسے موقع پر "طالع" لکھتے ہیں:

نفریں کنیم طالع پرواز خویش را

قتیل کہتا ہے:

یک وجب جاے بکوے تو زخوں ہاپک نہ بود کشتہ بوکشتہ تپاں بود دگو خاک نہ بود

یہاں پر "ہیچ نبود" کا محل ہے۔ ہندی میں "کچھ نہیں" کی جگہ "خاک نہیں" بولتے ہیں اور پھر صاحب "برہانِ قاطع" کا کیا ذکر کرتے ہو؟ وہ تو ہر لغت کو تین حرکتوں سے لکھتا ہے۔ زیر زبر پیش کا تفرقہ منظور نہیں رکھتا۔ لکھتا ہے کہ یوں بھی آیا ہے اور یوں بھی دیکھا ہے۔ جس لغت کو کافِ عربی سے لکھے گا، کافِ فارسی سے بھی بیان کرے گا۔ جس لفظ کو طاے حطی سے لائے گا، تاے قرشت سے بھی ضرور لکھے گا۔ فضلاے کلکتہ کے حاشیے دیکھو کہ وہ اس کی کیا تحمیق کرتے ہیں۔

بغیا نبوّت کے مشتقات میں سے ہرگز نہیں۔ امامن امام کے مشتقات میں سے زنہار نہیں۔ نبی بخش کا مخفف "بغیا" اور امام کا متعلق اگر مذکر ہے تو امامی اور اگر مؤنث ہے تو امامن۔ طغرا نے ہندی لغت کے لانے کا التزام کیا ہے:

وقت آں آمد کہ مینا راگ ہندی سر کند

اور اساتذہ کو اس کا التزام منظور نہیں، مگر کیا کریں۔ گوڑگانو نام ہے ایک گاؤں کا، اس کو کیونکہ بدلیں؟ ہاں "گو" بہ رائے قرشت کہیں گے۔ لکھنو نام ہے ایک شہر کا، وہ لکھنو بغیر ہائے مخلوط کے کہیں گے۔ فی زمانہ چھاپے کو چاپ بولتے ہیں۔ عرفی جھکڑ کو "جکر" بولتا ہے:

آں باد کہ در ہند گہ آید جکر آید

را، ثقیلہ، ہائے مخلوط، تشدید، یہ تینوں ثقالتیں مٹا دیں۔ صاحب "برہان قاطع" اس لفظ کو فارسی بتاتا ہے اور زبان علمی اہل ہند بھی اس کو مشترک جانتا ہے۔ اپنے کو رسوا اور خلق کو گمراہ کرتا ہے:

ہرزہ مشتاب و پئے جادہ شناساں بردار

اے کہ در راہ سخن چوں تو ہزار آمد و رفت

اہلِ ہند میں سوائے خسرو دہلوی کے کوئی مسلم الثبوت نہیں۔ میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے۔ فرہنگ لکھنے والوں کا مدار قیاس پر ہے۔ جو اپنے نزدیک صحیح سمجھا، وہ لکھ دیا۔ نظامی و سعدی وغیرہ کی لکھی ہوئی فرہنگ ہو تو ہم اس کو مانیں۔ ہندیوں کو کیوں کہ مسلم الثبوت جانیں؟ گائے کا بچہ بہ زورِ سحر آدمی کی طرح کلام کرنے لگا، بنی اسرائیل اس کو خدا سمجھے۔ یہ جھگڑے قصے جانے دو۔

دو باتیں سنو۔ ایک تو یہ کہ ارغنون کو بغین مضموم میں نے سہو سے لکھا۔ در اصل ارغنون بغین مفتوح اور مخفف اس کا ارغن اور مبدل منہ ارگن ہے۔ دوسرے یہ کہ جب موسوی خاں نے الوائے کو الوا لکھا، تو اس لفظ کی صحت میں کچھ تامل رہا۔ رام پور سے اپریل کے مہینے کا روپیہ اور تعزیت و تہنیت کے خط کا جواب آ گیا۔ آیندہ جو خدا چاہے۔

غالب

یک شنبہ۔ ۱۴ مئی ۱۸۶۵ء

(۱۱۶)

صاحب،

تم نے "تن تن" کو ذکر کیوں کیا؟ میں نے اس باب میں کچھ نہ لکھا تھا۔ "تن تن" اور "تننا" اصوات ہیں تار کے۔ ہندی اور فارسی میں مشترک۔ "بنیا" اور "امامن" کے لکھنے کو میں نے منع ہرگز نہیں کیا۔ شوق سے لکھو۔ یہ تم کو سمجھایا تھا کہ "بنیا" مخفف "نبی بخش" اور "امامن" متعلق بہ "امام" ہے۔ مشتقات میں اس کو تصوّر نہ کرو۔ قاعدہ دانانِ اشتقاق تم پر ہنسیں گے ۱۲

ایوائے کے جتنے شعر تم نے لکھے ہیں، سب مانع ہیں "ایوا" کے اور سند "ایوائے" کی۔ موسوی خاں نے بحسب ضرورت شعر "ایوا" لکھا۔ "تہمتن" بروزن "قلمزن" ہے۔ فردوسی نے سو جگہ شاہنامے میں "تہمتن" بسکون ہائے ہوز لکھا ہے۔ پس کیا اس لغت کی دو صورتیں قرار پا گئیں؟ لاحول ولاقوۃ۔ لعنت وہی بحرکت ہائے ہوز ہے ۱۲

میں نے کس قدر کلام کو طول دیا۔ صائب کے شعر کی حقیقت شرح و بسط سے لکھی۔ تم نے ہرگز اعتنا نہ کیا۔ "ایوا" کو الگ سمجھے۔ "مصیبتاہ" کو جدا سمجھے۔ بھلا میرے قول کو گوز شتر سمجھتے ہو؟ "واصیبتاہ" یا "حسرتاہ" برہان قاطع میں یا "بہار عجم" میں ہم کو دکھا دو۔ وہی "وائے" ہے کہ جب اس کے بعد "مصیبتا" یا "حسرتا" یا "ویلا" آتا ہے، تو تحتانی کو حذف کر کے "واویلا" وغیرہ لکھتے ہیں۔ چاہو "اے واویلا" لکھو، چاہو "واویلا" لکھو، چاہو آخر میں ہائے ہوز لکھو، جیسا کہ "وامصیبتاہ"۔ چاہو بے ہائے ہوز "وامصیبتا"۔ اور یہی حال ہے "حسرت" و "درد" و "اسف" و "دریغ" کا۔ جہاں اے کے ساتھ وامصیبتا پاؤ، وہاں "اے" کے حرف کو ندا اور منادے یعنی ہمنشین اور ہمدم کو مقدر سمجھو۔ فرہنگ لکھنے والوں نے اشعار قدما میں ترکیبیں

دیکھیں۔ اپنا قیاس دوڑا کر اس کی حقیقت ٹھہرا لی۔ کہیں ان کا قیاس غلط، کہیں صحیح۔ سوال میں یہ دکنی الیسان کج فہم ہے کہ اس کا قیاس نسخۂ لغت میں شاید دس جگہ صحیح ہو۔ میں نے تو صاف لکھ دیا تھا کہ موسوی خاں کے شعر کی سند پر "الیوا" کو رہنے دو۔ مگر صائب کے شعر میں "الیوا" کو الگ اور "مصیبتاہ" کو جدا نہ سمجھو۔ تمہارے قیاس نے پھر تمھیں کہیں کا کہیں پھینکا اور تم نے بھی کہا کہ صائب نے "الیوا" لکھا ہے۔

نجات کا طالب غالب

(۱۱۷)

دل بسے داغدار بود، نماند　　　در نظرہا بہار بود، نماند

اگر بود کے آگے واو موقوف اور محذوف کر دو گے تو ہمارے نزدیک کلام سراسر بلیغ ہو جائے گا[1]۔ میری جان جو خجالت کہ مجھ کو تم سے ہے، شاید بسبب عبادت نہ کرنے کے قیامت میں خدا سے بھی نہ ہوگی اور بسبب خلاف شرع کرنے کے پیمبر سے بھی نہ ہوگی۔ مگر خدا ہی جانتا ہے جو میرا حال ہے۔　　　مرگِ ناگاہ کا طالب غالب

(۱۱۸)

میاں:

سنو اس قصیدے کا ممدوح شعر کے فن سے ایسا بیگانہ ہے جیسے ہم تم اپنے اپنے مسائل دینی سے۔ بلکہ ہم تم باوجود عدم واقفیت امور دینی سے نفور نہیں اور وہ شخص اس فن سے بیزار ہے۔ علاوہ اس کے وہ اتالیق کہاں؟ وہاں سے نکالے گئے۔ دلّی میں اپنے گھر بیٹھے ہوئے ہیں۔ جب سے آئے ہیں، ایک بار میرے پاس نہیں آئے۔ نہ میں ان کے پاس گیا۔ یہ لوگ اس لائق بھی نہیں کہ ان کا نام لیجیے، چہ جائے آنکہ مدح کیجیے۔ ہائے انوری:

---

(۱) تفتہ کا شعر غالباً اس طرح تھا: دل بسے داغدار بود و نماند　　　در نظرہا بہار بود و نماند

اے دریغا نیست ممدوحے سزاوارِ مدیح　　اے دریغا نیست معشوقے سزاوارِ غزل

غالب

(۱۱۹)

میرے مہربان، میری جان، میرزا آفتہ سخندان،

تمھارا اسکندر آباد اور میرے خط کا تمھارے پاس پہنچنا تمھاری تحریر سے معلوم ہُوا۔ زندہ رہو اور خوش رہو۔ میں نثر کی داد اور نظم کا صلہ مانگنے نہیں آیا، بھیک مانگنے آیا۔ روٹی اپنی گرہ سے نہیں کھاتا، سرکار سے ملتی ہے۔ وقتِ رخصت میری قسمت اور منعم کی ہمت۔ نواب صاحب از روے صورت رُوحِ مجسم اور باعتبار اخلاق آیتِ رحمت ہیں۔ خزانۂ فیض کے تحویلدار ہیں، جو شخص قضا و قدر ازل سے جو کچھ لکھوا لایا ہے۔ اس کے بٹنے میں دیر نہیں لگتی۔ ایک لاکھ کئی ہزار روپئے سال غلّے کا محصول معاف کر دیا۔ ایک اہلکار پر ساٹھ ہزار کا محاسبہ معاف کیا اور بیس ہزار روپیہ نقد دیا۔ منشی نولکشور صاحب کی عرضی پیش ہوئی۔ خلاصہ عرضی کا سُن لیا۔ واسطے منشی صاحب کے کچھ عطیہ بتقریب شادی صبیہ تجویز ہو رہا ہے۔ مقدار مجھ پر نہیں کھلی۔ مصطفےٰ خاں صاحب بتقریب تہنیتِ مسند نشینی و شمولِ جشن آنے والے ہیں۔ اس وقت تک نہیں آئے۔ جشن یکم دسمبر سے شروع، ۵ر دسمبر کو خلعت کا آنا مسموع۔

دوشنبہ ۲۸ر نومبر ۱۸۶۵ء بوقت چاشت　　نجات کا طالب غالب

(۱۲۰)

لو صاحب،

کھچڑی کھائی دِن بہلائے، کپڑے پھاٹے گھر کو آئے۔

۸ر جنوری ماہ و سال دوشنبہ کے دِن غضب الٰہی کی طرح اپنے گھر پر نازل ہوا۔ تمھارا خط مضامین دردناک سے بھرا ہُوا رام پور میں میں نے پایا۔ جواب لکھنے

کی فرصت نہ ملی۔ بعد روانگی کے مرادآباد میں پہنچ کر بیمار ہو گیا۔ پانچ دن صدرالصدور صاحب کے ہاں پڑا رہا۔ انھوں نے بیمارداری اور غمخواری بہت کی۔

کیوں ترک لباس کرتے ہو؟ پہننے کو تمھارے پاس ہے کیا جس کو اتار پھینکو گے؟ ترک لباس سے قیدِ ہستی مٹ نہ جائے گی۔ بغیر کھائے پیئے گزارا نہ ہو گا۔ سختی و سستی، رنج و آرام کو ہموار کرو۔ جس طرح ہو اسی صورت سے بہر صورت گزرنے دو:

تاب لائے ہی بنے گی غالب واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

جنوری ۱۸۶۶ء اس خط کی رسید کا طالب غالب

(۱۲۱)

میرزا تفتہ صاحب،

پرسوں تمھارا دوسرا خط پہنچا۔ تم سے پردا کیا ہے، ایک فتوح کا منتظر ہوں۔ اس میں میں نے اپنے ضمیر میں تم کو شریک کر رکھا ہے۔ زمانہ فتوح کے آنے کا قریب آگیا ہے۔ انشاء اللہ خط میرا مع حصۂ فتوح جلد پہنچے گا۔ پنڈت بدری داس ڈاک منشی کرنال باآنکہ مجھ سے اس سے ملاقات ظاہری نہیں ہے، مگر میں جب جیتا تھا تو وہ اپنا کلام اصلاح کے واسطے میرے پاس بھیجتا تھا۔ بعد اپنے مرنے کے میں نے اس کو لکھ بھیجا کہ اب تم اپنا کلام منشی ہرگوپال تفتہ کے پاس بھیج دیا کرو۔ اب تم کو بھی لکھتا ہوں کہ تم میرے اس لکھنے کی ان کو اطلاع لکھو۔ میں زندہ ہوں اوپر کے ملبر میں جو اپنے کو مردہ لکھا ہے، وہ باعتبار ترک اصلاح نظم لکھا ہے، ورنہ زندہ ہوں، مردہ نہیں۔ بیمار بھی نہیں۔ بوڑھا، ناتواں، مفلس، قرضدار، کانوں کا بہرہ، قسمت کا بے بہرہ، زیست سے بیزار، مرگ کا امیدوار۔

غالب

(۱۲۲)

حضرت،

اِس قصیدہ کی جتنی تعریف کروں کم ہے۔ کیا کیا شعر نکالے ہیں۔ لیکن افسوس کہ بے محل اور بیجا ہے۔ اِس مدح اور اس ممدوح کا بعینہ وہ حال ہے کہ ایک مزبلہ پر سیب کا یا آبہی کا درخت اُگ جائے۔ خدا تم کو سلامت رکھے۔ دکان بے رونق کے خریدار ہو [1]

(۱۲۳)

میرزا تفتہ،

کیا کہنا ہے، نہ ظہیر کا پتا نہ غالب کا۔ مداح شایستہ صد ہزار آفریں اور ممدوح سزاوار صد نفریں۔[2]

---

[1] معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ تفتہ نے خود غالب کی مدح میں لکھا تھا۔

[2] ظاہرا یہ قصیدہ بھی غالب ہی کی مدح میں تھا۔

مرزا حاتم علی بیگ مہر

میرزا حاتم علی بیگ مہر کے پر دادا نادر شاہ کے ساتھ اصفہان سے ہندوستان آئے تھے ان کے دادا رکن الدولہ امداد علی خاں بہادر غالباً ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے یہ شجاع الدولہ نواب وزیر اودھ کے ندیم خاص بن گئے۔ علاقہ دلمئو کے ناظم تھے۔ مہر کے والد کا نام میرزا فیض علی بیگ تھا۔ وہ انگریزی عملداری میں تحصیلداری کے عہدے پر فائز رہے۔ مہر ۱۲۳۰ھ (۱۸۱۵ء) میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ جہاں ان کا خاندان مستقل طور پر مقیم تھا۔ ابھی کم عمر ہی تھے کہ والد فوت ہو گئے۔ والدہ نے بڑے اہتمام سے تعلیم دلائی۔ ۱۸۴۰ء میں قانون کا امتحان پاس کر کے چنار گڑھ ضلع مرزا پور میں منصف مقرر ہوئے۔ خود کہتے ہیں:

ازبسکہ سوزِ ہجر سے خوگر ہوئے ہیں ہم — منصف چنار گڑھ میں مقرر ہوئے ہیں ہم

حاتم علی بیگ کے ایک بھائی عنایت علی بیگ تھے۔ بعض نے لکھا ہے کہ بڑے تھے اور بعض انھیں چھوٹا بتاتے ہیں۔ غرض دونوں بھائیوں کو تقریباً ایک ہی وقت میں شعر گوئی کا شوق ہوا۔ عنایت علی بیگ نے ماہ تخلص رکھا اور آتش کے شاگرد ہوئے۔ حاتم علی بیگ نے مہر تخلص اختیار کیا اور ناسخ کے شاگرد بن گئے۔

"غدر" میں مہر نے اپنے ماموں سخاوت علی بیگ کی امداد سے سات انگریزوں کو اپنے گھر میں پناہ دے کر ان کی جان بچائی۔ اس خدمت کے صلے میں انھیں بائیس پارچے کا خلعت، مالائے مروارید اور ایک گھوڑا مع اسلحہ ملا۔ نیز دو گاؤں جاگیر میں ملے۔ غالب نے خط ۱۲ میں اس اعزاز کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد میرزا مہر لکھنؤ کی اقامت چھوڑ کر آگرے میں مقیم ہو گئے اور وکالت شروع کر دی آگرے میں وہ نواب محمد خاں کی مسجد کے متصل رہتے تھے۔ بیچ میں آنریری مجسٹریٹ بھی ہو گئے تھے۔

۱۸۷۹ء میں اپنے بیٹے میرزا سخاوت علی بیگ تحصیلدار سے ملنے کے لیے ایٹہ گئے، وہیں وفات پائی - بڑے بے تعصب آدمی تھے - مہاراجہ بلوان سنگھ خلف مہاراجہ چیت سنگھ نے مہر کی شاگردی اختیار کرلی تھی اور سُنا ہے کہ پچاس روپے ماہانہ بطور نذران کی خدمت میں پیش کرتے تھے -

مہر کا ابتدائی منظوم کلام غدر میں لٹ گیا - وہ خود لکھتے ہیں :

اس عہد میں ہر اک تہ چرخ کہن لُٹا اوروں کا زر لٹا، مرا نقد سخن لٹا

بقیہ تصانیف کی کیفیت یہ ہے :-

(۱) دیوان اردو موسوم بہ "الماس درخشاں" یا "خیالات مہر"

(۲) رسالہ "پیرایہ عروض"

(۳) اباغ فرنگستان (یعنی ابتداء عہد انگلشیہ کی تاریخ جو ۱۸۶۲ء میں طبع ہوئی)

(۴) "داغ دل مہر" (واسوخت)

(۵) "داغ نگار" (مثنوی)

(۶) "شعاع مہر (مثنوی)

(۷) بیان بخشایش (مثنوی)

اس کے علاوہ "ہمدم آخرت" "پنجۂ مہر" - "توقیر شرف" وغیرہ کے نام سُنے جاتے ہیں - غارت شدہ کلام ہیں "خار عشق" - "انجام عشق" - "کشکول" وغیرہ شامل تھے، جن کی مفصّل کیفیت معلوم نہ ہوسکی - سُنا ہے ان شعرا کا ایک تذکرہ بھی لکھا تھا، جن سے مہر کی ملاقات تھی اور اس کا نام "محیط آشنا" رکھا تھا - قاعدہ نظم کے نام سے بھی ایک تصنیف کا ذکر دیکھا ہے -

(۱)

غلام ساقی کوثر ہوں، مجھ کو غم کیا ہے بہت سہی غم گیتی، شراب کم کیا ہے
یقیں ہے ہم کو بھی، لیکن اب اس میں دم کیا ہے سخن میں خامۂ غالبؔ کی آتش فشانی

علاقہ محبت ازلی کو بر حق مان کر اور پیوند غلامی جناب مرتضیٰ علی کو سچ جان کر ایک بات اور کہتا ہوں کہ بینائی اگرچہ سب کو عزیز ہے مگر شنوائی بھی تو آخر ایک چیز ہے۔ مانا کہ روشنائی اس کے اجارے میں آئی ہے، یہ بھی دلیل آشنائی ہے۔ کیا فرض ہے کہ جب تک دید وادید نہ ہولے اپنے کو بیگانہ یک دگر سمجھیں۔ البتہ ہم تم دوست دیرینہ ہیں، اگر سمجھیں۔ سلام لکھا تھا، آپ کی نظر سے گزر گیا ہو۔ احیاناً اگر نہ دیکھا ہو تو اب مرزا تفتہ سے لے کر پڑھ لیجیے گا اور خط کے لکھنے کے احسان کو اس خط کے پڑھ لینے سے دوبالا کیجیے گا۔

ہائے ہیجر جان جاکوب کیا جوان مارا گیا ہے۔ سچ، اس کا شیوہ یہ تھا کہ اُردو کے فکر کو مانع آتا اور فارسی زبان میں شعر کہنے کی رغبت دلواتا۔ یہ بھی انھیں میں ہے کہ جن کا میں ماتمی ہوں۔ ہزارہا دوست مر گئے۔ کس کو یاد کروں اور کس سے فریاد کروں؟ جیوں تو کوئی غمخوار نہیں، مروں تو کوئی عزادار نہیں۔

غزلیں آپ کی دیکھیں۔ سبحان اللہ چشم بد دور۔ اُردو کی راہ کے تو سالک ہو، گویا اس زبان کے مالک ہو۔ فارسی بھی خوبی میں کم نہیں مشق شرط ہے اگر کہے جاؤ گے لطف پاؤ گے۔ میرا تو گویا بقول طالب آملی اب یہ حال ہے:

لب از گفتن چناں بستم کہ گوئی دہن بر چہرہ زخمے بود، بہ شد

جب آپ نے بغیر خط کے بھیجے مجھے لکھا ہو تو کیوں کو مجھے اپنے خط کے جواب کی تمنّا

نہ ہو؟ پہلے تو اپنا حال لکھیے کہ میں نے سُنا تھا آپ کہیں کے صدرامین ہیں، پھر اکبرآباد میں کیوں خانہ نشین ہیں؟ اس ہنگامہ میں آپ کی صحبت حکام سے کیسی رہی؟ راجہ بلوان سنگھ[1] کا بھی حال لکھنا ضرور ہے۔ کہاں ہیں اور وہ دو ہزار روپیہ مہینہ جو اُن کو سرکار انگریزی سے ملتا تھا، اب بھی ملتا ہے یا نہیں؟

ہائے لکھنؤ! کچھ نہیں کھلتا کہ اس بہارستان پر کیا گزری۔ اموال کیا ہوئے، اشخاص کہاں گئے؟ خاندان شجاع الدولہ کے زن و مرد کا انجام کیا ہوا؟ قبلہ و کعبہ مجتہد العصر کی سرگزشت کیا ہے؟ گمان کرتا ہوں کہ بہ نسبت میرے تم کو کچھ زیادہ آگہی ہوگی۔ اُمیدوار ہوں کہ جو آپ پر معلوم ہے، وہ مجھ پر مجہول نہ رہے۔ پتہ مسکن مبارک کا کشمیری بازار سے زیادہ نہیں معلوم۔ ظاہراً اسی قدر کافی ہوگا۔ ورنہ آپ زیادہ لکھتے۔

مرزا تفتہ کو دعا کہیے گا اور ان کے اس خط کے پہنچنے کی اطلاع دیجیے گا۔ جس میں آپ کے خط کی انھوں نے نوید لکھی تھی۔ والسلام

(۲)

خود شکوہ دلیل رفع آزار بس ست آید بزباں ہر آنچہ از دل برود

بندہ پرور،

فقیر شکوہ سے بُرا نہیں مانتا، مگر شکوہ کے فن کو سوائے میرے کوئی نہیں جانتا۔ شکوے کی خوبی یہ ہے کہ راہِ راست سے مُنہ نہ موڑے اور معہذا دوسرے

---

[1] فرزند راجا جیت سنگھ۔ جیت سنگھ جب وارن ہیسٹنگز کی سختیوں سے تنگ آکر بنارس سے نکلا تو گوالیار میں جا بیٹھا تھا۔ وہ فوت ہوا تو اس کا بیٹا بلوان سنگھ اور رانی آگرے میں مقیم ہوگئے۔ راجہ بلوان سنگھ مرزا غالب اور حاتم علی بیگ مہر کے دوست تھے اور آخرالذکر کے شاگرد بھی۔ راجہ تخلص کرتے تھے۔

کے واسطے جواب کی گنجایش نہ چھوڑے[۱]۔ کیا میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھ کو آپ کا فرخ آباد جانا معلوم ہو گیا تھا، اس واسطے آپ کو خط نہیں لکھا؟ کیا میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے اس عرصہ میں کئی خط بھجوائے اور وہ اُلٹے پھر آئے؟ آپ شکوہ کاہے کو کرتے ہیں، اپنا گناہ میرے ذمہ دھرتے ہیں۔ نہ جاتے وقت لکھا کہ میں کہاں جاتا ہوں، نہ وہاں جا کر لکھا کہ میں کہاں رہتا ہوں۔ کل آپ کا مہربانی نامہ آیا۔ آج میں نے اس کا جواب بھجوایا۔ کہیے اپنے دعوے میں صادق ہوں یا نہیں؟ پس دردمندوں کو زیادہ ستانا اچھا نہیں۔ مرزا تفتہ سے آپ فقط ان کے خط نہ لکھنے کے سبب سرگراں ہیں، میں یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ ان دنوں کہاں ہیں۔ آج، توکلت علی اللہ، سکندر آباد خط بھیجتا ہوں، دیکھوں، کیا دیکھتا ہوں۔

(۳)

صاحب میرے،

عہدۂ وکالت مبارک ہو۔ موکلوں سے کام لیا کیجیے، پریوں کو تسخیر کیا کیجیے۔ مثنوی پہنچی۔ جھوٹ بولنا میرا شعار نہیں۔ کیا خوب بول چال ہے۔ انداز اچھا، بیان اچھا، روزمرہ صاف۔ حبشیوں کا استغاثہ کیا کہوں کیا مزہ دے رہا ہے:

بیگم صاحب پھسوڑے میں پھنسایا۔ چھٹا بیگم نے بے حرمت کرایا۔

اس مثنوی نے اگلی مثنویوں کو تقویم پارینہ[۲] کر دیا۔ "بیان بخشایش" ہم گنہ گاروں تک کیوں کر پہنچے گا۔ مگر ہاں اس راہ سے

کہ مستحق کرامت گناہ گارانند

---

[۱] شکوے کی کتنی عمدہ اور جامع تعریف ہے کہ بات سچی کہے اور دوسرے کے لیے جواب کی گنجایش نہ چھوڑے۔

[۲] پرانی جنتری جو بالکل بے کار ہوتی ہے۔

"بخشش" کا متوقع ہوں۔ میں ابھی تک یہ بھی نہیں سمجھا کہ وہ نسخہ نظم ہے یا نثر ہے اور مضمون اس کا کیا ہے۔

میرزا یوسف علی خاں آٹھ دس مہینے سے مع عیال و اطفال اسی شہر میں مقیم ہیں۔ میرے مسکن کے پاس ایک مکان کرایہ کو لے لیا ہے۔ اس میں رہتے ہیں اُن کو خط بھیجو تو میرے مکان کا پتہ لکھ دینا۔ اور یہ بھی آپ کو معلوم رہے کہ میرے خط کے سرنامے پر محلہ کا نام لکھنا ضرور نہیں۔ شہر کا نام اور میرا نام، قصہ تمام۔ ہاں، یار عزیز کے خط پر میرے مکان کے قریب کا پتہ ضرور رہے۔ دو روز سے "شعاع مہر" کو دیکھ رہے ہیں۔ اکثر تمہارا ذکر خیر رہتا ہے۔ وہ نواب ہر وقت یہیں تشریف رکھتے ہیں۔ رات کو تو پہر چھ گھڑی کی نشست روز رہتی ہے۔ ابھی یہیں سے اُٹھ کر گئے ہیں۔ تم کو سلام کہتے ہیں اور "شعاع مہر" کے مداح اور "بیان بخشایش" کے مشتاق ہیں۔

(۴)

بھائی صاحب،

تمہارا خط اور قصیدہ پہنچا۔ اصل خط تمہارا لفافے میں لپیٹ کر مرزا تفتہ کو بھیج دیا تاکہ حال اُن کو مفصل معلوم ہو جائے۔ بعد اس رپورٹ کے تم کو تہنیت دیتا ہوں۔ پروردگار بہ تصدق ائمۂ اطہار یہ پیش آمد اقبال تم کو مبارک کرے۔ اور منصب ہائے خطیر اور مدارج عظیم کو پہنچا دے۔ واقعی یہ کہ تم نے بڑی جرأت کی فی الحقیقت اپنی جان پر کھیلے تھے۔ بات پیدا کی مگر اپنی مردمی و مردانگی سے۔ دولت کا ہات آنا مع نیکنامی، اس سے بہتر دنیا میں کوئی بات نہیں۔ اب یقین

۱؎ "شعاع مہر" اور "بیان بخشایش" میرزا مہر کی مثنویاں ہیں۔

یہ ہے کہ خدمت منصبی ملے اور جلد ترقی کرو[1]۔ ایسا کہ سال آیندہ تک صدر الصدور ہو جاؤ۔ اللہ اللہ۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ "مغل"[2] نے تمھارا ذکر مجھ سے کیا تھا اور وہ اشعار جو تم نے اس کے حسن کے وصف میں لکھے تھے، تمھارے ہاتھ کے لکھے ہوئے مجھ کو دکھائے تھے۔ اب یہ ایک زمانہ ہے کہ طرفین سے نامہ و پیام آتے جاتے ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ وہ دن بھی آ جائے گا کہ ہم تم بیٹھیں اور باتیں کریں قلم بے کار ہو جائے، زبان بر سرِ گفتار آئے۔ انشاء اللہ خاں کا قصیدہ بھی میں نے دیکھا ہے، تم نے بہت بڑھ کر لکھا ہے اور اچھا سماں باندھا ہے۔ زبان پاکیزہ، مضامین اچھوتے، معانی نازک، مطالب کا بیان دل نشیں۔ زیادہ کیا لکھوں؟

غالب

(۵)

بندہ پرور،

آپ کا مہربانی نامہ آیا۔ آپ کی مہر انگیز اور محبت خیز باتوں نے غمِ بیکسی بھلایا۔ کہاں دھیان لڑا ہے، کہاں سے "دستنبو" کی مناسبت کے واسطے[3] "یدِ بیضا" ڈھونڈ نکالا ہے۔ آفریں! آفریں! صد ہزار آفریں! تیسرا مصرع اگر یوں ہو تو فقیر کے نزدیک بہت مناسب ہے[4]:

نامۂ خود سالِ خویش داد نشاں

---

[1] میرزا تفتہ نے غدر میں چند انگریزوں کی جان بچائی تھی۔ جس کے صلے میں گراں بہا خلعت اور دو گاؤں جاگیر میں ملے تھے۔ ان فقروں میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

[2] مغل جان طوائف میں سے تھی۔ سُنا ہے کہ گاتی بہت اچھا تھی۔

[3] ظاہرا یہ مطلب ہے کہ میرزا تفتہ نے "دستنبو" کی تاریخ لکھی تھی۔ جس میں "یدِ بیضا" کے الفاظ بھی تھے۔ "دستنبو" اور "یدِ بیضا" کی مناسبت ظاہر ہے۔

مرزا تفتہ کا خط ہاترس سے آیا۔ اُن کے لڑکے بالے اچھے ہیں۔ آپ گھبرائیں نہیں۔ وہ آنے کے آئے۔ اگر تمھیں بدوں اُن کے آرام نہیں تو ان کو بغیر تمھارے چین کہاں؟

صاحب بندہ، اثنا عشری ہوں، ہر مطلب کے خاتمے پر ۱۲ کا ہندسہ کرتا ہوں۔ خدا کرے میرا بھی خاتمہ اسی عقیدے پر ہو ۱۲۔ ہم تم ایک آقا کے غلام ہیں۔ تم جو مجھ سے محبّت کرو گے یا میری غمگساری میں محنت کرو گے، کیا تم کو غیر جانوں جو تمھارا احسان مانوں؟ تم سراپا مہر و وفا ہو۔ واللہ اسم با مسمّےٰ ہو۔

مبالغہ اس کتاب کی تصحیح میں اس واسطے کرتا ہوں کہ عبارت کا ڈھنگ نیا ہے۔ صحیح کا درست پڑھنا بڑی بات ہے، اگر غلط ہو جائے تو پھر وہ عبارت نری خرافات ہے۔ بارے بسبب التفات بھائی منشی نبی بخش صاحب کے سخت الفاظ سے خاطر جمع ہے۔ متوقع ہوں کہ وہ تکلیف سہیں اور ختم کتاب تک متوجہ رہیں۔ منشی شیو نرائن صاحب نے کاپی میرے دیکھنے کو بھیجی تھی۔ سب طرح میرے پسند آئی۔ چنانچہ اُن کو لکھ بھیجا ہے۔ اگر ہو سکے تو سیاہی ذرا اور بھی رنگت کی اچھی ہو ۱۲

حضرت، چار جلدیں یہاں کے حکام کو دوں گا اور دو جلدیں ولایت کو بھیجوں گا۔ اللہ اللہ! کیا غفلت ہے اور کیا اعتماد ہے زندگی پر۔ بہ ہر حال یہ ہوس بھی اور شاید اب بھی ہو کہ اب چھ جلدوں کی کچھ تزئین اور آرائش کی جائے۔ آپ اور بھائی صاحب اور ان کا فرزند رشید منشی عبد اللطیف اور منشی شیو نرائن یہ چاروں صاحب فراہم ہوں اور بہ اجلاس کونسل یہ امر تجویز کیا جائے کہ کیا کیا جائے۔ معہذا دو دو روپے کتاب سے زیادہ مقدور بھی نہیں۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ چار جلدیں چھ روپے میں اور دو جلدیں چھ روپے میں تیار ہوں۔ پھر سوچتا

ہوں کہ یارب آرائش کی گنجایش کہاں۔ ناچار چار کتابوں کی جلد ڈیڑھ ڈیڑھ روپے کی اور دو کتابوں کی جلد تین تین روپے کی بنائی جائے۔ قصّہ مختصر کچھ کیا جائے یا یہی کہہ دیا جائے کہ تیری رائے کونسل[1] میں مقبول اور صرف جلدوں کی تیاری منظور ہوئی۔ بارہ روپے بمع دے ۱۲۔ مطالب اور مقاصد تمام ہوئے اور ہم تم بہ زبانِ قلم باہمدگر ہم کلام ہوئے۔

(۶)

بھائی صاحب،

از روے تحریر مرزا تفتہ آپ کا چھ کتابوں کی تزیین کی طرف متوجہ ہونا معلوم ہوا۔ پھر بھائی منشی نبی بخش صاحب نے دوبارہ لکھا کہ میں باجمال لکھتا ہوں مفصّل مرزا حاتم علی صاحب نے لکھا ہوگا۔ یارب! ان کے دو خط آگئے۔ مرزا صاحب نے اگر لکھا ہوتا تو ان کا خط کیوں نہ آتا۔ اپنے حسنِ اعتقاد سے یوں سمجھا کہ نہ لکھنا بمقتضاے یک دلی ہے۔ جب اپنا کام سمجھ لیے تو مجھ کو لکھنا کیا ضرور ہے؟ مگر اس کو کیا کروں کہ جواب طلب باتوں کا جواب نہیں۔

مطبع اخبار "آفتاب عالمتاب" میں یکم ستمبر ۱۸۵۸ء حال سے حکیم احسن اللہ خاں کا نام لکھوا دینا اور دو نمبروں کا اخبار ایک بار بھجوا دینا اور آیندہ ہر ہفتے اس کے ارسال کا طور ٹھہرا دینا۔ کیوں صاحب یہ امر ایسا کیا دشوار تھا کہ آپ نے نہ کیا؟ اور اگر دشوار تھا تو اس کی اطلاع دینی کیا دشوار تھی؟ ابھی شکایت نہیں کرتا۔ پوچھتا ہوں کہ آیا یہ امور مقتضیِ شکایت ہیں یا نہیں[2]؟ مرزا تفتہ کے ایک خط

---

[1] یعنی میرزا تفتہ، میرزا مہر، منشی نبی بخش حقیر، منشی شیو نرائن آرام کی مجلس شوریٰ۔

[2] شکایت کا کتنا بدیع اسلوب ہے کہ مخاطب سے کہہ رہے ہیں۔ ابھی شکایت نہیں کر رہا، صرف یہ پوچھتا ہوں کہ آیا یہ بات مقتضی شکایت ہے یا نہیں۔

میں یہ قصہ لکھ چکا ہوں۔ کیا انھوں نے بھی وہ خط تم کو نہیں پڑھایا؟ ہر چند عقل دوڑائی، کوئی درنگ کی وجہ خیال میں نہ آئی۔ اب حصول مدعا سے قطع نظر، میں یہ سوچ رہا ہوں کہ دیکھوں چھ مہینے بعد، برس دن بعد، اگر مرزا صاحب خط لکھتے ہیں تو اس امر خاص کا کیا جواب لکھتے ہیں؟ میں بھی شاعر ہوں۔ اگر کوئی مضمون ہوتا تو میرے خیال میں آجاتا۔ کوئی عذر ایسا میرے ذہن میں نہیں آتا کہ قابل سماعت کے ہو۔ میں بھی تو دیکھوں تم کیا لکھتے ہو؟

۲۰ ستمبر ۱۸۵۸ء — غالب

(۷)

مرا بہ سادہ دلیہائے من توان بخشید — خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم

کل، دوشنبہ کا دن، ۲۰ ستمبر کی تھی، صبح کو میں نے آپ کو شکایت نامہ لکھا اور بیرنگ ڈاک میں بھیج دیا۔ دوپہر کو ڈاک کا ہرکارہ آیا، تمھارا خط اور ایک مرزا تفتہ کا خط لایا۔ معلوم ہوا کہ جس خط کا جواب میں آپ سے مانگتا ہوں، وہ نہیں پہنچا۔ کچھ شکوے سے شرمندگی اور کچھ خط کے نہ پہنچنے سے حیرت ہوئی۔ دوپہر ڈھلے مرزا تفتہ کے خط کا جواب لکھ کر ٹکٹ لگانے لگا۔ بکس میں سے وہ تمھارے نام کا خط نکل آیا۔ اب میں سمجھا کہ خط لکھ کر بھول گیا ہوں اور ڈاک میں نہیں بھیجا۔ اپنے نسیان کو لعنت کی اور چپ ہو رہا۔ متوقع ہوں کہ میرا قصور معاف ہو۔ بعد چاہنے عذر جرم کے آپ کے کل کے خط کا جواب لکھتا ہوں۔

سبحان اللہ۔ جلدوں کی آرایش کے باب میں کیا اچھی فکر کی ہے۔ میرے دل میں بھی ایسی ہی ایسی باتیں تھیں۔ یقین ہے کہ متاع شاہوار ہو جائیں گی۔ اہار مہرہ اگر ہو جائے گا تو حرف خوب چمک جائیں گے۔ اس کا خیال ان چار جلدوں میں بھی رہے۔ بارہ روپے کی ہنڈوی پہنچتے ہی روپیہ وصول کر کے مجھ کو

اطلاع دیجیے گا۔ ورنہ میں متشوش ہوں گا۔

حضرت، یہاں دو چیزیں مشہور ہیں۔ ان کے باب میں آپ سے تصدیق چاہتا ہوں: ایک تو یہ کہ لوگ کہتے ہیں کہ آگرے میں اشتہار جاری ہو گیا ہے اور ڈھنڈورا پٹ گیا ہے کہ کمپنی کا ٹھیکہ ٹوٹ گیا اور بادشاہی عمل ہندوستان میں ہو گیا۔ دوسری خبر یہ ہے کہ جناب ایڈمنسٹن صاحب بہادر گورنمنٹ کلکتہ کے چیف سکرٹر اکبرآباد کے لفٹنٹ گورنر ہو گئے۔ خبریں دونوں اچھی ہیں، خدا کرے سچ ہوں اور سچ ہونا اُن کا آپ کے خط لکھنے پر منحصر ہے۔

ہاں صاحب ایک بات اور ہے اور وہ محل غور ہے۔ میں نے حضرت ملکہ معظمہ انگلستان کی مدح میں ایک قصیدہ ان دنوں میں لکھا ہے "در تہنیت فتح اور عملداری شاہی" ساٹھ بیت ہے۔ منظور یہ تھا کہ کتاب کے ساتھ قصیدہ ایک اور کاغذ مذہّب[1] پر لکھ کر بھیجوں۔ پھر یہ خیال آیا کہ دس سطر کے مسطر پر کتاب لکھی گئی ہے یعنی چھاپا ہوئی۔ اگر یہ چھ صفحے، یعنی تین ورق اور چھپ کر اس کتاب کے آغاز میں شامل ہو جائیں تو بات اچھی ہے۔ آپ اور منشی نبی بخش صاحب اور مرزا تفتہ منشی شیونرائن صاحب سے کہہ کر اس کا طور درست کریں اور پھر مجھ کو اطلاع دیں تو میں مسودہ آپ کے پاس بھیج دوں۔ جب کتاب چھپ چکے تو یہ چھپ جائے۔ دو باتیں ہیں ایک تو یہ کہ چھپے بعد کتاب کے، اور لگایا جائے پہلے کتاب سے۔ دوسری یہ کہ اس کی سیاہ قلم کی لوح الگ ہو اور پہلے صفحہ پہ جس طرح کتاب کا نام چھاپتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی چھاپا جائے کہ "قصیدہ در مدح جناب ملکہ انگلستان خلّد اللہ ملکہا" میرا نام کچھ ضرور نہیں۔ کتاب کے صفحے پر تو ہو گا۔ ہنڈوی کی رسید اور

---

[1] سنہری کاغذ۔ اس زمانے میں عام طریقہ یہی تھا کہ بادشاہوں کے قصیدے سنہری یا افشانی کاغذ پر لکھے جاتے تھے۔

اور اس مطلب خاص کا جواب باصواب، یعنی نوید قبول، جلد لکھیے۔ غالب

(۸)

بھائی صاحب،

خدا تم کو دولت و اقبال روز افزوں عطا کرے اور ہم تم ایک جگہ رہا کریں۔ خدا کرے قصیدے کے چھاپے کی منظوری اور ہنڈوی کی رسید آئے۔ گویا صفر کے مہینے میں عید آئے۔ ہنڈوی کا روپیہ جب چاہو منگوالو اور کتابوں کی لوحیں اور جلدیں موافق اپنی رائے کے بنوالو۔

اب آپ دو ورقے کا ڈاک میں بھیجنا موقوف رکھیں اور کتابوں کی درستی پہ ہمت مصروف رکھیں۔ قصیدے کے مسودے کا ورق مرزا تفتہ کے خط میں پہنچ گیا ہوگا۔ آپ نے اور مرزا تفتہ نے اور بھائی منشی نبی بخش صاحب نے قصیدے کو دیکھا ہوگا۔ قصیدے کا شامل کتاب ہونا بہت ضرور ہے۔ یہ دیکھنا چاہیے کہ صاحب مطبع کو کیا منظور ہے۔ اگر وہ کاغذ کی قیمت کا عذر کریں تو ہم پانچ سات روپے سے اور بھی ان کا بھرنا بھریں گے۔

جناب ایڈمنسٹن صاحب بہادر سے میں صورت آشنا نہیں۔ کبھی میں نے ان کو دیکھا بھی نہیں۔ خطوں کی میری اُن کی ملاقات ہے اور نامہ و پیام کی یوں بات ہے کہ جب کوئی نواب گورنر جنرل بہادر نئے آتے ہیں تو میری طرف سے ایک قصیدہ بطریق نذر جاتا ہے۔ بے ذریعہ جناب صاحب ایجنٹ بہادر دہلی اور نواب لفٹنٹ گورنر بہادر آگرہ بھجواتا ہوں اور صاحب سکرٹر بہادر گورنمنٹ کا خط اس کی رسید میں بسبیل ڈاک پاتا ہوں۔ جب لارڈ کیننگ صاحب بہادر نے کرسی گورنری پر جلوس فرمایا تو موافق دستور کے قصیدہ ڈاک بھجوایا۔ ایڈمنسٹن صاحب بہادر چیف سکرٹر کا جو مجھ کو خط آیا تو انھوں نے باوجود عدم سابقہ معرفت میرا القاب بڑھایا۔

قبل ازیں "خاں صاحب بسیار مہربان دوستان" میرا القاب تھا، اس قدرشناس نے ازراہ قدر افزائی "خاں صاحب مشفق بسیار مہربان مخلصان" لکھا۔ اب فرمائیے۔ ان کو کیوں کر اپنا محسن و مربّی نہ جانوں؟ کیا کافر ہوں جو احسان نہ مانوں؟

برخوردار میرزا تفتہ کو دعا کہتا ہوں۔ بھائی اب میں اس کا منتظر رہتا ہوں کہ تم اور میرزا صاحب مجھ کو لکھو کہ لو صاحب "دستنبو" کا چھاپا تمام کیا گیا اور قصیدہ چھاپ کر ابتدا میں لگا دیا گیا۔ مادّۂ تاریخ میں کیا بُرائی ہے جو تمھارے جی میں یہ بات آئی ہے کہ مجھ سے بار بار پوچھتے ہو؟ مادہ اچھا ہے۔ قطعہ لکھو اور خاتمۂ کتاب پر لگا دو۔ ایک قطعہ میرزا صاحب کا، ایک قطعہ تمھارا، یہ دونوں قطعے رہیں اور اگر وہاں کوئی اور صاحب شاعر ہوں تو وہ کہیں۔ اس عبارت سے یہ نہ سمجھنا کہ روئے سخن ساری خدائی کی طرف ہے، بلکہ خاص یہ اشارہ بھائی کی طرف ہے۔ مولانا حقیر کو توجہ اس باب میں چاہیے اور ان کا نام بھی اس کتاب میں چاہیے۔ اس خط کو لکھ کر بند کر چکا تھا کہ ڈاک کا ہرکارہ میرے مشفق، منشی شیو نرائن صاحب کا خط لایا۔ بارے قصیدے کا مسودہ پہنچ گیا اور منشی صاحب نے اس کا چھاپا قبول کیا۔ یہ تشویش بھی رفع ہو گئی۔ اب اُن سے میرا سلام کہیے گا اور یہ کہیے گا:

شکر رافت ہائے تو چندانکہ رافت ہائے تو

اور یہ اُن کو اطلاع دیجیے گا کہ اخبار کا لفافہ ہرگز مجھ کو نہیں پہنچا ورنہ کیا امکان کہ میں رسید نہ لکھتا۔

۲۹ ستمبر ۱۸۵۸ء غالب

(۹)

شفیق بالتحقیق مولانا مہر ذرّۂ بے مقدار کا سلام قبول کریں۔ کل آپ کو ایک خط لکھ چکا ہوں۔ آج یا کل پہنچ جائے گا۔ رات ایک بات اور خیال میں آئی ہے

لیکن چونکہ تحکم وکار فرمائی ہے، کہتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ڈرتے ڈرتے عرض کرتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ دو جلدیں، طلائی لوح کی، ولایت کے واسطے تیار ہوں گی اور وہ چار جلدیں، جو یہاں کے حکام کے واسطے درکار ہوں گی، ان کی صورت یہی ٹھیری ہے کہ سیاہ قلم کی لوح اور انگریزی جلد۔ کیوں بھائی صاحب قرارداد اور تجویز کیسی ہے؟ اور پھر سمجھا چاہیئے کہ یہ چار جلدیں کس کس کی نذر ہیں؟ نواب گورنر جنرل بہادر، چیف کمشنر بہادر، صاحب کمشنر بہادر دہلی۔ ڈپٹی کمشنر بہادر دہلی۔ یہ کیا میری بدوضعی ہے کہ جناب اڈمنسٹن صاحب کی نذر نہ بھیجوں۔ آخر گورنمنٹ کی نذر انھیں کی معرفت بھیجوں گا۔ نہ صاحب ایک جلد ان کی نذر بہت ضروری ہے۔ آپ گنجایش نکال کر جیسی یہ چار جلدیں بنوائیں۔ ایک اور بھی ایسی ہی بنوا لیں۔ یقین ہے کہ آپ اس رائے کو پسند فرمائیں گے اور چار کی جگہ پانچ بنوا لیں گے۔ یہ عرض مقبول اور یہ گستاخی کہ بار بار آزار دیتا ہوں، معاف ہو۔

۳۰ ستمبر ۱۸۵۸ء غالب

(۱۰)

بھائی صاحب،

آپ کے خامۂ مشکبار کی صریر نے کتابوں کی لوح طلائی کا آوازہ یہاں تک پہنچایا، بلکہ مجھ کو ان کی لوحوں کا خط طلائی مانند شعاع آفتاب نظر آیا۔ کیا پوچھنا ہے اور کیا کہنا۔ مجھ کو تو بموجب اس مصرع کے:

خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تست

دل میں خوش ہو کر چپ رہنا ہے۔

۱؎ یہ رقعہ میرزا تفتہ کے رقعے میں ملفوف بھیجا تھا۔ اس لیے اردوے معلیٰ میں خطوط تفتہ میں درج ہو گیا لیکن چونکہ اصل رقعہ میرزا مہر کے نام تھا اس لیے میں نے اسے الگ کر کے خطوط مہر میں شامل کر دیا ہے

حضرت، مدح کو ایک موقع ضرور ہے، مجھ کو آپ کے حکم کا بجالانا ضرور ہے۔ اس نذر کے پہنچنے کے بعد جب کوئی ان کا عنایت نامہ آئے گا تو بندۂ درگاہ مدح گستری کا جوہر دکھائے گا۔ اس نظم میں آپ کا ذکرِ خیر بھی آجائے گا۔ اب یہ تو فرمائیے کہ مدت انتظار کب انجام پائے گی؟ اور کتابوں کی خبر مجھ کو کب آئے گی؟ آپ کی فرطِ توجّہ کا مجھے سب طرح یقین ہے۔ سیاہ قلم کی پانچوں لوحیں بھی اگر بن گئی ہوں تو عجب نہیں ہے۔ جلدوں کا بنانا البتہ چھاپے کے اختتام پر موقوف ہے معلوم تو ہوتا ہے کہ بھائی نبی بخش صاحب اور ہمارے شفیق منشی شیو نرائن صاحب کی ہمت اس کے جلد انجام ہونے پر مصروف ہے۔ یارب اسی اکتوبر کے مہینے میں یہ کام انجام پا جائے اور چالیس جلدوں کا پشتارہ میرے پاس آجائے۔

میرزا تفتہ کو کیا دوں اور کیا لکھوں؟ مگر دعا دوں اور دعا لکھوں۔ صاحب، اب ڈھیل نہ کرو کام میں تعجیل کرو:

اے ز فرصت بے خبر در ہر چہ باشی زود باش

خدا کرے نثر کی تحریر انجام پا گئی ہو اور قصیدے کے چھاپنے کی نوبت آگئی ہو۔ قصیدے کا نثر سے پہلے لگانا، از راہ اکرام و اعزاز ہے۔ ورنہ نثر میں اور صنعت اور نظم کا اور انداز ہے۔ یہ اس کا دیباچہ کیوں ہو؟ بلکہ صورت ان دونوں کے اجماع کی یوں ہو کہ سر رشتۂ آمیزش توڑ دیا جائے اور قصیدے کے اور "دستنبو" کے بیچ میں ایک ورق سادہ چھوڑ دیا جائے۔

راے امید سنگھ کا کوئی خط اگر اندور سے آیا ہو تو مجھ کو بھی آگہی دو۔ جاہو تمہیں ابتدا کرو اور ایک خط اُن کو لکھو اور اس کا پرداز اس بات پر رکھو کہ اب وہ کتابیں تیار ہونے کو آئی ہیں۔ آپ کی خدمت میں کہاں بھیجی جائیں اور کیا پتہ لکھا

جائے؟ یہ خط جواب طلب ہو جائے گا اور ان کو جواب لکھنا پڑے گا۔

غالب (اکتوبر ۱۸۵۹ء)

(۱۱)

مرزا صاحب،

میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بہ زبان قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔ کیا تم نے مجھ سے بات کرنے کی قسم کھائی ہے؟ اتنا تو کہو کہ کیا بات تمہارے جی میں آئی ہے؟ برسوں ہو گئے کہ تمہارا خط نہیں آیا۔ نہ اپنی خیر و عافیت لکھی، نہ کتابوں کا بیورا[1] بھجوایا۔

مرزا تفتہ نے ہاترس سے یہ خبر دی کہ پانچ ورق پانچوں کتابوں کے آغاز کے اُن کو دے آیا ہوں اور انھوں نے سیاہ قلم کی لوحوں کی تیاری کی ہے۔ یہ تو بہت دن ہوئے جو تم نے مجھ کو خبر دی ہے کہ دو کتابوں کی طلائی لوح مرتب ہو گئی ہے پھر اب کتابوں کی جلدیں بن جانے کی کیا خبر ہے اور ان پانچوں کتابوں کے تیار ہونے میں درنگ کس قدر ہے؟ مہتمم مطبع کا خط پرسوں آیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ تمہاری چالیس کتابیں بعد لینے منہائی سات جلدوں کے اسی ہفتے میں تمہارے پاس پہنچ جائیں گی۔ اب حضرت ارشاد کریں کہ سات جلدیں کب آئیں گی؟ ہر چند کاریگروں کے دیر لگانے سے تم بھی مجبور ہو، مگر ایسا کچھ لکھو کہ آنکھوں کی نگرانی اور دل کی پریشانی دور ہو۔ خدا کرے تینتیس جلدوں کے ساتھ یا دو تین روز کے آگے پیچھے یہ سات جلدیں آپ کی عنایتی بھی آئیں، تا خاص و عام جا بجا بھیجی جائیں۔ میرا کلام میرے پاس کبھی کچھ نہیں رہا۔ نواب ضیاء الدین خاں اور نواب حسین مرزا جمع کر لیتے تھے جو میں نے کہا انھوں نے لکھ لیا۔ ان دونوں کے گھر لٹ گئے۔ ہزاروں روپے کے کتب خانے برباد ہو گئے۔ اب میں اپنے کلام کے دیکھنے کو ترستا ہوں۔ کئی دن ہوئے کہ ایک

[1] خبر، پیغام

فقیر کہ وہ خوش آواز بھی ہے اور زمزمہ پرداز بھی، ایک غزل میری کہیں سے لکھوا لایا۔ اُس نے جو وہ کاغذ مجھ کو دکھایا، یقین سمجھنا کہ مجھ کو رونا آیا۔ غزل تم کو بھیجتا ہوں اور صلہ میں اس خط کا جواب چاہتا ہوں۔

غزل

درد منت کشِ دوا نہ ہُوا — میں نہ اچھا ہُوا، بُرا نہ ہُوا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو؟ — اک تماشا ہوا، گلہ نہ ہُوا

رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے؟ — لے کے دل، دلستاں روانہ ہُوا

زخم گر دب گیا، لہو نہ تھما — کام گر رُک گیا، روا نہ ہُوا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب — گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہُوا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟ — بندگی میں مرا بھلا نہ ہُوا

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی — حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہُوا

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں — آج غالبؔ غزل سرا نہ ہُوا

(۱۲)

بھائی صاحب،

مطبع میں سے سادہ کتابیں، یقین ہے کہ آج کل پہنچ جائیں اور پس و پیش سات جلدیں آپ کی بنوائی ہوئی آئیں۔ بالفعل ایک اور عقدہ سر رشتۂ خیال میں پڑا ہے۔ یعنی از روئے اخبار "مفید خلائق" ذہن لڑا ہے کہ اس ہفتے میں جناب ایڈمنسٹن صاحب بہادر آگرے آئیں گے اور وسا ذہ لفٹنٹ گورنری پر اجلاس فرمائیں گے۔ اِس صورت میں اغلب ہے کہ ولیم میور صاحب بہادر اُن کی جگہ چیف سکتہ ٹرین جائیں گے۔ پھر دیکھیے کہ یہ محکمہ لفٹنٹ گورنری میں اپنا سکتہ ٹرکس کو بنائیں گے میر منشی اس محکمہ کے تو وہی منشی غلام غوث خان بہادر رہیں گے۔ دیکھیے ہمارے

منشی مولوی قمرالدین خاں کہاں رہیں گے۔ بہ ہر حال آپ سے یہ استدعا ہے کہ پہلے کتابوں کا احوال لکھیے اور پھر جُدا جُدا جواب ہر سوال لکھیے[1]۔ جب تک ایڈمنسٹن صاحب بہادر چیف سکرٹر تھے تو یہ خیال میں تھا کہ اُن کی نذر اور نواب گورنر جنرل بہادر کی نذر یعنی دو کتابیں مع اپنے خط کے اُن کے پاس بھیجوں گا۔ اب حیران ہوں کہ کیا کروں۔ آیا اُن کی جگہ سکرٹر کون ہوا؟ اور یہ جو لفٹنٹ گورنر ہوئے، تو انھوں نے سکرٹر کس کو کیا؟ میر منشی لفٹنٹ گورنر کون رہا اور گورنر جنرل کا منشی کون ہے؟ جو آپ کو معلوم ہو، وہ، اور جو نہ معلوم ہو وہ دریافت کر کے لکھیے۔ قمرالدین خاں کا حال ضرور، منشی غلام غوث خاں کا حال پُر ضرور۔ بھائی، میرے سر کی قسم، اس خط کا جواب ضرور لکھنا اور ایسا واضح لکھنا کہ مجھ سا کند ذہن اچھی طرح اس کو سمجھ لے۔ زیادہ کیا لکھوں

غالب

(۱۳)

بھائی صاحب،

۳۲ کتابیں، بھیجی ہوئی برخوردار منشی شیو نرائن کی، کل جمعہ کے دن ۱۲ نومبر کو پہنچیں۔ کاغذ اور سیاہی اور خط کا حسن دیکھ کر میں نے از روے یقین جانا کہ طلائی کام پر یہ کتابیں طاؤس بہشت بن جائیں گی، حوریں ان کو دیکھ کر شرمائیں گی۔ یہ تو سب درست، مگر دیکھیے مجھ کو ان کا دیکھنا کب تک میسّر ہو؟ آپ پر گمان تساہل کا گزرے، یہ تو کیونکر ہو؟ ہاں صحّاف جلد کے بنانے کی نسبت سے حق کا جلّاد نہ بن جائے۔ یعنی مدّت مناسب سے زیادہ دیر نہ لگائے۔

---

[1] یہاں جامعین مکاتیب نے "جواب ہر سوال کا لکھیے" بنا دیا حالانکہ "کا" غالب نے یقیناً نہیں کہا ہوگا۔ انھوں نے "احوال لکھیے" کے مقابل میں جواب ہر سوال لکھیے" رقم کیا ہوگا اور یہی صحیح ہے "کا" بڑھا دینے سے تحریر کا طبعی حسن زائل ہو جاتا ہے۔

اور ہاں حضرت، کچھ ایسی پختگی ارسال کے وقت کیجیے گا کہ وہ پارسل آشوب تلف سے محفوظ رہے۔ بہت عزیز اور بہت کام کی چیز ہے۔ مجھ کو وہ ایک ایک مجلد اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ یا الٰہی، یہ خط راہ میں ہو اور وہ ساتوں کتابوں کا پارسل تیرے حفظ و امان میں مجھ تک پہنچ جائے اور یہ نہ ہو تو بھلا یہ ہو کہ اس خط کا جواب لکھیے۔ اس میں یہ مرقوم ہو کہ آج ہم نے کتابوں کا پارسل روانہ کیا ہے؛

یا رب ایں آرزوے من چہ خوش است
تو بدیں آرزو مرا برساں

مرسلہ شنبہ، ۱۳ر نومبر ۱۸۵۸ء[1]

(۱۴)

بھائی جان،

کل جو جمعہ، روز مبارک و سعید تھا، گویا میرے حق میں روز عید تھا۔ چار گھڑی دن رہے نامہ فرحت فرجام اور چار گھڑی کے بعد، وقت شام:

سات جلدوں کا پارسل پہنچا واہ کیا خوب، برمحل پہنچا

آدمی کو موافق اس کی تمنا کے آرزو بر آنی بہت محال ہے، میری آرزو ایسی بر آئی کہ وہ برتر از وہم و خیال ہے۔ یہ بناؤ تو میرے تصور میں بھی نہیں گزرتا تھا۔ میں صرف اس قدر خیال کرتا تھا کہ جلدیں بندھی ہوئی، دو کی لوحیں زریں اور پانچ کی لوحیں سیاہ قلم کی ہوں گی۔ واللہ! اگر تصور میں بھی گزرتا ہو کہ کتابیں اس رقم کی

---

[1] یہ خط بھی تہر کے نام تھا۔ اگرچہ میرزا تفتہ کے خط میں ملفوف بھیجا گیا تھا۔ لیکن جامعین مکاتیب نے اسے میرزا تفتہ کے خطوں میں شامل کر دیا۔ حالانکہ ۱۳۔ نومبر کو تفتہ کو جو خط بھیجا گیا تھا وہ الگ تھا اور اس میں ۲۳ کتابوں کی رسید ہے نیز اس امید کا اظہار کہ میرزا حاتم علی مہر والی کتابیں بھی جلد پہنچ جائیں گی۔ تعجب ہے کہ منشی مہیش پرشاد صاحب بھی جامعین مکاتیب کی اس غلطی کو نہ سمجھ سکے۔

ہوں گی۔ جب تک جہان ہے، تم جہان میں رہو۔ ائمہ اطہار علیہم السلام کی امان میں رہو۔ میرا مقصود یہ تھا کہ ایک کتاب مثل اُن چار کے بن جائے نہ یہ کہ دو کتابوں کا سا رنگ دکھلائے۔ اب میں حیران ہوں کہ آیا شمار ائمہ نے ان بارہ روپیوں میں برکت دی یا کچھ تمہارا روپیہ صرف ہوا۔ دو پارسلوں کا محصول، دو رجسٹریوں کا معمول، تین کتابوں کی لوحیں طلائی یہ ساری بات اس روپے میں کیونکر بن آئی؟ اور کیونکر معلوم کروں؟ کس سے پوچھوں؟ خدا کے لیے تم تکلف نہ کرو اور اس امر کے اظہار میں توقف نہ کرو۔ خفقانی آدمی کو بغیر حال معلوم (ہوئے یا کیے) آرام نہیں آتا۔ جہاں محبتیں دینی اور روحانی ہوں، وہاں تکلف نہیں آتا۔ زیادہ اس سے کہ شکر گزار ہوں اور شرمسار ہوں، کیا لکھوں؟

چارہ خاموشی است چیزے را کہ از تحسیں گزشت

(۱۵)

بندہ پرور،

آپ کا خط کل پہنچا، آج جواب لکھتا ہوں۔ واد دینا کتنا شتاب لکھتا ہوں۔ مطالب مندرجہ کے جواب کا بھی وقت آتا ہے۔ پہلے تم سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ برابر کئی خطوں میں تم کو غم و اندوہ کا شکوہ گزارا پایا ہے، پس اگر کسی بے درد پہ دل آیا ہے، تو شکایت کی کیا گنجایش ہے؟ بلکہ یہ غم تو نصیب دوستاں در خور افزایش ہے۔ بقول غالب علیہ الرحمۃ:

کسی کو دے کے دل، کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی پہلو میں، تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

ہے ہے حسنِ مطلع:

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوُا تو دوست جس کا دشمن اس کا آسماں کیوں[۱] ہو؟

افسوس ہے کہ اس غزل کے اور اشعار یاد نہ آئے۔

اگر خدانخواستہ باشد غمِ دُنیا ہے تو بھائی ہمارے ہم درد ہو۔ ہم اس بوجھ کو مردانہ وار اُٹھا رہے ہیں، تم بھی اُٹھاؤ اگر مرد ہو۔ بقول غالب مرحوم:

دلا یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر — نہ گریۂ سحری ہے، نہ آہ نیم شبی ہے

"سحر ہو گی" "خبر ہو گی" اس زمین میں وہ شعر یعنی

تمھارے واسطے دل سے مکاں کوئی نہیں بہتر
جو آنکھوں میں تمھیں رکھوں تو ڈرتا ہوں نظر ہو گی

کتنا خوب ہے اور اُردو کا کیا اسلوب ہے۔ قصیدے کا مشتاق ہوں، خدا کرے کہ جلد چھاپا جائے تو ہمارے دیکھنے میں بھی آ جائے "کیا کہیے" "بھلا کہیے" "یہ زمین ایک بار یہاں طرح ہوئی تھی مگر بحر اور ہی تھی۔

کہوں جو حال، تو کہتے ہو مدعا کہیے — تمھیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہیے
رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجے — کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے
سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالبؔ — خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

اور جو "فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن" یہ بحر ہے اس میں میرا ایک قطعہ ہے کہ وہ میں نے کلکتہ میں کہا تھا۔ تقریب یہ کہ مولوی کرم حسین[۲] ایک میرے دوست تھے، انھوں نے مجلس میں ایک چکنی ڈلی بہت پاکیزہ اور بے ریشہ اپنے کف دست

---

[۱] مروجہ دیوان میں ہے: ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو؟

[۲] مولوی کرم حسین بلگرامی شاہ اودھ کی طرف سے کلکتہ میں سفیر تھے۔ شمس العلما سید علی بلگرامی اور نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی کرم حسین کے پوتے تھے۔

پہ رکھ کر مجھ سے کہا کہ اس کی کچھ تشبیہات نظم کیجیے۔ میں نے وہاں بیٹھے بیٹھے نو دس شعر کا قطعہ لکھ کر ان کو دیا اور صلے میں وہ ڈلی اُن سے لی۔ اب سوچ رہا ہوں، جو شعر یاد آتے جاتے ہیں لکھتا جاتا ہوں:

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ چکنی ڈلی — زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے
خامہ انگشت بہ دنداں کہ اسے کیا لکھیے — ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے
اخترِ سوختہ قیس سے نسبت دیجیے — خالِ مشکینِ رخِ دلکشِ لیلیٰ کہیے
حجر الاسودِ دیوارِ حرم کیجیے فرض — نافہ آہوئے بیابانِ ختن کا کہیے
صومعے میں اسے ٹھہرائیے گر مُہرِ نماز — میکدے میں اسے خشتِ خمِ صہبا کہیے
مسی آلودہ سرِ انگشتِ حسیناں لکھیے — سرِ پستانِ پری زاد سے مانا کہیے[1]

غرضکہ بیس بائیس پھبتیاں ہیں۔ اشعار سب کب یاد آتے ہیں۔ اخیر کی بیت یہ ہے:

اپنے حضرت کے کفِ دست کو دل کیجیے فرض
اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیے

---

[1] یہ شعر اصل میں یوں ہے:

مسی آلودہ سرِ انگشتِ حسیناں لکھیے — داغِ طرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہیے
خاتمِ دستِ سلیماں کے مشابہ لکھیے — سرِ پستانِ پریزاد سے مانا کہیے

اس کے باقی اشعار یہ ہیں

مہرِ مکتوبِ عزیزانِ گرامی لکھیے — حرزِ بازوئے شگرفانِ خود آرا کہیے
وضع میں اس کو اگر سمجھیے قافِ تریاق — رنگ میں سبزۂ نوخیزِ مسیحا کہیے
کیوں اسے قفلِ درِ گنجِ محبت لکھیے — کیوں اسے نقطۂ پرکارِ تمنا کہیے
کیوں اسے گوہرِ نایاب تصور کیجیے — کیوں اسے مردمکِ دیدۂ عنقا کہیے
کیوں اسے تکمۂ پیراہنِ لیلیٰ لکھیے — کیوں اسے نقشِ پئے ناقۂ لیلیٰ کہیے

لو حضرت آپ کے خط کے جواب نے انجام پایا۔ اب میرا درد دِل سنو۔ برخوردار منشی شیو نرائن نے میرے دو خطوں کا جواب نہیں لکھا اور وہ خطوط جواب طلب تھے۔ تم ان کو میری دُعا کہو اور کہو کہ میاں میرا کام بند ہے۔ اس مطلب خاص کا جواب جلد لکھو۔ یعنی اگر وہ کتاب بن چکی ہے تو جلد بھیجو اور اگر اس کے بھیجنے میں دیر ہے، تو یہ لکھ بھیجو کہ وہ سیاہ قلم کی لوح کی ہے یا طلائی۔

(۱۶)

خدا کا شکر بجا لاتا ہوں کہ آپ کو اپنی طرف متوجہ پاتا ہوں۔ میرزا تفتہ کا خط جو آپ نے نقل کر کے بھیج دیا ہے، میں نے منشی شیو نرائن کو بھیجا ہوا اصل خط دیکھ لیا ہے۔ اگر تم مناسب جانو تو ایک بات میری مانو۔ "رقعات عالمگیری" یا "انشاء خلیفہ" اپنے سامنے رکھ لیا کرو، جو عبارت اس میں سے پسند آیا کرے، اپنے خط میں لکھ دیا کرو۔ خط مفت میں تمام ہو جایا کرے گا اور تمھارے خط کے آنے کا نام ہو جایا کرے گا۔ اگر کبھی کوئی قصیدہ کہا، اس کا دیکھنا مشاہدۂ اخبار پر موقوف رہا:

برات عاشقاں بر شاخ آہو

واقعی جو اخبار آگرے سے دلّی آتے ہیں وہ میرے سامنے پڑھے جاتے ہیں۔ صاحب، ہوش میں آؤ اور مجھ کو بتاؤ کہ یہاں جو پارسیوں کی دکانوں میں "فرنچ" اور "شام پین" کے درجن دھرے ہوئے ہیں یا ساہوکاروں اور جوہریوں کے گھر روپے اور جواہر سے بھرے ہوئے ہیں، میں کہاں وہ شراب پینے جاؤں گا اور وہ مال کیوں کر اُٹھاؤں گا؟ بس اب زیادہ باتیں نہ بنایئے اور وہ قصیدہ مجھ کو بھجوایئے۔ میں نے کتابیں جا بجا بسبیل پارسل ارسال کی ہیں۔ اگرچہ پہنچنے کی خبر پائی ہے، مگر نوید قبول ابھی کہیں سے نہیں آئی ہے:

رات دن گردش میں ہیں سات آسمان ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

دیکھنا بھائی اس غزل کا مطلع کیسا ہے :

جور سے باز آئیں پر باز آئیں کیا	کہتے ہیں ہم تجھ کو مُنہ دکھلائیں کیا
موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے	آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا
لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ	جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا
پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے	کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

غزل ناتمام ہے[1]

ہے بسکہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور	کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور
تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم، جب اٹھیں گے	لے آئیں گے بازار سے جاکر دل و جاں اور
لوگوں کو ہے خورشید جہاں تاب کا دھوکا	ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور
ابرو سے ہے کیا اس نگہ ناز کو پیوند	ہے تیر مقرر، مگر اس کی ہے کماں اور
یا رب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات	دے اور دل اُن کو، جو نہ دے مجھ کو زباں اور
ہر چند سبک دست ہوں بُت شکنی میں	ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگ گراں اور
پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے	رُکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور
مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اُڑ جائے	جلّاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور
ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے	کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور[2]

---

[1] اس کے باقی شعر یہ ہیں :

ہو لیے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ	یا رب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا
عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ	مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

[2] اس میں سے دو شعر چھوڑے ہیں :

ہے خون جگر جوش میں دل کھول کے روتا	ہوتے جو کئی دیدۂ خونابہ فشاں اور
لیتا، نہ اگر دل تمھیں دیتا، کوئی دم چین	کرتا، جو نہ مرتا کوئی دن، آہ و فغاں اور

دوشنبہ کا دن ۲۰ دسمبر کی صبح کا وقت ہے، انگیٹھی رکھی ہوئی ہے۔ آگ تاپ رہا ہوں اور خط لکھ رہا ہوں۔ یہ اشعار یاد آ گئے تم کو لکھ بھیجے۔ والسلام

۲۰ دسمبر ۱۸۵۸ء

(۱۷)

شرطِ اسلام بود ورزشِ ایمان بالغیب ... اے تو غائب ز نظر، مہر تو ایمانِ من است

حلیہ مبارک نظر افروز ہوا۔ جانتے ہو کہ میرزا یوسف علی خاں عزیز نے جو کچھ تم سے کہا، اس کا منشا کیا ہے؟ کبھی میں نے بزمِ احباب میں کہا ہوگا کہ مرزا حاتم علی کے دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ سنتا ہوں کہ وہ طرحدار آدمی ہیں اور بھائی تمھاری طرحداری کا ذکر میں نے "مغل جان" سے سنا تھا، جس زمانے میں کہ وہ نواب حامد علی خاں کے نوکر تھی اور اس میں مجھ میں بے تکلفانہ ربط تھا تو اکثر "مغل" سے پہروں اختلاط ہوا کرتے تھے۔ اُس نے تمھارے شعر اپنی تعریف کے بھی مجھ کو دکھائے ہیں۔

بہرحال تمھارا حلیہ دیکھ کر تمھارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا، کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔ تمھارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا، کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چنپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستایش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھ کو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے۔ ہاں، مجھ کو رشک آیا اور میں نے خونِ جگر کھایا تو اس بات پر کہ داڑھی خوب گھٹی ہوئی ہے۔ وہ مزے یاد آ گئے۔ کیا کہوں جی پر کیا گزری۔ بقول شیخ علی حزیں:

تا دسترسم بود، زدم چاک گریباں ... شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

جب داڑھی مونچھ میں بال سفید آ گئے، تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔

ناچار مسی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی۔ مگر یہ یاد رکھیے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام، ملّا، حافظ، بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقّہ، بھٹیارہ، جولاہا، کنجڑہ، منہ پر داڑھی، سر پہ بال، فقیر نے جس دن داڑھی رکھی۔ اسی دن سر منڈوایا۔ لاحول ولاقوۃ الّا باللہ العلی العظیم۔ کیا بک رہا ہوں۔

صاحب، بندہ نے "دستنبو" جناب اشرف الامرا جارج فریڈرک ایڈمنسٹن صاحب بہادر لفٹننٹ گورنر بہادر غرب وشمال کی نذر بھیجی تھی، سو ان کا فارسی خط محررہ دہم مارچ مشتمل بر تحسین و آفرین و اظہار خوشنودی بطریق ڈاک آگیا۔ پھر میں نے تہنیت میں لفٹننٹ گورنری کے قصیدہ فارسی بھیجا۔ اس کی رسید میں نظم کی تعریف اور اپنی رضامندی پر متضمن خط فارسی بسبیل ڈاک مرقومہ چہاردہم آگیا۔ پھر ایک قصیدہ فارسی مدح و تہنیت میں جناب رابرٹ منٹگمری صاحب بہادر لفٹننٹ گورنر بہادر پنجاب کی خدمت میں بواسطہ صاحب کمشنر بہادر دہلی بھیجا تھا۔ کل ان کا مہری خط بذریعہ صاحب کمشنر بہادر دہلی آگیا۔ پنشن کے باب میں ابھی کچھ حکم نہیں ہوا۔ اسباب توقع فراہم ہوتے جاتے ہیں۔ دبہ آید درست آید۔ اناج کھاتا ہی نہیں ہوں۔ آدھ سیر گوشت دن کو اور پاؤ بھر شراب رات کو مل جاتی ہے:

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے — تمھیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

اگر ہم فقیر سچے ہیں اور اس غزل کے طالب کا ذوق سچا ہے تو یہ غزل اس خط سے پہلے پہنچ گئی ہوگی۔ رہا سلام، وہ اب پہنچا دیں گے۔

مارچ یا اپریل ۱۸۵۹ء

(۱۸)

جناب مرزا صاحب،

دلی کا حال تو یہ ہے:

گھر میں تھا کیا جو ترا غم اسے غارت کرتا وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

یہاں دھرا کیا ہے جو کوئی لوٹے گا۔ وہ خبر محض غلط ہے۔ اگر کچھ ہے تو بدیں نمط ہے کہ چند روز گوروں نے اہل بازار کو ستایا تھا۔ اہل قلم اور اہل فوج[۱] نے بہ اتفاق رائے ہمدگر ایسا بندوبست کیا کہ وہ فساد مٹ گیا۔ اب امن و امان ہے ناسخ[۲] مرحوم جو تمہارے استاد تھے، میرے بھی دوست صادق الوداد تھے، مگر یک فنے تھے۔ صرف غزل کہتے تھے۔ قصیدے اور مثنوی سے ان کو کچھ علاقہ نہ تھا۔ سبحان اللہ۔ تم نے قصیدے میں وہ رنگ دکھایا کہ انشاؔ[۳] کو رشک آیا مثنوی کے اشعار جو میں نے دیکھے، کیا کہوں کیا حظ اُٹھایا:

خدا سے میں بھی چاہوں ازرہِ مہر فروغ "میرزا حاتم علی مہرؔ"

اگر اسی انداز پہ انجام پائے گی تو یہ مثنوی کارنامۂ اُردو کہلائے گی۔ خدا تم کو جیتا رکھے۔ تمہارا دم غنیمت ہے۔ صاحب میں تم سے پوچھتا ہوں کہ "معیار الشعرا"

---

[۱] سول اور ملٹری۔

[۲] شیخ امام بخش ناسخ اُردو کے مشہور شاعر تھے۔ ۱۲۵۴ھ (۱۸۳۸ء) میں وفات پائی کہتے ہیں کہ اصل میں پنجابی تھے۔ لکھنؤ میں تربیت پائی اور وہیں ساری عمر گذار دی۔

[۳] سید انشا اللہ خاں انشاء ابن حکیم ماشا اللہ خاں۔ ماشا اللہ خان علی وردی خان کے زمانے میں بعض اہم خدمات پر مامور رہے۔ پھر دہلی آگئے تھے۔ انشاء کی زندگی کا ابتدائی دور دہلی میں گذرا۔ پھر لکھنؤ چلے گئے اور وہاں بڑا نام پایا۔

ہیں تم نے اپنا خط کیوں چھپوایا؟ تمہارے ہاتھ کیا آیا؟ سُنو تو سہی اگر سب کا کلام اچھا ہو، تو امتیاز کیا ہے؟

(۱۹)

میرزا صاحب !¹

آپ کا غم فزا نامہ پہنچا۔ میں نے پڑھا۔ یوسف علی خاں عزیز کو پڑھوا دیا۔ انھوں نے جو میرے سامنے اس مرحومہ کا اور آپ کا معاملہ بیان کیا۔ یعنی اس کی اطاعت اور تمہاری اس سے محبت، سخت ملال ہوا اور رنج کمال ہوا۔ سنو صاحب شعرا میں فردوسی اور فقرا میں حسن بصری اور عشاق میں مجنون یہ تین آدمی تین فن میں سر دفتر اور پیشوا ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے، فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھائے، عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنون کی ہم طرحی نصیب ہو۔ لیلےٰ اس کے سامنے مری تھی۔ تمہاری محبوبہ تمہارے سامنے مری، بلکہ تم اس سے بڑھ کر ہوئے کہ لیلےٰ اپنے گھر میں اور تمہاری معشوقہ تمہارے گھر میں مری۔ بھئی "مغل بچے" بھی غضب ہوتے ہیں، جس پر مرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی "مغل بچہ" ہوں۔ عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ خدا اِن دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی کہ زخمِ مرگِ دوست کھائے ہوئے ہیں، مغفرت کرے۔ چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے باآنکہ یہ کوچہ چھٹ گیا، اس فن سے میں بیگانۂ محض ہو گیا ہوں، لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا۔ جانتا ہوں کہ تمہارے دل پہ کیا گزرتی ہوگی۔ صبر کرو اور اب ہنگامہ عشقِ مجازی چھوڑ دو

سعدی اگر عاشقی کنی و جوانی　　عشقِ محمدؐ بس است و آلِ محمدؐ

اللہ بس ماسویٰ ہوس

غالب

¹ میرزا مہر نے اپنی محبوبہ "چنا جان" کی وفات پہ جو خط بھیجا تھا، اُسے "غم فزا نامہ" کہا

(۲۰)

مرزا صاحب،

ہم کو یہ باتیں پسند نہیں پینسٹھ برس کی عمر ہے، پچاس برس عالمِ رنگ و بو کی سیر کی۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشدِ کامل نے ہم کو یہ نصیحت کی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں، ہم مانعِ فسق و فجور نہیں۔ پیو، کھاؤ، مزے اڑاؤ، مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو[۱]۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک افشانی، کہاں کی مرثیہ خوانی۔ آزادی کا شکر بجا لاؤ۔ غم نہ کھاؤ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو "چنا جان" نہ سہی، "منا جان" سہی۔ میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی، اقامتِ جاودانی ہے اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے۔ اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی، طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی۔ وہی زمردین کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ، چشمِ بددور، وہی ایک حور۔ بھائی، ہوش میں آؤ کہیں اور دل لگاؤ:

زنِ نو کن اے دوست در ہر بہار　　که تقویمِ پارینه ناید بکار

میر اظہر کے اشعار کی تضمین کا مسدس دیکھا۔ نکہ سراپا پسند، ذکر ہمہ جہت ناپسند۔ اپنے نام کا خط مع ان اشعار کے مرزا یوسف علی خاں عزیز کے حوالے کیا۔

مکرمی نواب محمد علی خاں صاحب کی خدمت میں سلام۔ پروردگار ان کو

---

[۱] شہد کی مکھی پھنس کر نکل نہیں سکتی۔ مصری کی مکھی جب چاہے اڑ جاتی ہے۔ مطلب یہ کہ ایسا تعلق پیدا نہ کرو کہ اس میں الجھ کر رہ جاؤ۔

سلامت رکھے۔

مولوی عبدالوہاب صاحب کو میرا سلام۔ دم دے کے مجھ کو فارسی عبارت میں خط لکھوایا، میں منتظر رہا کہ آپ لکھنؤ جائیں گے۔ وہ عبارت جناب قبلہ و کعبہ کو دکھائیں گے۔ اُن کے مزاج اقدس کی خیر و عافیت مجھ کو رقم فرمائیں گے۔ کیا جانوں کہ حضرت میرے وطن میں جلوہ افروز ہیں:

یار در خانہ و من گرد جہاں مے گردم

اب مجھے اُن سے یہ استدعا ہے کہ دستخط خاص سے مجھ کو خط لکھیں اور لکھنؤ نہ جانے کا سبب اور جناب قبلہ و کعبہ کا حال جو کچھ معلوم ہو، وہ سب اس خط میں درج کریں۔

غالب

منشی شیو نرائن آرام

منشی شیو نرائن آرام آگرے کے ایک ممتاز ہندو گھرانے کے فرد تھے۔ اُن کے پردادا غالب کے نانا خواجہ غلام حسین خاں کے ساتھیوں اور حلقہ نشینوں نیز متوسلوں میں تھے۔ ان کے دادا منشی بنسی دھر غالب کے عزیز دوست اور خواجہ غلام حسین خاں کے کارندے تھے۔ اُن کے والد منشی نند لال بھی بارسوخ آدمی تھے۔ ان خطوں میں بھی دو تین جگہ ان کا ذکر آیا ہے۔

منشی شیو نرائن نے زمانے کے رواج کے مطابق اُردو اور فارسی کی تعلیم پائی۔ انگریزی بھی پڑھی اور خاصی استعداد پیدا کر لی۔ بلکہ مرزا غالب کو لکھا تھا کہ کوئی خط یا عرضی انگریزی میں لکھوانی ہو تو مجھ سے لکھوا لیا کیجیے۔ گارساں دتاسی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دہلی کالج میں پڑھتے تھے اور وہاں پروفیسر بھی رہے تھے۔

"مفید خلائق" کے نام سے آگرے میں ایک مطبع جاری کیا تھا، جہاں "دستنبو" پہلی مرتبہ چھپی۔ اصل میں "مفید خلائق" ایک اخبار کا نام تھا جو گارساں دی تاسی کے بیان کے مطابق شیو نرائن صاحب نکالتے تھے۔ مطبع کا بھی یہی نام رکھا۔ "آفتاب عالمتاب"، "معیار الشعرا"، "بغاوت ہند" وغیرہ اخبار بھی نکالتے تھے۔ "خمخانہ جاوید" میں ہے کہ تمام عمر عہدہ ہائے جلیلہ پر ممتاز رہے۔ لیکن ان کی نوعیت معلوم نہ ہو سکی۔ "ادبی خطوط غالب" میں ہے کہ آگرہ میونسپل کمیٹی کے سکرٹری بن گئے تھے۔ ۱۸۹۴ء میں چونسٹھ برس کی عمر میں فوت ہوئے۔ ان کے دو فرزند تھے۔ دونوں ڈپٹی کلکٹر بن گئے

غالب کے ساتھ ان کا تعلق "دستنبو" کی اشاعت کے سلسلے میں پیدا ہوا۔ ۱۸۵۸ء سے ۱۸۶۰ء تک خاصی خط و کتابت رہی۔ پھر یہ سلسلہ گھٹتے گھٹتے مئی ۱۸۶۳ء پر ختم ہو گیا۔ اس کے بعد اگر کوئی خط لکھا گیا تو وہ نہیں ملا۔

منشی شیونرائن صاحب آرام[1]

(۱)

صاحب، خط پہنچا - لفافوں کی خبر پہنچی - آپ نے کیوں تکلیف کی؟ لفافے بنانا دل کا بہلانا ہے - بیکار آدمی کیا کرے؟ بہ ہر حال جب لفافے پہنچ جائیں گے، ہم آپ کا شکر بجا لائیں گے:

ہر چہ از دوست می رسد نیکوست

یہاں آدمی کہاں ہے کہ اخبار کا خریدار ہو؟ مہاجن لوگ جو یہاں بستے ہیں - وہ یہ ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ گیہوں کہاں سستے ہیں - بہت سخی ہوں گے تو جنس پوری تول دیں گے - کاغذ روپیہ مہینے کا کیوں مول لیں گے؟[2]

کل آپ کا خط آیا - رات بھر میں نے فکرِ شعر میں خونِ جگر کھایا - ۲۱ شعروں کا قصیدہ کہہ کر تمہارا حکم بجا لایا[3] - میرے دوست خصوصاً میرزا تفتہ[4] جانتے ہیں کہ میں فنِ تاریخ کو نہیں جانتا - اس قصیدہ میں ایک روش خاص سے اظہار ۱۸۵۸ء کا کر دیا ہے - خدا کرے تمہارے پسند آئے - تم خود قدر دانِ سخن ہو اور تین استاد اس فن کے

---

1. مطلب یہ کہ شیونراین نے یہ سن کر کہ غالب ہاتھ سے لفافے بناتے ہیں اپنے پاس سے لفافوں کا بنڈل بھیجنے کی اطلاع دی تھی -
2. غالب کی نگارش کا ایک کمال ان چند فقروں سے سورج کی طرح روشن ہے - مہاجنوں کی پوری سیرت کا خاکہ چند لفظوں میں اس طرح کھینچ دیا ہے کہ اس سے بہتر خاکہ نہیں کھینچا جا سکتا - یہ لکھنے کی ضرورت اس لیے پڑی کہ شیونرائن نے اپنے اخبار کے لیے خریدار پیدا کرنے کی درخواست کی ہوگی -
3. یہ قصیدہ شیونرائن نے غالب سے لکھوا کر ایلن براون کی خدمت میں پیش کیا -
4. تفتہ، حقیر اور مہر

تمھارے یار ہیں۔ میری محنت کی داد مل جائے گی۔

قصیدہ

ملاذِ کشور و لشکر، پناہ شہر و سپاہ — جنابِ عالی ایلن برون والاجاہ
بلند رتبہ وہ حاکم، وہ سرفراز امیر — کہ باج، تاج سے لیتا ہے جس کا طرفِ کلاہ
وہ محض رحمت و رافت کہ بہر اہلِ جہاں — نیابتِ دمِ عیسیٰ کرے ہے جس کی نگاہ
وہ عینِ عدل، کہ دہشت سے جس کی پرسش کی — بنے ہے شعلۂ آتش انیسِ پرۂ کاہ
زمیں سے کسوۂ گوہر اُٹھے بجائے غبار — جہاں ہو توسنِ حشمت کا اس جولانگاہ[1]
وہ مہرباں ہو، تو انجم کہیں "الٰہی شکر" — وہ خشمگیں ہو، تو گردوں کہے "خدا کی پناہ"
یہ اس کے عدل سے اضداد کو ہے آمیزش — کہ دشت و کوہ کے اطراف میں بہ ہر سرِ راہ
ہزبر پنجے سے لیتا ہے کام شانے کا — ق کبھی جو ہوتی ہے الجھی ہوئی دمِ روباہ[2]
نہ آفتاب، ولے آفتاب کا ہمچشم — نہ بادشاہ، ولے مرتبے میں ہمسرِ شاہ
خدا نے اس کو دیا ایک خوبرو فرزند — ستارہ جیسے چمکتا ہوا بہ پہلوے ماہ
زہے ستارۂ روشن، کہ جو اسے دیکھے — شعاعِ مہرِ درخشاں ہو اس کا تارِ نگاہ
خدا سے ہے یہ توقع کہ عہدِ طفلی میں — بنے گا شرق سے تا غرب اس کا بازی گاہ
جوان ہو کے کرے گا یہ وہ جہانبانی — کہ تابع اس کے ہوں روز و شب سپید و سیاہ[3]

۱۔ یعنی جہاں اس کی حشمت کا گھوڑا دوڑتا ہے وہاں غبار کے بجائے گوہروں کا سفوف اڑتا ہے۔

۲۔ ایک دوسرے کے دشمن اس طرح مل گئے ہیں کہ اگر لومڑی کے دم میں الجھاؤ پیدا ہو جائے تو شیر اپنے پنجے کو شانہ بنا کر الجھاؤ درست کر دیتا ہے۔

۳۔ منشی مہیش پرشاد نے "روز و شب سپید و سیاہ" یعنی سپید دن اور سیاہ رات لکھا ہے میرے نزدیک روز و شب و سپید و سیاہ ہی بہتر ہے یعنی دن رات بھی اس کے تابع ہوں اور سپید و سیاہ بھی اس کے تابع ہوں

کہے گی خلق اسے "داورِ سپہر شکوہ" / لکھیں گے لوگ اسے "خسروِ ستارہ سپاہ"
عطا کرے گا خداوند کارساز اسے / روانِ روشن و خوے خوش و دلِ آگاہ
ملے گی اس کو وہ عقلِ نہفتہ داں[۹] کہ اسے / پڑے نہ قطعِ خصومت میں احتیاجِ گواہ
یہ ترکتاز سے برہم کرے گا کشورِ روس / یہ لے گا بادشہِ چیں سے چھین تخت و کلاہ
سنینِ عیسوی اٹھارہ سو اور اٹھاون / یہ چاہتے ہیں جہاں آفریں سے شام و پگاہ
یہ جتنے سیکڑے ہیں سب ہزار ہو جائیں / دراز اس کی ہو عمر اس قدر، سخن کوتاہ
امیدوارِ عنایاتِ شیو نراین / کہ آپ کا ہے نمک خوار اور دولت خواہ

یہ چاہتا ہے کہ دنیا میں عزّ و جاہ کے ساتھ
تمہیں اور اس کو سلامت رکھے سدا اللہ

(۲)

شفیق میرے، مکرم میرے، منشی شیو نرائن صاحب،

تم ہزاروں برس سلامت رہو، تمہارا مہربانی نامہ اس وقت پہنچا اور میں نے اسی وقت جواب لکھا۔ بات یہ ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ کتاب دو جز یا چار جز کی ہو۔ چھ جزو سے کم نہ ہو، مسطر دس گیارہ سطر کا ہو، مگر حاشیہ تین طرف سے بڑا رہے، شیرازہ کی طرف کا کم ہو۔ یہ سب باتیں میرزا تفتہ کو لکھ چکا ہوں۔ اس بارے میرزا نے تم سے شاید کچھ نہیں کہا۔ اس کے سوا یہ ہے کہ کاپی کی تصحیح ہو، غلط نامہ کی حاجت نہ پڑے۔ آپ خود متوجہ رہیے گا اور منشی نبی بخش صاحب کو، اگر کہیے گا تو وہ بھی شریک رہیں گے اور میرزا تفتہ تو مالک ہی ہیں۔ کاغذ "شیورام پوری" ہو، خیر، مگر سفید اور چہرہ کیا ہوا اور لعاب دار ہو۔ پھر یہ ہو کہ حاشیہ پہ جو لغات کے معنی لکھے

---

۹ اسے مخفی بھیدوں کے جاننے والی ایسی عقل ملے گی کہ جب کوئی مقدمہ اس کے سامنے پیش ہوگا تو اسے طے کرنے کے لیے گواہیاں لینے کی ضرورت نہ پڑے گی بلکہ گواہیوں کے بغیر خود ہی سب کچھ طے کر دیا کرے گا۔

جائیں تو اس کی طرزِ تحریر اور تقسیم دل پسند اور نظر فریب ہو۔ حاشیہ کا قلم بہ نسبت متن کے قلم کے خفی ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ ان جلدوں میں سے دو جلدیں ولایت کو جائیں گی: ایک جناب فیض مآب ملکۂ معظمہ انگلستان کی نذر اور ایک میرے آقائے قدیم لارڈ ڈالن برا بہادر کی نذر اور چار جلدیں یہاں کے چار حاکموں کی نذر کروں گا۔ میرزا تفتہ کو پانچ جلدوں کے لیے لکھا تھا، لیکن اب چھ جلدیں تیار کر دیجیے گا، یعنی شیرازہ اور جدول اور ان چھ جلدوں کی جو لاگت پڑے، ایک روپیہ جلد سے لے کر دو روپے جلد تک، وہ مجھ سے منگوا بھیجئے گا۔ میں بمجرد طلب کے فوراً ہنڈوی بھیج دوں گا۔ ایک خریدار پچاس جلد کے وہاں پہنچے ہیں، واسطے خدا کے مرزا تفتہ سے کہیے کہ اُن کو ملیں۔ یعنی راجہ اُمید سنگھ بہادر اندور والے۔ وہ چھیلی اینٹ میں پولس کے پچھواڑے رہتے ہیں۔ تعجب ہے کہ آپ کا خط آ گیا اور میرزا تفتہ نے مجھے پارسل کی رسید نہیں لکھی۔ اب میرا خط فارسی اپنے نام کا اور یہ خط، دونوں خط ان کو دکھا دیجیے گا اور راجہ اُمید سنگھ سے ملنے کو کہیے گا اور وہاں صاحب، یہ ان کو تاکید کیجیے گا کہ وہ رباعی جو میں نے لکھ بھیجی ہے اس کو سب سے پہلے جہاں اس کا نشان دیا ہے، اسی فقرے کے آگے ضرور ضرور لکھ دیجئے گا اور وہ رباعی بیسویں صفحہ میں اس فقرے کے آگے ہے۔

"نے نے اختر بخت خسرو در بلندی بجائے رسید کہ رخ از خاکیاں نہفت"

تم ان کو یاد دلا کر اُن سے لکھوا لینا، ضرور ضرور۔

یہ جو تم نے لکھا کہ صاحب نے سن کر اس کو پسند کیا، میں حیران ہوں کہ کون سا مقام تم نے پڑھا ہوگا۔ کیونکر کہوں کہ صاحب اس عبارت کو سمجھے ہوں گے۔ اس کی جو حقیقت ہو مفصل لکھو۔ زیادہ از یادہ۔ جواب طلب ضروری

سہ شنبہ ۳۱ ماہ اگست ۱۸۵۸ء   راقم اسد اللہ

۱؎ اس خط میں تمام ہدایات دستنبو کے چھاپے کے متعلق ہیں۔ صاحب کے اظہار پسند کا تعلق بھی دستنبو سے متعلق ہے۔

(۳)

مہاراج،

سخت حیرت میں ہوں کہ منشی ہرگوپال صاحب نے مجھ کو خط لکھنا کیوں چھوڑا۔ اگر مجھ سے خفا ہیں تو کیوں خفا ہیں اور اگر شہر میں نہیں ہیں تو کہاں گئے اور کیوں گئے ہیں اور کب تک آئیں گے؟ آپ مہربانی فرما کر یہ امور مجھ کو لکھ بھیجیے۔ اس سے علاوہ ایک رباعی میرزا تفتہ کو بھیجی ہے اور ان کو لکھا ہے کہ اس کو "دستنبو" میں فلاں جگہ درج کر دینا اور ایک دو فقرے بھائی منشی نبی بخش صاحب کو لکھے ہیں اور ان کو بھی "دستنبو" میں لکھنے کا محل بتا دیا ہے۔ میں نہیں جانتا۔ اُن دونوں صاحبوں نے میرے کہنے پر عمل کیا اور انھوں[1] نے نظم کو اور انھوں[2] نے نثر کو کتاب کے حاشیہ پر چڑھا دیا یا نہیں۔ تم سے بہ ہزار آرزو خواہش کرتا ہوں کہ اگر وہ رباعی اور وہ فقرے حاشیہ پر چڑھ گئے ہیں تو مجھ کو ان کے لکھے جانے کی اطلاع دیجیے کہ تشویش رفع ہو اور اگر ان دونوں صاحبوں نے بے پروائی کی ہے تو واسطے خدا کے آپ میرزا تفتہ سے رباعی اور منشی نبی بخش صاحب سے دونوں فقرے لے لیجیے اور محل تحریر میرے خط سے معلوم کر کے ان کو جابجا حاشیے پر رقم کیجیے اور مجھ کو اطلاع دیجیے۔ ضرور ضرور۔ ایک اور کام آپ کو کرنا چاہیے کہ شاید تیسرے صفحہ کے آخر میں یا چوتھے صفحہ کے اوّل میں یہ فقرہ ہے:

"اگر وردم دیگر نہیب مباش بہم زند"

نہیب کا لفظ عربی ہے یہ سہو سے لکھا گیا ہے۔ اس کو چھیل ڈالیے گا اور اس کی جگہ "نوائے مباش" بنا دیجیے گا۔ حقیقت لکھ کر اب سوالات الگ الگ لکھتا ہوں:

---

[1] ہرگوپال تفتہ [2] منشی نبی بخش حقیر

پہلا سوال میرزا آفتہ کا حال اور ان کے خط نہ آنے کی وجہ لکھیے۔

دوسرا سوال میرزا آفتہ نے اگر رباعی دستنبو کے حاشیے پر لکھ دی ہے تو اس کی اطلاع، ورنہ اُن کے نام کے خط سے رباعی اور تحریر کا حال معلوم کر کے حاشیے پر لکھ دیں اور مجھ کو اطلاع دیں۔

تیسرا سوال منشی نبی بخش صاحب نے اگر میری بھیجی ہوئی نثر درج کر دی ہے تو اس کی اطلاع، ورنہ اُن سے لے کر اور محل معلوم کر کے حاشیہ کتاب پر لکھ دیجیے اور مجھ کو لکھ بھیجیے۔

چوتھا سوال: آپ، جس طرح لکھ آیا ہوں، نہیب کی جگہ نوا کا لفظ بنا کر مجھ پر عنایت کیجیے۔

پانچواں سوال: خریدار پچاس جلدوں کے پہنچے؟ میرزا آفتہ سے ملے؟ روپیہ ۵۰ جلدوں کی قیمت کا دیا؟ یا ہنوز یہ امور وقوع میں نہیں آئے؟ اس کی اطلاع ضرور دیجیے۔

چھٹا سوال: چھاپا شروع ہو گیا یا نہیں؟ اگر شروع نہیں ہوا تو کیا سبب؟

متوقع ہوں کہ میرے یہ سب کام از راہ عنایت بنا کر ان چھ سوالوں کا جواب اسی طرح جدا جدا لکھیے اور ضرور لکھیے اور جلد لکھیے۔

روز جمعہ ۱۷ ستمبر ۱۸۵۸ء راقم اسد اللہ خاں

(۴)

نورِ بصر لختِ جگر منشی شیو نرائن کو دُعا پہنچے۔ خط اور رپورٹ کا لفافہ پہنچا اور سب حال تمہارے خاندان کا دریافت ہوا۔ سب میرے جگر کے ٹکڑے ہیں اور تم اپنے دودمان کے چشم و چراغ ہو۔ العلم طاقتہ شوق سے لکھو۔ آخر کے صفحے کی دو سطریں از روے مضمون سراسر کتاب کے خلاف ہیں۔ میں نے سرکار کی فتح کا حال نہیں لکھا۔

صرف اپنی پندرہ مہینے کی سرگزشت لکھی ہے۔ تقریباً شہر و سپاہ کا بھی ذکر آگیا ہے۔ اور وہ اپنی سرگزشت جو میں نے لکھی ہے۔ سو ابتدا ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے ۳۱ جولائی ۱۸۵۸ء تک لکھی ہے۔ شہر ستمبر میں فتح ہوا۔ اس کا بیان بھی ضمناً آگیا۔ خوب ہوا کہ تم نے مجھ سے پوچھا، ورنہ بڑی قباحت ہوتی۔ اب میں جس طرح سے کہوں سو کرو۔ پہلے سوچ کہ تقسیم یوں ہے کہ تین سطریں اوپر اور تین سطریں نیچے، اور بیچ میں ایک سطر، اس میں کتاب کا نام۔ کیوں میاں، تقسیم یوں ہی ہے؟ اب میں دوسرے صفحہ پر ساتویں سطر لکھ دیتا ہوں۔ اس کو ملاحظہ کرو اور میرا کہنا مانو، ورنہ کتاب کی حقیقت غلط ہو جائے گی اور مطبع پر بات آئے گی۔

اس صفحے میں دو ایک باتیں اور سمجھا دوں کہ وہ ضروری ہیں۔ سنو، میری جان، نوابی کا مجھ کو خطاب ہے "نجم الدولہ" اور اطراف و جوانب کے امرا سب مجھ کو "نواب" لکھتے ہیں بلکہ بعض انگریز بھی۔ چنانچہ صاحب کمشنر بہادر دہلی نے جو ان دنوں میں ایک روبکاری بھیجی ہے تو لفافہ پر "نواب اسداللہ خاں" لکھا۔ لیکن یہ یاد رہے کہ نواب کے لفظ کے ساتھ "میرزا" یا "میر" نہیں لکھتے۔ یہ خلاف دستور ہے۔ یا "نواب اسداللہ خاں" لکھو یا "میرزا اسداللہ خاں" لکھو اور "بہادر" کا لفظ تو دونوں حال میں واجب اور لازم ہے۔

(۵)

برخوردار منشی شیو نراین کو معلوم ہو کہ میں کیا جانتا تھا کہ تم کون ہو؟ جب یہ جانا کہ تم ناظر بنسی دھر کے پوتے ہو تو معلوم ہوا کہ میرے فرزند دلبند ہو۔ اب تم کو مشفق و مکرم لکھوں تو گنہ گار۔ تم کو ہمارے خاندان اور اپنے خاندان کی آمیزش کا حال کیا معلوم؟ مجھ سے سنو:

"تمھارے دادا کے والد عہد نجفؔ[1] خاں و ہمدانی[2] میں میرے نانا صاحب مرحوم خواجہ غلام حسین خاں کے رفیق تھے۔ جب میرے نانا نے نوکری ترک کی اور گھر بیٹھے تو تمھارے پردادا نے بھی کمر کھولی اور پھر کہیں نوکری نہ کی۔ یہ باتیں میرے ہوش سے پہلے کی ہیں۔ مگر جب میں جوان ہوا تو میں نے یہ دیکھا کہ منشی بنسی دھر خاں صاحب[3] کے ساتھ ہیں اور انھوں نے کیتھم گاؤں اپنی جاگیر کا سرکار میں دعویٰ کیا تو منشی بنسی دھر اس امر کے منصرم ہیں اور وکالت اور مختاری کرتے ہیں۔ میں اور وہ ہم عمر تھے۔ شاید منشی بنسی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں۔ اُنیس بیس برس کی میری عمر اور ایسی ہی عمر اُن کی۔ باہم شطرنج اور اختلاط اور محبت۔ آدھی آدھی رات گزر جاتی تھی۔ چونکہ گھر ان کا بہت دُور نہ تھا،

---

[1] نجف خاں صفوی ایران کے شاہی خاندان سے تھا۔ اس کی ہمشیرہ کی شادی نواب وزیر اودھ کے بھائی کے ساتھ ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں خود بھی ہندوستان آگیا۔ جب شاہ عالم ثانی الہ آباد سے دہلی آیا تو نجف خاں ساتھ تھا۔ جنگ و سیاست دونوں ہی یکساں قابل تھا۔ ذوالفقار الدولہ خطاب پایا اور زندگی کے آخری سانس تک مغل سلطنت کا مختار رہا۔ ۱۷۸۲ء میں فوت ہوا۔ مغل امرا میں سے یہ آخری بڑا امیر تھا۔

[2] ہمدانی سے مراد بظاہر محمد بیگ ہمدانی ہے۔ نجف خاں کے پسری اولاد نہ تھی۔ افراسیاب خاں نام ایک لڑکے کو پال لیا تھا۔ ایک رشتہ دار مرزا شفیع اس کے پاس رہتا تھا۔ افراسیاب اور شفیع کے درمیان نجف خاں کی جانشینی کے متعلق جھگڑا پیدا ہوا۔ یکے بعد دیگرے دونوں مارے گئے۔ ان جھگڑوں میں محمد بیگ ہمدانی اور اس کے بھتیجے اسماعیل بیگ ہمدانی نے بھی بڑا حصہ لیا۔ محمد بیگ ۱۷۸۷ء میں راجپوتوں سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ اسماعیل بیگ بعد میں غلام قادر روہیلے کے ساتھ شامل ہوگیا۔

[3] خاں صاحب سے مراد خواجہ غلام حسین خاں ہیں، جو غالب کے نانا تھے۔

اِس واسطے جب چاہتے تھے چلے جاتے تھے۔ بس، ہمارے اور اُن کے مکان میں مچھیا رنڈی کا گھر اور ہمارے دو کٹرے درمیان تھے۔ ہماری بڑی حویلی وہ ہے کہ جو اب لکھمی چند سیٹھ نے مول لی ہے۔ اسی کے دروازے کی سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی اور پاس اس کے ایک "گھٹیا والی حویلی" اور سلیم شاہ کے تکیہ کے پاس دوسری حویلی اور "کالے محل" سے لگی ہوئی ایک اور حویلی اور اس سے آگے بڑھ کر ایک کٹرہ کہ وہ "کشمیرن والا" کہلاتا تھا۔ اس کٹرے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اڑاتا تھا اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔ واصل خاں نامے ایک سپاہی تمہارے دادا کا پیش دست رہتا تھا اور کٹروں کا کرایہ اوگاہ کر ان کے پاس جمع کرتا تھا۔

سُنو تو سہی۔ تمھارا دادا بہت کچھ پیدا کر گیا ہے۔ علاقے مول لیے تھے اور زمینداره اپنا کر لیا تھا۔ دس بارہ ہزار روپے کی سرکار کی مالگزاری کرتا تھا۔ آیا وہ سب کارخانے تمھارے ہاتھ آئے یا نہیں؟ اس کا حال ازروئے تفصیل جلد مجھ کو لکھو۔

روز سہ شنبہ ۹ ا اکتوبر ۱۸۵۸ء) وقت ورد حظ اسد اللہ

(۷)

برخوردار اقبال نشان منشی شیونرائن کو بعد دعا کے معلوم ہو۔ تمہارے دو خط متواتر پہنچے۔ میرے بھی دو خط پس و پیش پہنچے ہوں گے۔ بموافق اس تحریر کے عمل کیا ہوگا۔ دو جلدیں پُر تکلف اور پانچ جلدیں بہ نسبت اس کے کم تکلف مرزا حاتم علی صاحب کے عہدۂ اہتمام میں ہیں۔ اس سے ہم کو اور تم کو کچھ کام نہیں۔ وہ جیسی چاہیں بنوا کر بھیج دیں۔ تم ایک جلد، بس۔ زیادہ صرف کیوں کرو؟ اپنے طور پر اپنی طرف سے جیسی چاہو بنوا کر بھیج دو۔ میں تم کو اپنے پیارے ناظر بنسی دھر کی

نشانی جانتا ہوں۔ اس کو تمہاری نشانی جان کر اپنی جان کے برابر رکھوں گا۔ باقی حال اپنے خاندان اور تمہارے خاندان کا اور باہم پل کر اپنا اور بنسی دھر کا بڑے ہونا سب تم کو لکھ چکا ہوں۔ مکرر کیوں لکھوں؟

بادشاہ کی تصویر کی یہ صورت ہے کہ اُجڑا ہوا شہر، نہ آدمی نہ آدم زاد، مگر ہاں دو ایک مصوروں کو آبادی کا حکم ہو گیا ہے۔ وہ رہتے ہیں، سو وہ بھی بعد اپنے گھروں کے لٹنے کے آباد ہوئے ہیں۔ تصویریں بھی اُن کے گھروں سے لُٹ گئیں جو کچھ رہیں، وہ صاحبان انگریز نے بڑی خواہش سے خرید کر لیں۔ ایک مصور کے پاس ایک تصویر ہے۔ وہ تیس روپے سے کم کو نہیں دیتا۔ کہتا ہے کہ تین تین اشرفیوں کو میں نے صاحب لوگوں کے ہاتھ بیچی ہیں، تم کو دو اشرفی کو دوں گا۔ ہاتھی دانت کی تختی پر وہ تصویر ہے۔ میں نے چاہا کہ اس کی نقل کاغذ پر اُتار دے۔ اُس کے بھی بیس روپے مانگتا ہے۔ پھر خدا جانے اچھی ہو یا نہ ہو۔ اُتنا صرف بیجا کیا ضرور ہے؟ میں نے دو ایک آدمیوں سے کہہ رکھا ہے، اگر کہیں سے ہاتھ آ جائے گی تو لے کر تم کو بھیج دوں گا۔ مصوّروں سے خرید کرنے کا نہ خود مجھ میں مقدور، نہ تمہارا نقصان منظور۔

اب چھاپا تمام ہو گیا ہو گا۔ وہ پانچ اور دو سات کتابیں جو میرزا صاحب کی تحویل میں ہیں۔ وہ، اور وہ ایک جلد جو تم نے مجھ کو دینی کی ہے، وہ یہ سب لوح اور جلد کی درستی کے بعد پہنچ جائیں گی۔ مگر وہ چالیس سراسری، جو مجھے چاہیے ہیں، وہ تو آج کل میں روانہ کر دو۔ اور ہاں میری جان۔ یہ چالیس کتابوں کا پشتارہ کیونکر پہنچے اور محصول اس کا کیا ہو گا؟ اور یہ بھی تو بتاؤ کہ وہ دس جلدیں رائے امید سنگھ کے پاس کہاں بھیجی جائیں گی؟ میرزا تفتہ ہاترس کو جاتے ہوئے ان کا اندور نہ ہونا اور پھر شاید آگرے اور دلّی کا آنا مجھ کو لکھ چکے ہیں۔ ان باتوں کا جواب

مجھ کو لکھو۔ تصویر کے باب میں جو کچھ لکھو وہ کروں اور ان مقدمات سے اطلاع پاؤں۔ جواب جلد لکھو اور مفصل لکھو۔

نگاشتہ و رواں داشتہ۔ شنبہ ۲۳ر اکتوبر ۱۸۵۸ء غالب

(۷)

برخوردار کامگار کو بعد دعا کے معلوم ہو کہ "دستنبو" کے آغاز کی عبارت از روے احتیاط دوبارہ ارسال کی ہے۔ یقین ہے کہ پہنچ گئی ہوگی اور چھاپی گئی ہوگی اور آپ نے اُسی عبارت سے اشتہار بھی اخبار میں چھاپا ہوگا یا اب چھاپیے گا۔ بہ ہر حال اس شہر کے اخبار سنیے۔ حکم ہوا کہ دوشنبہ کے دن پہلی تاریخ نومبر کو رات کے وقت سب خیر خواہان انگریز اپنے اپنے گھر میں روشنی کریں اور بازار میں اور صاحب کمشنر بہادر کی کوٹھی پر بھی روشنی ہوگی۔ فقیر بھی اس تہی دستی میں کہ اٹھارہ مہینے سے پنسن مقرری نہیں پاتا۔ اپنے مکان پر روشنی کرے گا اور قطعہ پندرہ بیت کا لکھ کر صاحب کمشنر شہر کو بھیجا ہے۔ آپ کے پاس اس کی نقل بھیجتا ہوں۔ اگر تمھارا جی چاہے تو اس کو چھاپ دو اور جس نمبر میں یہ چھاپا جائے۔ وہ نمبر میرے دیکھنے کو بھیج دینا۔

اور اب فرمایئے کہ میں کتابوں کے آنے کا کب تک انتظار کروں[۱]۔

قطعہ

درین روزگارِ ہمایون و فرخ	کہ گوئی بود روزگارِ چراغاں
شدہ گوشش پُر نور چوں چشم بینا	ز آوازۂ اشتہارِ چراغاں
نگو شہر دریاے نور است کاینجا	نگہ گشتہ ہر سو دوچار چراغاں

[۱] اس خط پر تاریخ ثبت نہیں۔ لیکن یہ اکتوبر ہی کا معلوم ہوتا ہے اور اس میں جو قطعہ درج ہے وہ "دستنبو" کے ساتھ شائع ہوا تھا۔

بسر بردہ بر چرخ مہرِ منوّر / ہمہ روز در انتظارِ چراغاں
گواہِ من اینک خطوطِ شعاعی / کہ دارد دلش خارخارِ چراغاں
دریں شب روا باشد از چرخ گرداں / کند گنجِ انجم نثارِ چراغاں
نبوداست در دہر زیں پیش ہرگز / بدیں روشنی روے کارِ چراغاں
شد از فیض شاہنشہ انگلستاں / فزوں رونقِ کار و بارِ چراغاں
جہاندار وکٹوریا کز فروغش / ز آتش دمد لالہ زارِ چراغاں
ز عدلش، چناں گشت پروانہ ایمن / کہ شد دیدبانِ حصارِ چراغاں
بفرمانِ سر جان لارنس صاحب / شد ایں شہر آئینہ دارِ چراغاں
بدہلی فلک رتبہ سانڈرس صاحب / بر آراست نقش و نگارِ چراغاں
شد از سعیِ ہنری اجرٹن بہادر / رواں ہر طرف جویبارِ چراغاں
سخن سنج غالب ز روے عقیدت / دعا مے کند در بہارِ چراغاں
کہ بادا فزوں سال عمرِ شہنشہ / بروے زمیں از شمارِ چراغاں

(۸)

میاں، تمھارے کمال کا حال معلوم کر کے میں بہت خوش ہوا[۱]۔ اگر مجھ کو کبھی انگریزی لکھوانا ہوگا تو یہاں سے اُردو میں لکھ کر بھیج دوں گا، تم وہاں سے لکھ کر بھیج دیا کرنا۔ "قصۂ قاصدانِ شاہی" میں نے دیکھا۔ اصلاح کے باب میں سوچا کہ اگر سب فقروں کو مقفّٰی اور عبارت کو رنگین بنانے کا قصد کروں تو کتاب کی صورت بدل جائے گی اور تم کو بھی شاید یہ منظور نہ ہو۔ ناچار اس پر قناعت کی کہ جو الفاظ ٹکسال سے باہر تھے وہ بدل ڈالے۔ مثلاً "وے" کو کہ یہ گنوار بولی ہے "وہ" یہ ٹھیٹ اُردو ہے۔ "کرانا" یہ بیرونجات کی بولی ہے، "کروانا" یہ فصیح ہے۔ "راجے" یہ

۱۔ یعنی شیونرائن نے لکھا ہوگا کہ میں انگریزی بھی جانتا ہوں۔ اگر آپ کو ضرورت ہو تو مجھ سے لکھوا لیا کریں

غلط ہے "راجا" صحیح ہے - کہیں کہیں روابط و ضمائر نامربوط تھے - ان کو مربوط کر دیا ہے - ایک جگہ "گھنے بسے" یہ لفظ میری سمجھ میں نہ آیا - اس کو تم سمجھ لینا - باقی اور سب مربوط اور خوب صاف ہے، حاجت اصلاح کی نہیں -

صاحب، کتابیں کب روانہ ہوں گی؟ دوالی بھی ہولی - اگر گنگا جانے کا قصد ہو تو بھائی میری کتابیں بھیج کر جانا اور ہاں یہ میں نہیں سمجھا کہ میرزا آھر کی بنوائی ہوئی سات کتابیں بھی انھیں کتابوں کے ساتھ بھیجو گے یا وہ اپنے طور پر جدا روانہ کریں گے؟ وہ تم نے اپنی بنوائی ہوئی کتاب کا آٹھ دن کا وعدہ کیا تھا اور اس وعدہ سے یہ بات تراوش کرتی تھی کہ سادہ کتابیں پہلے روانہ ہوں گی اور وہ ایک کتاب ہفتہ کے بعد - سو وہ ہفتہ بھی گذر گیا - یقین ہے کہ اب وہ سب یکجا پہنچیں اور شاید کل پرسوں آجائیں -

وہ لمبر اخبار کا جو تم نے مجھ کو بھیجا تھا، اس میں ایڈمنسٹن صاحب کے لفٹنٹ ہونے کی اور بہت جلد آگرہ آنے کی خبر لکھی تھی - یہاں مجھ کو کئی باتیں پوچھنی ہیں

ایک تو یہ کہ یہ چیف سکرٹر نواب گورنر جنرل کے تھے - جب یہ لفٹنٹ گورنر ہوگئے تو اب وہاں چیف سکرٹر کون ہوگا؟ یقین ہے کہ ولیم میور صاحب اس عہدہ پر مامور رہوں - پس اگر یوں ہی ہے تو اُن کے محکمے میں چیف سکرٹر کون ہوگا؟

دوسری بات یہ کہ میر منشی اُن کے تو وہی منشی غلام غوث خاں رہیں گے؟ یقین ہے کہ ان کے ساتھ آویں -

تیسری بات یہ کہ گورنر جنرل کے فارسی دفتر کے میر منشی ایک بزرگ تھے بلگرام کے رہنے والے، منشی سید جان خاں - آیا اب بھی وہی ہیں یا اُن کی جگہ کوئی اور صاحب ہیں؟

اِن سب باتوں میں سے جو آپ کو معلوم ہوں، وہ اور جو نہ معلوم ہو

اس کو معلوم کر کے مجھ کو لکھیے اور جلد لکھیے اور ضرور لکھیے۔ یقین تو ہے کہ تم سمجھ گئے ہوگے کہ میں کیوں پوچھتا ہوں۔ کتابیں جا بجا بھیجنے ہیں جب تک نام اور مقام معلوم نہ ہو تو کیوں کر بھیجوں۔ جواب لکھو اور شتاب لکھو۔ کتاب بھیجو اور جلد بھیجو۔

سہ شنبہ ۹ ر نومبر ۱۸۵۸ء

(۹)

برخوردار کامگار منشی شیونرائن طال عمرہٗ و زاد قدرہٗ،

کل جمعہ کے دن ۱۲۔ نومبر کو ۳۲ کتابیں آگئیں۔ میں بہت خوش ہوا اور تم کو دعائیں دیں۔ خط تمہارے نام کا ابھی میرا کہار ڈاک میں لے گیا ہے۔ اس رقعہ کی تحریر سے مقصود یہ ہے کہ میاں عبدالحکیم بہت نیک بخت اور اشراف اور ہنرمند آدمی ہیں "دلی گزٹ" میں حرفوں کے چھاپے کا کام کیا کرتے تھے۔ چونکہ یہ چھاپے خانہ اب آگرے میں ہے، یہ بھی وہیں آتے ہیں۔ تمہارے پاس حاضر ہوں گے اور ان پر مہربانی رکھنا بھلا۔ وہ شہر بیگانہ ہے۔ ان کو تمہاری خدمت میں شناسائی رہے گی، تو اچھی بات ہے صحافی کا کام بھی بقدر ضرورت کر سکتے ہیں۔ شاید اگر "دہلی گزٹ" میں ان کا طور درست نہ ہو تو اس صورت میں بشرط گنجایش اپنے مطبع میں ان کو رکھ لینا۔

نگاشتہ ۱۳ ر نومبر ۱۸۵۸ء راقم اسد اللہ

(۱۰)

صاحب،

تمہارا خط آیا، دل خوش ہوا۔ دیکھیے مرزا آمہر کب روانہ کرتے ہیں[1]۔ اگر بھیج چکے ہیں تو یقین ہے کہ آج یہاں آ پہنچیں۔ آج نہ آئیں کل آئیں۔ کل سے

---

[1] یعنی کتابیں

میں شام تک راہ دیکھتا ہوں۔

"مہر نیم ماہ" نہیں، اس کا نام "مہر نیمروز" ہے اور وہ سلاطین تیموریہ کی تواریخ ہے۔ اب وہ بات ہی گئی گزری، بلکہ وہ کتاب اب نہ چھاپنے کے لائق ہے، نہ چھپوانے کے قابل۔ اُردو کے خطوط جو آپ چھاپا چاہتے ہیں، یہ بھی زائد بات ہے۔ کوئی رقعہ ایسا ہوگا کہ میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا، ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری سخنوری کے شکوہ کے منافی ہے۔ اِس سے قطع نظر، کیا ضرور ہے کہ ہمارے آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں۔ خلاصہ یہ کہ ان رقعات کا چھاپا میرے خلاف طبع ہے

محررہ پنجشنبہ ۱۸، نومبر ۱۸۵۸ء

(۱۱)

برخوردار اقبال نشان کو دعا پہنچے۔ کل جمعہ کے دن ۱۹۔ نومبر ۱۸۵۸ء کو سات کتابوں کے وہ پارسل پہنچے۔ واقعی کتابیں جیسا کہ میرا جی چاہتا تھا، اسی روپ کی ہیں۔ حق تعالیٰ میرزا مہر کو سلامت رکھے۔ رقعوں کے چھاپنے کے باب میں ممانعت لکھ چکا ہوں۔ البتہ اس باب میں میری رائے پر تم کو اور میرزا تفتہ کو عمل کرنا ضرور ہے۔

مطلب عمدہ جو اس خط کی تحریر سے منظور ہے، وہ یہ ہے کہ جو کتاب تم نے بنوائی ہے اور میں نے تم کو لکھا تھا کہ پہلے ورق کے دوسرے صفحہ پر انگریزی عبارت لکھ کر بھیجنا، خدا کرے وہ عبارت تم نے نہ لکھی ہو۔ اگر لکھ دی ہو تو ناچار اور اگر نہ لکھی ہو تو اب نہ لکھنا اور سادہ رہنے دینا اور اسی طرح میرے پاس بھیج دینا۔ یہ بھی معلوم رہے کہ اب اِن کتب کی تقسیم اس کتاب کے آنے تک ملتوی رہے گی۔ اور وہ کتاب میرے پاس جلد پہنچ جائے

تو بہتر ہے - جواب طلب بلکہ کتاب طلب

۲۰ / نومبر ۱۸۵۸ء غالب

(۱۲)

صاحب، تم کندھولی سے کب آئے اور جب آئے تو میرا خط بیرنگ کہ جس میں سات روپے کی ہنڈوی ملفوف تھی پایا یا نہیں پایا؟ اگر پایا تو موافق اس تحریر کے عمل کیوں نہ فرمایا؟ اور اس خط میں ایک مطلب جواب طلب تھا - اس کا جواب کیوں نہ بھجوایا؟ اچھا، اگر تم ایک آدھ دن کے واسطے کندھولی گئے تھے - تو کارپردازان مطبع نے خط لے کر رکھ چھوڑا ہوگا اور جب تم آئے ہو گے تو وہ خط تمھیں دیا ہوگا - پھر کیا سبب جو تم نے جواب نہ لکھا؟ یا ابھی کندھولی سے تم نہیں آئے، یا وہ خط میرا تلف ہو گیا - تاریخ تحریر خط مجھے یاد نہیں - اب یہ لکھتا ہوں کہ اگر خط پہنچا تو مجھ کو خط کی اور ہنڈوی کی رسید اور میرے سوال کا جواب لکھو اور اگر خط نہیں پہنچا تو اس کی تدبیر بتاؤ کہ اب میں ساہوکار سے کیا کہوں اور ہنڈوی کا ثمن کس طرح سے مانگوں؟ جواب طلب، جواب شتاب

روز سہ شنبہ - ۳۰ / نومبر ۱۸۵۸ء از اسد اللہ مضطرب

(۱۳)

صاحب، تم خط کے جواب نہ بھیجنے سے گھبرا رہے ہو گے - حال یہ ہے کہ قلم بنانے میں میرا ہاتھ انگوٹھے کے پاس سے زخمی ہو گیا اور ورم کر آیا - چار دن روٹی بھی مشکل سے کھائی گئی ہے - بہر حال اب اچھا ہوں - پنج آہنگ تم نے مول لے لی، اچھا کیا - دو چھاپے ہیں: ایک بادشاہی چھاپے خانے کا اور ایک منشی نورالدین کے چھاپے خانے کا - پہلا ناقص ہے دوسرا سراسر غلط ہے - کیا کہوں، تم سے؟ ضیاء الدین خاں، جاگیردار لوہارو، میرے بھتیجے بھائی اور میرے شاگرد رشید ہیں

جو نظم و نثر میں نے کچھ لکھا، وہ اُنھوں نے لیا اور جمع کیا۔ چنانچہ "کلیاتِ نظم فارسی" چوّن پچپن جزو اور "پنج آہنگ" اور "مہرِ نیمروز" اور "دیوانِ ریختہ" سب مل کر سوا سو جزو مطلّا اور مذہب اور انگریزی ابری کی جلدیں الگ الگ، کوئی ڈیڑھ سو دو سو روپے کے صرف میں بنوائیں۔ میری خاطر جمع، کہ کلام میرا سب یکجا فراہم ہے۔ پھر ایک شاہزادے نے اِس مجموعِ نظم و نثر کی نقل لی۔ اب دو جگہ میرا کلام اکٹھا ہُوا۔ کہاں سے یہ فتنہ برپا ہوا اور شہر لُٹے۔ وہ دونوں جگہوں کا کتاب خانہ خوانِ یغما ہو گیا۔ ہر چند میں نے آدمی دوڑائے کہیں سے اُن میں سے کوئی کتاب ہاتھ نہ آئی۔ وہ سب قلمی ہیں۔ غرض اس تحریر سے یہ ہے کہ قلمی "فارسی کلیات" قلمی "ہندی کا کلیات" قلمی "پنج آہنگ" قلمی "مہرِ نیمروز" اگر کہیں ان میں سے کوئی نسخہ بکتا ہُوا آوے، تو اس کو میرے واسطے خرید کر لینا اور مجھ کو اطلاع کرنا۔ میں قیمت بھیج کر منگوا لوں گا۔

جنابِ ہنری اسٹورٹ ریڈ صاحب کو ابھی میں خط نہیں لکھ سکتا[1]۔ اِن کی فرمائش ہے اُردو کی نثر، وہ انجام پاوے تو اس کے ساتھ ان کو خط لکھوں۔ مگر بھائی تم غور کرو، اُردو میں میں اپنے قلم کا زور کیا صرف کروں گا اور اس عبارت میں معانی نازک کیوں کر بھروں گا؟ ابھی تو یہی سوچ رہا ہوں کہ کیا لکھوں۔ کون سی بات، کون سی کہانی، کون سا مضمون تحریر کروں اور کیا تدبیر کروں؟ تمھاری رائے میں کچھ

---

[1] ریڈ صاحب صوبجاتِ متحدہ یو۔پی، میں محکمۂ تعلیم کے ڈائرکٹر تھے۔ اس کے بعد کے خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیو نرائن نے میرزا کو لکھا تھا کہ "دستنبو" کی خریداری کے لیے ریڈ صاحب کو لکھیے۔ وہ سکولوں کے لیے کافی تعداد میں کتابیں خرید لیں گے۔ لیکن غالب اس لیے متوقف تھے کہ ریڈ صاحب نے اردو نثر کے لیے فرمائش بھیج رکھی تھی اور اس فرمائش کو پورا کیے بغیر اپنے مطلب کے لیے اسے لکھنا غیر مناسب معلوم ہوتا تھا۔

آئے تو مجھ کو بتاؤ۔ ایک قرینے سے مجھ کو معلوم ہُوا ہے کہ شاید گورنمنٹ سو دو سو دستنبو کی خریداری کرے گی اور ان نسخوں کو ولایت بھیجے گی۔ کیا بعید ہے کہ ہفتے دو ہفتے میں الٰہ آباد سے تمھارے پاس حکم پہنچے۔

روز دوشنبہ ۱۱ر دسمبر ۱۸۵۸ء

(۱۴)

بھائی!

یہ بات تو کچھ نہیں کہ تم خط کا جواب نہیں لکھتے۔ خیر، دیر سے لکھو، اگر شتاب نہیں لکھتے۔ تمھارا خط آیا۔ اس کے دوسرے دِن میں نے جواب بھجوایا۔ آج تک تم نے اس کا جواب نہ بھیجا، حال آنکہ اس میں جواب طلب باتیں تھیں۔ یعنی میں نے اپنی نظم نثر کی کتب کا حال تم کو لکھ کر، تم سے استدعا کی تھی کہ قلمی جو نسخہ تمھارے ہاتھ آجائے، وہ تم خرید کر مجھے بھیج دینا۔

ریڈ صاحب کے باب میں میں نے یہ لکھا تھا کہ جب اُردو کی نثر اُن کے واسطے لکھ لوں گا تو دستنبو کی خریداری کی خواہش کروں گا۔ بعہذا تم سے صلاح پوچھی تھی کہ کس حکایت اور کس روایت کو فارسی سے اُردو کروں؟ تم نے اس بات کا بھی جواب نہ لکھا۔

سید حفیظ الدین احمد کی مُہر کے کھدوانے کو تم نے لکھا تھا کہ ملتوی رہے۔ پھر اس کا بھی کچھ بیورا[1] نہ لکھا۔ میں اس کو بھی کچھ نہیں سمجھا۔ اس کو یکسو کرو۔ ہاں ناں کچھ لکھ بھیجو۔ تمھاری مہر بدر الدین علی خاں کو دی گئی ہے۔ یقین تو یہ ہے کہ اسی دسمبر کے مہینے میں تمھارے پاس پہنچ جائے اور ۱۸۵۸ء سن کھدے۔ شاید کچھ دیر ہو تو جنوری ۱۸۵۹ء میں کھدے۔ اس سے زیادہ درنگ نہ ہو گی۔ تم کو روپیہ حرف

[1] خبر، اطلاع

آٹھ آنہ حرف سے کیا علاقہ؟ تم کو اپنی مہر سے کام۔

سچ تو کہو، کیا پھر کندھولی گئے ہو؟ کیا کر رہے ہو؟ کس شغل میں ہو؟ یا مجھ سے خفا ہو؟ اگر خفا ہو تو اور کچھ نہ لکھو، خفگی کی وجہ لکھو۔ بہر حال اس کا جواب شتاب بھیجو اور اسی خط میں بعد ان سب باتوں کے جواب کے مولوی قمر الدین خاں کا حال لکھو کہ وہ کہاں ہیں؟ اور کس طرح ہیں؟ برسرِ کار ہیں یا بیکار ہیں؟ اچھا، میرا بھائی اس کے جواب میں درنگ نہ ہو۔ زیادہ کیا لکھوں؟

مرسلہ چہار شنبہ ۱۵ دسمبر ۱۸۵۸ء غالب

(۱۶)

برخوردار،

آج اس وقت تمہارا خط مع لفافوں کے لفافے کے آیا۔ دل خوش ہوا۔ بھائی، میں اپنے مزاج سے ناچار ہوں۔ یہ لفافے "از مقام و در مقام و تاریخ و ماہ" مجھ کو پسند نہیں۔ آگے جو تم نے مجھے بھیجے تھے۔ وہ بھی میں نے دوستوں کو بانٹ دیے۔ اب یہ لفافوں کا لفافہ اس مراد سے بھیجتا ہوں کہ ان کے عوض یہ لفافے جو "در مقام و از مقام" سے خالی ہیں جن میں تم اپنے خط بھیجا کرتے ہو، مجھ کو بھیج دو اور یہ لفافے اس کے عوض مجھ سے لے لو۔ اور اگر اس طرح کے لفافے نہ ہوں تو ان کی کچھ ضرورت نہیں۔

۱۔ شیو نرائن نے لفافے بھیجے۔ لیکن اپنے خیال کے مطابق غالب کی سہولت کے لیے ان پر "از مقام، در مقام۔ تاریخ و ماہ" وغیرہ چھپوا دیا۔ غالب کو یہ پسند نہ تھا۔ لہٰذا جتنے لفافے آئے تھے وہ متفرق دوستوں میں بانٹ دیے اور شیو نرائن کو اطلاع نہ دی۔ اس عقیدت مند نے دوبارہ ویسا ہی بنڈل بھیج دیا۔ اُسے غالب نے واپس کیا اور ساتھ ہی واپسی کی وجہ ظاہر کر دی۔

مُہر کے واسطے، صاحب، زمرد کا نگینہ اور پھر چنے کی دال کے برابر اور ہشت پہلو، اس اجڑے شہر میں کہاں ملے گا۔ عقیق بہت خوش رنگ، سیاہ یا سُرخ رنگ، جیسا تم نے آگے لکھا ہے، ہشت پہلو ہوگا۔ یہ مہر میری طرف سے تم کو پہنچے گی۔ تم کو چار آنے حرف چھ آنے حرف سے کچھ مدعا نہیں۔ آپ اپنی مہر چاہو زمرد پر، چاہو الماس پر کھدواؤ۔ میں تو عقیق کی مہر تم کو دوں گا۔ وہ دوسری مہر جب تمھاری مہر کھد چکے گی، جس طرح تم کہو گے کھد جائے گی۔

میاں، کیا قرینہ بتاؤں گورنمنٹ کی خریداری کا؟ ایک بات ایسی ہے کہ ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ خدا کرے اس کا ظہور ہو جائے۔ ابھی مجھ سے کچھ نہ پوچھو۔ جناب ریڈ صاحب صاحبی کرتے ہیں۔ میں اُردو میں اپنا کمال کیا ظاہر کر سکتا ہوں؟ اس میں گنجایش عبارت آرائی کی کہاں ہے؟ بہت ہوگا تو یہ ہوگا میرا اُردو بہ نسبت اوروں کے اُردو کے فصیح ہوگا۔ خیر بہر حال کچھ کروں گا اور اردو میں اپنا زورِ قلم دکھاؤں گا۔ قے کا ہونا اور دستوں کا آنا یہ چاہتا ہے کہ تم نے رات کو بُری قسم کی شراب مقدار میں زیادہ پی ہو گی۔ کچھ تبرید کرو اور شراب زیادہ نہ پیا کرو۔ میرا رقعہ تمھارے نام کا اور تفتہ کا رقعہ تمھارے نام کا حسب الحکم تمھارے واپس بھیجا جاتا ہے۔ میں نے تفتہ کا خفا ہونا اسی طرح لکھا تھا، جیسا تم کو تمھارا خفا ہونا لکھا تھا۔ بھلا وہ میرے فرزند کی جگہ ہیں، مجھ سے خفا کیوں ہوں گے؟ اُس دن سے آج تک دو تین خط ان کے آ چکے ہیں چنانچہ ایک خط ابھی تمھارے خط کے ساتھ ڈاک کا ہرکارہ دے گیا ہے۔

غالب

محررہ شنبہ ۱۸، دسمبر ۱۸۵۸ء

(۱۶)

اب ایک امر خاص کو سمجھو۔ دو جلدیں دستنبو کی مجھ کو لکھنؤ بھیجنی ہیں اور

میرے پاس کوئی جلد نہیں ہے۔ اب جو تم سے منگاؤں اور یہاں سے لکھنؤ بھجواؤں، تو ایک قصّہ ہے۔ یہ صاحب لوگ اطراف و جوانب سے مجھ پر فرمائشیں بھیجتے ہیں، تم سے بقیمت کوئی نہیں منگواتا۔ چالیس جلدیں پہلی اور بارہ یہ حال کی سب تقسیم ہوگئیں۔ ان دونوں صاحبوں کی خاطر مجھ کو بہت عزیز ہے۔ ایک روپے کے بتیس ٹکٹ اور دو آنے کے دو ٹکٹ اس خط میں ملفوف کر کے تم کو بھیجتا ہوں۔ دو پارسل الگ الگ لکھنؤ کو ارسال کرو۔ آنے آنے کے ٹکٹ اس پر لگا دو۔ ایک پارسل پر یہ لکھو:

"ایں پارسل بصیغہ بُک پاکٹ، اسٹامپ پیڈ، در لکھنؤ بہ محلہ نخاس، در امام باڑہ اکرام اللہ خاں بہ مکان میرزا عنایت علی، بخدمت میر حسین علی برسد۔ مرسلہ شیو نراین، مہتمم مطبع مفید خلائق از آگرہ۔"

دوسرے پارسل پر بھی یہی عبارت، گھر مکان کا پتہ اور نام اور در لکھنؤ بہ احاطہ خانساماں متصل تکیہ شبیر علی شاہ بہ مکانات مولوی عبدالکریم مرحوم بخدمت مولوی سراج الدین احمد صاحب برسد۔

سمجھ لیے؟ یعنی دو پارسل اسٹامپ پیڈ، دونوں لکھنؤ کو، ایک بنام میر حسین علی، اور ایک بنام سراج الدین احمد، بسبیل ڈاک روانہ کر دو۔ اور ہاں صاحب، ان دونوں پارسلوں کی روانگی کی تاریخ مجھ کو لکھو تاکہ میں اپنے خط میں ان کو اطلاع دوں۔

ایک امر اور ہے اگر تم بھی اس رائے کو پسند کرو یعنی جس طرح سے تم نے ایک جلد ہنری اسٹورٹ ریڈ صاحب کو اپنی طرف سے بھیجی ہے۔ اسی طرح دو جلدیں ان دونوں صاحبوں کو، جن کا نام کاغذ میں لکھا ہوا ہے بھیج دو، مگر اپنی ہی طرف سے۔ میرا اس میں اشارہ نہ پایا جائے اور یہ دونوں صاحب بالفعل دلّی میں وارد ہیں۔ یہ بات ایسی نہیں ہے کہ خواہی نخواہی اس کو کیا ہی چاہیے۔ ایک صلاح ہے اور

نیک صلاح ہے۔ مناسب جانو کرو، ورنہ جانے دو۔

میاں، اردو کیا لکھوں؟ میرا یہ منصب ہے کہ مجھ پر اُردو کی فرمایش ہو؟ خیر ہوئی۔ اب میں کہانیاں قصّے کہاں ڈھونڈتا پھروں؟ کتاب نام کو میرے پاس نہیں۔ پنسن مِل جائے، حواس ٹھکانے ہو جائیں تو کچھ فکر کروں "پیٹ نہ پئیاں روٹیاں تو سبھی گلاں کھوٹیاں"[1] زیادہ زیادہ۔ جواب طلب

روز سہ شنبہ ۔ ۴ جنوری ۱۸۵۹ء غالب

(۱۷)

پرسوں اور کل، دو ملاقاتیں جناب آرنلڈ صاحب بہادر سے ہوئیں۔ کیا کہوں کہ مجھ پر بے سابقہ معرفت کیا عنایت فرمائی۔ میں یہ جانتا ہوں کہ گویا مجھ کو مول لے لیا۔ آج وہ یہاں اور ہیں، کل جائیں گے۔ "دستنبو" تمھاری بھیجی ہوئی ان کے پاس نہیں پہنچی۔ ناچار ایک "دستنبو" اور ایک "پنج آہنگ" اپنے پاس سے ان کو نذر کر آیا ہوں۔ لکھنو کے دونوں پارسلوں کی رسید مجھ کو آج تک نہیں آئی۔ آخر رسید تو تم کو پارسلوں کی ملی ہوں گی۔ ڈاک سے معلوم کر کے مجھ کو لکھ بھیجو۔ دیر نہ کرو ورنہ میں مشوش رہوں گا۔

نگاشتہ صبح شنبہ ۱۵ جنوری ۱۸۵۹ء از غالب

(۱۸)

صاحب،

میں ہندی[2] غزلیں بھیجوں کہاں سے؟ اُردو کے دیوان چھاپے کے ناقص ہیں۔ بہت غزلیں اس میں نہیں ہیں۔ قلمی دیوان جو اتم و اکمل تھے، وہ لُٹ گئے۔

---

[1] پنجابی کی مثل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پیٹ بھرا ہوا ہو تو باتیں سوجھتی ہیں۔

[2] مراد ہے اُردو غزلیں۔

یہاں سب کو کہہ رکھا ہے کہ جہاں بکتا ہوا نظر آجائے لے لو۔ تم کو بھی لکھ بھیجا اور ایک بات اور تمھارے خیال میں رہے کہ میری غزل پندرہ سولہ بیت کی بہت شاذ و نادر ہے۔ بارہ بیت سے زیادہ اور نو شعر سے کم نہیں ہوتی۔[1] جس غزل کے تم نے پانچ شعر لکھے ہیں یہ نو شعر کی ہے۔ ایک دوست کے پاس اُردو کا دیوان چھاپے سے کچھ زیادہ ہے، اس نے کہیں کہیں سے مسودات متفرق بہم پہنچا لیے ہیں۔ چنانچہ "پنہاں ہوگئیں"۔ "ویراں ہوگئیں" یہ غزل مجھ کو اسی سے ہاتھ آگئی ہے۔ اب میں نے اس کو لکھا ہے اور تم کو یہ خط لکھ رہا ہوں۔ خط لکھ کر رہنے دوں گا۔ جب اس کے پاس سے ایک غزل آجائے گی تو اسی خط میں ملفوف کر کے بھیج دوں گا۔ یہ خط یا آج روانہ ہو جائے یا کل۔

میں نے ایک قصیدہ اپنے محسن و مربّی قدیم جناب فریڈرک ایڈمنسٹن صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر غرب و شمال کی مدح میں[2] اور ایک قصیدہ جناب منٹگمری لفٹنٹ گورنر بہادر غرب و شمال کی تعریف میں[3] لکھا ہے اگر کہو تو بھیج دوں، مگر فارسی میں اور چالیس

---

[1] یہ کلیہ نہیں۔ غالب کی متعدد غزلیں نو شعر سے کم کی ہیں۔

[2] یہ قصیدہ کلیات نظم فارسی میں ص ۲۴۳ ہے کل چھیالیس شعر ہیں ردیف اس کی "باد" ہے اس میں سے دو شعر درج ذیل ہیں

کلبۂ درویش را نبود چراغ — برق در شبہاے تار آورد باد
دیدہ ور داند از نظمم بہ بزم — سلک دُرّ شاہوار آورد باد

[3] یہ کلیات نظم فارسی میں ص ۲۴۵ ہے اس میں اپنے متعلق لکھتے ہیں:

داورا! غالبِ عاجز کہ ستایش گر تست — گلہ از گردش ایں چرخ ستم گر دارد
ذکر ایں فتنہ کہ برخاست ز انبوہ سپاہ — بہ زبانے کہ قلم راست سر بسر دارد
بندہ مے خواست کہ بیروں رود اما بوجوہ — نتوانست کہ از گوشہ قدم بر دارد
ماند و آئین وفا داشت در آں عہد و ہنوز — نیز آں قاعدہ با خویش مقرر دارد
بجز ثناے و دعاے کہ ہمے گفت، نگفت — و آنچہ مے گفت دریں وقت ہم از بر دارد

چالیس پینتالیس بینتالیس شعر ہیں۔

کتب "دستنبو" کے بک جانے سے میں خوش ہوا۔ خدا کرے جس کو دی ہو دو تین غلطیاں جو معلوم ہیں، وہ بنا دی ہوں۔ یہ نہ معلوم ہوا کہ صاحب لوگوں نے خریدیں یا ہندوستانیوں نے لیں؟ تم یہ بات مجھ کو ضرور ضرور لکھو۔ دیکھو صاحب، تم گھبراتے تھے۔ آخر یہ جنس پڑی نہ رہی اور بک گئی۔ بھائی، ہندستان کا قلمرو بے چراغ ہو گیا۔ لاکھوں مر گئے۔ جو زندہ ہیں، ان میں سیکڑوں گرفتار بند بلا ہیں۔ جو زندہ ہے، اس میں مقدور نہیں۔ میں ایسا جانتا ہوں کہ یا تو صاحبان انگریز کی خریداری آئی ہو گی یا پنجاب کے ملک کو یہ کتابیں گئی ہوں گی۔ پورب میں کم بکی ہوں گی۔

میاں، میں تم کو اپنا فرزند جانتا ہوں۔ خط لکھنے نہ لکھنے پر موقوف نہیں ہے، تمھاری جگہ میرے دل میں ہے۔ اب میں طبع آزمائی کرتا ہوں اور جو غزل تم نے بھیجی ہے اس کو لکھتا ہوں۔ خدا کرے نو کے نو شعر یاد آجائیں:

غزل

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ "تو کیا ہے؟" تمھیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے؟

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن ہماری جیب کو اب حاجت رفو کیا ہے؟

جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہو گا کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے؟

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے؟

وہ چیز جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز، سوائے بادۂ گلفام مشکبو کیا ہے؟

پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار، یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے؟

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تجھ سے وگرنہ خوف بد آموزی عدو کیا ہے؟

رہی نہ طاقت گفتار اور اگر ہو بھی تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے؟

ہو اہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا، وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے؟

یہ تمہارا اقبال ہے کہ نو شعر یاد آ گئے۔ ایک غزل یہ اور دو غزلیں وہ جو آیا چاہتی ہیں، تین ہفتے کا گودام[1] تمہارے پاس فراہم ہو گیا۔ اگر منگاؤ گے تو قصیدے دونوں بھیج دوں گا۔

مرقومہ سہ شنبہ ۱۹ اپریل ۱۸۵۹ء غالب

(۱۹)

بھائی،

حاشا، ثم حاشا، اگر یہ غزل میری ہو۔ مصرع "اسد اور لینے کے دینے پڑے" اس غریب کو میں کچھ کیوں کہوں؟ لیکن اگر یہ غزل میری ہو، مجھ پر ہزار لعنت۔ اس سے آگے ایک شخص نے یہ مطلع میرے سامنے پڑھا اور کہا کہ قبلہ آپ نے کیا خوب مطلع کہا ہے:

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی مرے شیر شاباش، رحمت خدا کی

میں نے یہی اُن سے کہا تھا کہ اگر یہ مقطع میرا ہو تو مجھ پر لعنت۔ بات یہ ہے کہ ایک شخص امانی اسد ہو گزرے ہیں۔ یہ غزل اُن کے کلام معجز نظام سے ہے اور تذکروں میں مرقوم ہے۔ میں نے تو کوئی دو چار برس ابتدا میں اسد تخلص رکھا ہے،[2] ورنہ غالب ہی لکھتا رہا ہوں۔ تم طرز تحریر اور روش فکر پر بھی نظر نہیں کرتے۔ میرا

[1] مطلب یہ ہے کہ اپنے اخبار میں ہر ہفتہ ایک غزل چھاپ سکتے ہیں۔

[2] یہ بتانا مشکل ہے کہ اُردو میں کب سے غالب تخلص اختیار کیا۔ لیکن دو چار برس کی بات قابل تسلیم نہیں۔ غالب گیارہ بارہ برس کی عمر میں شعر کہنے لگے تھے۔ گویا اُن کی شعر گوئی کا آغاز ۱۸۰۸-۰۹ء کے قریب ہوا اس کے بعد دس بارہ برس تک اسد تخلص رکھنے کی شہادتیں موجود ہیں بلکہ غالب تخلص اختیار کر لینے کے بعد بھی ضرورت کے موقع پر اسد لکھ جاتے تھے۔ بعض اوقات پورا نام "اسد اللہ خان"

کلام اور الیسا مزخرف؟ یہ قصّہ تمام ہُوا۔

وہ غزل جو تمھارے پاس پہنچ چکی ہے۔ چھاپنے سے پہلے ایک نقل اس کی میرزا میرزا حاتم علی مہر کو دے دینا۔ جس دن یہ میرا خط پہنچے، اسی دن وہ غزل نقل کر کے ان کو بھیج دینا۔

"دستنبو" کی خریداری کا حال معلوم ہوگیا۔ میرا بھی یہی گمان تھا کہ لاہور کے ضلع میں گئی ہوں گی۔ جناب میکلوڈ صاحب فنانشل کمشنر پنجاب نے بذریعہ صاحب کمشنر دہلی دہلی مجھ سے منگوائی تھی۔ ایک جلد ان کو بھی بھیج چکا ہوں۔ قصیدے میں نے دو لکھے ہیں۔ ایک اپنے مربیِ قدیم جناب فریڈرک ایڈمنسٹن صاحب بہادر کی تعریف میں اور ایک جناب منٹگمری صاحب بہادر کی مدح میں۔ ایک پچپن شعر کا ایک چالیس بیت کا اور پھر فارسی[1]۔ ان کو ریختہ کی غزلوں میں کیا چھاپو گے؟ جانے بھی دو۔ رہیں غزلیں سابق کی، وہ جو میرے ہاتھ آتی جائیں گی بھجواتا جاؤں گا۔ میاں، تمھاری جان کی قسم، نہ میرا اب ریختہ لکھنے کو جی چاہتا ہے، نہ مجھ سے کہا جاتا ہے۔ اس دو برس میں صرف وہ پچیس شعر بطریقِ قصیدہ تمھاری خاطر سے لکھ کر بھیجے تھے[2]۔ سوائے اس کے اگر میں نے کوئی ریختہ کہا ہوگا، تو گنہ گار۔ بلکہ فارسی غزل بھی واللہ نہیں لکھی۔ صرف دو قصیدے لکھے ہیں۔ کیا کہوں کہ دل و دماغ کا کیا حال ہے۔ پرسوں ایک خط تمھیں اور لکھ چکا ہوں، اب اس کا جواب نہ لکھنا۔ والدعا۔

چہار شنبہ۔ ۲۲ اپریل ۱۸۵۹ء

(۲۰)

برخوردار منشی شیونراین کو دعا پہنچے۔ خط تمھارا مع اشتہار کے پہنچا۔ یہاں کا

---

[1] صحیح یہ ہے کہ ایک چھیالیس شعر کا اور دوسرا اکتیس شعر کا۔

[2] یعنی وہ قصیدہ جو شیو نرائن کی فرمایش پر لکھا تھا اور خط [۱] میں درج ہے۔

حال یہ ہے کہ مسلمان امیروں میں تین آدمی: نواب حسن علی خاں[1]۔ نواب حامد علی خاں[2]، حکیم احسن اللہ خاں[3]، سو ان کا حال یہ ہے کہ روٹی ہے تو کپڑا نہیں۔ معہذا یہاں کی اقامت میں متذبذب۔ خدا جانے کہاں جائیں؟ کہاں رہیں؟ حکیم احسن اللہ خاں نے "آفتاب عالمتاب" کی خریداری کر لی ہے اب وہ مکرر[4] "حالات دربار شاہی" کیوں لیں گے؟ سوائے ساہوکاروں کے یہاں کوئی امیر نہیں ہے۔ وہ لوگ اس طرف کیوں توجہ کریں گے؟ تم ادھر کا خیال دل سے دھو ڈالو۔ رہا نام اس رسالے کا تاریخی جانے دو۔ "رستخیز ہند"، "غوغائے سپاہ"، "فتنۂ محشر"، ایسا کوئی نام رکھو۔ اب تم یہ بتاؤ کہ رئیس رام پور کے ہاں بھی تمہارا اخبار یا "معیار الشعرا" جاتا ہے یا نہیں؟ اب کے تمہارے "معیار الشعرا" میں میں نے یہ عبارت دیکھی تھی کہ امیر شاعر اپنی غزلیں بھیجتے ہیں۔ ہم کو جب تک ان کا نام و نشان معلوم نہ ہوگا، ہم ان کے اشعار نہ چھاپیں گے۔ سو میں تم کو لکھتا ہوں کہ یہ میرے دوست ہیں اور امیر احمد ان کا

---

[1] نواب نجابت علی خاں والیِ جھجر کے چھوٹے بیٹے، تین ہزار روپے ماہوار وظیفہ پاتے تھے۔

[2] اعتماد الدولہ میر فضل علی خاں وزیر شاہ اودھ کے بھانجے اور داماد تھے۔ فضل علی کی وفات پر حامد علی خاں دہلی چلے آئے۔ روپیہ خزانہ میں جمع کرا دیا۔ ساڑھے چار ہزار ماہانہ سود ملتا تھا۔ غدر کے بعد چودہ مہینے حوالات میں رہے۔ فروری ۱۸۵۹ء میں رہا ہوئے۔

[3] یہ مشہور طبیب تھے۔ اکبر شاہ ثانی کے عہد میں عروج پایا۔ غدر میں انگریزوں کے طرفدار بن گئے تھے اس وجہ سے لوگوں کی نظروں سے گر گئے۔ ۱۸۷۳ء میں بڑودہ میں فوت ہوئے۔

[4] اس خط سے ظاہر ہے کہ شیو نراین کے اخبار کا نام "آفتاب عالمتاب" تھا۔ اس کے ساتھ دربار شاہی کے حالات بھی چھپنے لگے تھے۔ نیز ایک ادبی رسالہ "معیار الشعرا" کے نام سے نکالا تھا جس میں شعرا کا کلام چھپتا تھا۔ یہ پانزدہ روزہ تھا۔ غدر کے حالات کے متعلق ایک الگ رسالہ نکالنے کی تجویز بھی جس کے لئے نام غالب نے تجویز کئے۔ آخر "بغاوت ہند" اس کا نام رکھا گیا۔ جیسا کہ خط ۲۲ سے ظاہر ہوتا ہے۔

نام ہے اور امیر[ہ] تخلص کرتے ہیں۔ لکھنؤ کے ذی عزّت باشندوں میں ہیں اور وہاں کے بادشاہوں کے روشناس اور مصاحب رہے ہیں اور اب وہ رام پور میں نواب صاحب کے پاس ہیں۔ میں ان کی غزلیں تمھارے پاس بھیجتا ہوں، میرا نام لکھ کر ان غزلوں کو چھاپ دو یعنی غزلیں غالب نے ہمارے پاس بھیجیں اور اس کے لکھنے سے ان کا نام اور ان کا حال معلوم ہُوا۔ نام اور حال وہ جو میں اُوپر لکھ آیا ہوں۔ اس کو اب کے "معیار الشعرا" میں چھاپ کر ایک دو ورقہ یا چہار ورقہ رام پور اُن کے پاس بھیج دو اور سرنامہ پر یہ لکھو کہ:

"در رام پور بر در دولت حضور رسیدہ بخدمت مولوی امیر احمد صاحب امیر تخلص برسد۔"

اور مجھ کو اس امر کی اطلاع دو کہ رام پور کو تمھارا اخبار جاتا ہے یا نہیں۔

مرسلہ یک شنبہ ۱۲ جون ۱۸۵۹ء غالب

(۲۱)

برخوردار نورِ چشم منشی شیو نراین کو دعا پہنچے۔ صاحب، میں تو منتظر تمھارے آنے کا تھا، کس واسطے کہ منشی بہاری لال بھائیوں میں ہیں ماسٹر رامچندر کے، انھوں نے پرسوں مجھ سے کہا تھا کہ منشی شیو نراین دو تین دن میں آیا چاہتے ہیں۔ آج صبح کو ناگاہ تمھارا خط آیا۔ اب مجھ کو اس کا پوچھنا تم سے ضرور ہُوا کہ آنے کی خبر تمھارے جھوٹ تھی یا ارادہ تھا اور کسی سبب سے موقوف رہا؟ بابو ہرگوبند سہائے کا میں بڑا احسان مند ہوں۔ حق تعالیٰ اس کوشش کے اجر میں ان کو عمر و دولت دے۔ سعادت مند اور نیک بخت آدمی ہیں۔ تمھاری خواہش کو اچھی طرح سمجھا

[ہ] اس سے مراد امیر مینائی مرحوم ہیں، جو اگرچہ اس زمانہ میں بھی بلند پایہ شاعر تھے، لیکن چنداں مشہور نہ تھے۔ لکھنؤ سے رام پور میں نواب یوسف علی خاں کے پاس پہنچ گئے تھے۔

نہیں۔ مصرع تم نے لکھا اور وہ چھاپا گیا ہزار پانسو دو ورقے چھپ گئے۔ اب جو مصرع اور کہیں سے بہم پہنچے گا وہ کس کام آئے گا؟ خود لکھتے ہو کہ پہلا جزو تم کو بھیجا ہے۔ صبر کرو، وہ جزو آنے دو۔ میں اس کو دیکھ لوں۔ یقین ہے کہ قلمی ہوگا۔ اس کو دیکھ کر اور مضامین کو سمجھ کر مصرع بھی تجویز کر دوں گا۔ مگر اتنا تم اور بھی لکھو کہ آیا یوں منظور ہے کہ اس مصرع کی جگہ اور مصرع لکھو یا یہی چاہتے ہو کہ یہ بھی رہے اور وہ بھی رہے؟ خط تمھارا آج آگیا ہے۔ پم فلٹ پاکٹ یا آج شام کو یا کل شام تک آجائے گا۔

سہ شنبہ ۔ ۲۰ جولائی ۱۸۵۹ء غالب

(۲۲)

برخوردار کو بعد دعا کے معلوم ہو: تمھارا خط پہنچا اور خط سے کئی دن پہلے رسالہ "بغاوت ہند" پہنچا۔ تمھارے تصمیم عزیمت سے میں خوش ہوا۔ اللہ اللہ اپنے بابنسی دھر کے پوتے کو دیکھوں گا۔ رسالہ "بغاوت ہند" ماہ بماہ اور "معیار الشعرا" ہر مہینے میں دو بار پہنچتا رہے۔ باقی گفتگو عند الملاقات ہورہے گی۔ اپنے شفیق دلی ماسٹر رامچندر صاحب کو تمھارے آنے کی اطلاع دی۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ جو رقعہ انھوں نے میرے رقعے کے جواب میں لکھا ہے، وہ تم کو بھیجتا ہوں۔ پڑھ لینا۔ اگر دستنبو تمیں باقی ہوں تو وہ اپنے ساتھ لے آنا۔

شنبہ ۲۳ جولائی ۱۸۵۹ء غالب

(۲۳)

میاں، یہ کیا معاملہ ہے؟ ایک خط اپنی رسید کا بھیج کر پھر تم چپکے ہو رہے۔ نہ "معیار الشعرا"[1]

---

[1] اس خط میں جا بجا معیار الاشعار چھپا ہے کیا یہ سمجھا جائے کہ غالب یا کاتب کا سہو تھا یا شیو نرائن نے رسالہ کا نام معیار الشعرا کے بجائے معیار الاشعار تجویز کر لیا تھا؟ میں نے معیار الاشعار کے بجائے معیار الشعرا بنا دیا ہے۔

"نہ بغاوت ہند" نہ میرے خط کا جواب، نہ ہنڈوی کی رسید۔ برخوردار نواب شہاب الدین خاں نے اگست سے دسمبر تک پنج ماہہ معیار الشعرا اور "بغاوت ہند" کا بھیجا ہے یعنی تین روپے بارہ آنے مجھ کو دیے اور میں نے ہنڈوی لکھوا کر وہ ہنڈوی اپنے خط میں لپیٹ کر تم کو بھیجی۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ خط پہنچا یا نہیں پہنچا؟ جب ان مطالب جزئی کا یہ حال ہے تو کتاب اور انگوبزی عرضی کا ابھی کیا ذکر ہے؟ خدا کے واسطے ان سب مقاصد کا جواب جدا جدا لکھو۔ آج اگست کی ۱۷- بدھ کا دن ہے۔ پہلا نمبر معیار الشعرا کا بھی نہیں آیا۔ یہ ہے کیا؟ مہر تمھاری کھدنی شروع ہو گئی ہے۔ اسی اگست کے مہینے میں تمھارے پاس پہنچ جائے گی۔ اچھا میرا بھائی اس خط کا جواب جلد پاؤں اور کتاب اور عرضی کا بھی اگر تقاضا کروں تو بعید نہیں۔ مگر آج شام تک اس خط کو رہنے دوں گا۔ اگر تمھارا خط یا "معیار الشعرا" یا "بغاوت ہند" یا کوئی لفافہ شام تک آیا تو اس خط کو پھاڑ ڈالوں گا، ورنہ کل صبح کو ڈاک میں بھجوا دوں گا۔ اپنے والد کو دعا اور اشتیاق دیدار کہہ دینا۔

مرقومہ چہارشنبہ ۱۷ اگست ۱۸۵۹ء وقت دوپہر غالب

(۲۶)

کیوں میری جان، تم نے خط نہ لکھنے کی قسم کھائی ہے یا لکھنا ہی بھول گئے ہو؟ شہر میں ہو یا نہیں ہو؟ تمھارے مطبع کا کیا حال ہے؟ تمھارا کیا طور ہے؟ تمھارے چچا کا مقدمہ کیونکر فیصل ہوا؟ میرا کام تم نے کس طرح درست کیا؟ کرو گے یا نہیں؟ "معیار الشعرا" کا پارسل پہنچ گیا۔ "بغاوت ہند" کا پارسل ابھی نہیں آیا۔ ان سب مطالب کا جواب لکھو اور شتاب لکھو۔

محررہ پنجشنبہ ۲۲ ستمبر ۱۸۵۹ء غالب

(۲۵)

میری جان،

دو جلدیں "بغاوت ہند" کی پرسوں میرے پاس پہنچیں۔ اس وقت برخوردار میرزا شہاب الدین خاں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک جلد ان کو دی۔ کل ایک پارسل اور میرے نام کا آیا۔ میں خوش ہوا کہ ولایت کی عرضی اور دستنبو کا پارسل ہوگا۔ دیکھا، تو وہی دو جلدیں بغاوت ہند کی ہیں۔ حیران رہ گیا کہ یہ کیا ہے؟ بظاہر اہتمام ارسال نے ازراہ سہو دوبارہ بھیج دی ہیں۔ چاہتا تھا کہ لفافہ بدل کر ڈبل ٹکٹ لگا کر بھیج دوں، پھر سوچا کہ پہلے تم کو اطلاع کروں۔ شاید یہیں کسی اور کو دلوا دو۔ بس اب تمہارے کہنے کا انتظار ہے۔ جو کہو سو کروں۔ کہو تم کو بھیج دوں۔ کہو کہیں اور تمہاری طرف سے بھیج دوں۔ میرے کسی کام کی نہیں۔ والدعا۔

مرقومہ ۲۰ اکتوبر ۱۸۵۹ء راقم اسداللہ

(۲۶)

برخوردار منشی شیونراین کو بعد دعا کے معلوم ہو: کیا میرے خط نہیں پہنچتے کہ جواب ادھر سے نہیں آتا؟ دو جلد "بغاوت ہند" کے زیادہ پہنچے ہیں۔ اس کے واسطے تم سے پوچھا گیا تھا، اس کا بھی تم نے جواب نہ لکھا۔ ولایت کی عرضی اور کتاب کے باب میں تو میں کچھ کہتا ہی نہیں، جو اس کا جواب مانگوں۔ کچھ مجھ سے خفا ہو گئے ہو تو ویسی کہو۔ یہ خط تم کو بیرنگ بھیجتا ہوں تا کہ تم کو تقاضہ معلوم ہو۔

اے لو، ایک اور بات سنو۔ تمہارا تو یہ حال کہ مجھ کو خط لکھنے کی گویا تم نے قسم کھائی ہے اور میری خواہش کہ نواب گورنر جنرل بہادر کی خبر، جو وہاں تم کو معلوم ہوا کرے، مجھ کو لکھا کرو۔ خصوصاً اکبرآباد میں آ کر جو کچھ واقع ہو وہ مفصل لکھو۔ آیا جناب لفٹنٹ گورنر بہادر بھی ساتھ آئیں گے یا جدا جدا آکر یہاں فراہم

ہو جائیں گے؟ دربار کی صورت، خیر خواہوں کے تقسیمِ انعام کی حقیقت، کوئی نیا بندوبست جاری ہو۔ اس کی کیفیت، یہ سب مراتب مجھ کو لکھا کرو۔ دیکھو، خبردار اس امر میں تساہل نہ کرنا۔ اب کیا سنتے ہو؟ لکھنو سے کہاں آئے ہیں؟ کانپور، فرخ آباد ہوتے ہوئے آگرے آئیں گے؟ کہاں کہاں کون رئیس ملے گا۔ لکھنو کے دربار کا حال جو کچھ سنا ہو وہ لکھو۔ اگرچہ یہاں لوگوں کے ہاں اخبار آتے رہتے ہیں اور میری بھی نظر سے گزر جاتے ہیں۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ تمھارے خط سے آگہی پاتا رہوں۔ تم جو لکھو گے مفصل اور منقح لکھو گے۔ یقین ہے کہ برادر زادۂ عزیز یعنی تمھارے والد ماجد نے مرزا یوسف علی خاں کے کام کی درستی لالہ جوتی پرشاد کی سرکار میں کر دی ہوگی۔ اس کی بھی اطلاع ضرور ہے۔

صبح چہار شنبہ ۲ نومبر ۱۸۵۹ء جواب کا طالب غالب

(۲۷)

برخوردار،

دو خط آئے اور آج یک شنبہ ۱۳ نومبر کو لفافہ اخبار آیا۔ یہ اودھ اخبار بھائی ضیاء الدین خاں کے ہاں آتا ہے اور وہ میرے پاس بھیج دیا کرتے ہیں۔ اس کی حاجت نہیں۔ اپنے اور میرے ٹکٹ کیوں برباد کرو۔ میرا مقصود اسی قدر ہے کہ فرخ آباد کے اخبار بہ سبب قرب کے وہاں معلوم ہوتے ہوں گے، جو سنو، وہ مجھ کو لکھو اور جب نواب معلیٰ القاب آگرے میں آ جائیں تو اپنا مشاہدہ مجھ کو لکھتے رہو۔ پس غرض اتنی ہی ہے۔ آج کا اخبار لفافہ بدل کر آج ہی بھیج دیتا ہوں اور دونوں کتابیں "بغاوت ہند" پرسوں بھیج چکا ہوں۔ تمھارے والد کی طرف سے مجھ کو بڑی تشویش ہے۔ دعا کر رہا ہوں۔ خدا میری دعا قبول کرے اور ان کو شفائے کامل دے۔ میری دعا ان کو پہنچا دینا۔ مرزا یوسف علی خاں عزیز کا

حال معلوم ہُوا۔ یہ خاندان اور ناز پروردہ آدمی ہیں۔ اُن کو جو راحت پہنچاؤ گے اور جو ان کی خدمت بجا لاؤ گے، اس کا خدا سے اجر پاؤ گے۔ زیادہ سوائے دعا کے کیا لکھوں۔

روز یک شنبہ ۱۳؍ نومبر ۱۸۵۹ء غالب

(۲۸)

برخوردار منشی شیو نرائن کو دعائے دوام دولت پہنچے۔ کل رات تمہارا خط پہنچا، دِل خوش ہُوا۔ باقر علی خاں اور حسین علی خاں یہ دونوں میرے پوتے ہیں اور تم بھی میرے پوتے ہو۔ چونکہ تم عمر میں بڑے ہو تو پہلے تم اور بعد تمہارے یہ۔ میں حسب الطلب نواب صاحب کے دوستانہ یہاں آیا ہوں اور اپنی صفائی بذریعہ ان کے گورنمنٹ سے چاہتا ہوں[1]۔ دیکھوں کیا ہوتا ہے۔ کتاب اور عرضی اوا سط ماہ جنوری میں ولایت کو روانہ کر کے یہاں آیا ہوں۔ چھ ہفتے میں جہاز پہنچتا ہے یقین ہے کہ پارسل ولایت پہنچ گیا ہوگا:

بہ بینیم کہ تا کردگار جہاں — دریں آشکارا چہ دارد نہاں

اپنے والد کو میری دعا کہہ دینا۔ میرزا یوسف علی خاں کو میری دعا کہنا اور کہنا کہ میں تمہاری فکر سے فارغ نہیں ہوں۔ اگر خدا چاہے تو کوئی راہ نکل آئے۔

سہ شنبہ۔ ۳؍ مارچ ۱۸۶۰ء غالب

(۲۹)

برخوردار اقبال آثار منشی شیو نراین کو بعد دُعا کے معلوم ہو کہ ایک نسخہ "بغاوت ہند" کا ایک دو ورقہ "معیار الشعرا" کا معرفت برخوردار مرزا

---

[1] یہ خط رام پور سے لکھا گیا تھا۔ جہاں غالب پہلی مرتبہ جنوری ۱۸۶۰ء میں گئے تھے اور دو مہینے رہ کر مارچ میں واپس آئے تھے۔ اس وقت پنشن بند تھی۔

شہاب الدین خاں کے پہنچا اور آج چہارشنبہ ۱۴-مارچ کی ہے کہ ایک نسخہ "بغاوتِ ہند" بھیجا ہوا تمھارا رام پور پہنچا۔ خدا تم کو جیتا رکھے۔ اب میں شنبہ کے دِن، ۱۷-مارچ کو دلّی روانہ ہوں گا۔ تم کو بطریقِ اطلاع لکھا ہے۔ اب بدستور ارسال خطوط دلّی کو رہے، یہاں نہ بھیجنا۔ ہاں بھائی، اِن دنوں میں برخوردار مرزا یوسف علی خاں وہاں آئے ہوئے ہیں[۱]۔ ان کو بلا کر میری دعا کہنا اور یہ کہنا کہ اچھا ہے دلّی چلے آؤ، وہاں جو مجھ سے ملوگے تو زبانی سب کام ہو رہے گا اور اگر وہ ہاترس گئے ہوں تو یہ رقعہ جو تمھارے کام کا ہے ایک کاغذ میں لپیٹ کر ٹکٹ لگا کر ہاترس کو شیخ کریم چوکیداروں کے دفعدار کے گھر کے پتے سے بھیج دینا ضرور ضرور

روانداشتہ چہارشنبہ ۱۴ مارچ ۱۸۶۰ء وقت دوپہر غالب

(۳۰)

میاں،

دیوان کے میرٹھ میں چھاپے جانے کی حقیقت سُن لو۔ تب کچھ کلام کرو۔ میں رام پور میں تھا کہ ایک خط پہنچا۔ سرنامہ پر لکھا تھا: عرضداشت "عظیم الدین احمد من مقام میرٹھ" واللہ باللہ اگر میں جانتا ہوں کہ عظیم الدین کون ہے اور کیا پیشہ رکھتا ہے۔ بہرحال پڑھا، معلوم ہُوا کہ ہندی دیوان اپنی سوداگری اور فائدہ اُٹھانے کے واسطے چھاپا چاہتے ہیں۔ خیر چُپ ہو رہا۔ جب میں رام پور سے

---

[۱] یوسف علی خاں عزیز کے آگرے پہنچنے کا ذکر غالب نے پہلے پہل ۲ نومبر ۱۸۵۹ء کے خط میں کیا تھا، یہ بھی لکھا تھا کہ شیونراین کے والد نے عزیز کے روزگار کی تلاش کا بندوبست کر دیا ہوگا۔ ۱۳-نومبر کے خط میں عزیز کے حالی خاندان ہونے کا ذکر ہے۔ یقیناً شیونراین کو معلوم ہوگا کہ عزیز کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ لیکن اس خط میں میرزا نے عزیز کا ذکر ایسے انداز میں کیا ہے کہ گویا شیونراین کو اس کے متعلق کچھ معلوم نہ تھا۔ اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔

میرٹھ آیا، بھائی مصطفیٰ خاں صاحب کے ہاں اترا۔ وہاں منشی ممتاز علی صاحب میرے دوست قدیم مجھ سے ملے۔ انھوں نے کہا کہ اپنا اُردو کا دیوان مجھ کو بھیج دیجیے گا۔ عظیم الدین ایک کتاب فروش اس کو چھاپا چاہتا ہے۔ اب تم سنو: دیوان ریختہ اتم واکمل کہاں تھا؟ ہاں میں نے غدر سے پہلے لکھوا کر نواب یوسف علی خاں بہادر کو رام پور بھیج دیا تھا۔ اب جو میں دلّی سے رام پور جانے لگا، تو بھائی ضیاء الدین خاں صاحب نے مجھ کو تاکید کر دی تھی کہ تم نواب صاحب کی سرکار سے دیوان اُردو لے کر، اس کو کسی کاتب سے لکھوا کر، مجھ کو بھیج دینا۔ میں نے رام پور میں کاتب سے لکھوا کر بسبیل ڈاک ضیاء الدین خاں کو دلّی بھیج دیا۔ آمدم بر سرِ مدعائے سابق۔ اب جو منشی ممتاز علی صاحب نے مجھ سے کہا تو مجھے یہی کہتے بن آئی: اچھا دیوان میں ضیاء الدین خاں سے لے کر بھیج دوں گا، مگر کاپی کی تصحیح کا ذمہ کون کرتا ہے؟ نواب مصطفیٰ خاں نے کہا کہ میں۔ اب کہو میں کیا کرتا، دلّی آ کر ضیاء الدین خاں سے دیوان لے کر ایک آدمی کے ہاتھ نواب مصطفیٰ خاں صاحب کو ایک خط بھیجا ہے اور اُن کو لکھا ہے۔ اگر چھاپا شروع نہ ہوا ہو تو نہ چھاپا جائے اور دیوان جلد میرے پاس بھیجا جائے۔ اگر دیوان آ گیا تو فوراً تمھارے پاس بھیج دوں گا۔ اور اگر وہاں کاپی شروع ہو گئی ہے تو میں ناچار ہوں۔ میرا کچھ قصور نہیں ہے۔ اگر سرگزشت کو بھی سن کر مجھ کو گنہ گار ٹھہراؤ، تو اچھا میرا بھائی، میری تقصیر معاف کیجیو۔ رمضان اور عید کا قصہ لگا ہوا ہے۔ یقین ہے کہ کاپی شروع نہ ہوئی ہو اور دیوان میرا میرے پاس آئے اور تم کو پہنچ جائے۔ ۱۹ یا ۲۰ جنوری ۱۸۶۰ء کو کتاب اور دونوں عرضیاں ولایت کو روانہ کر کے رام پور گیا ہوں۔ تین مہینے کی جہاز کی آمد و رفت ہے۔ سو گزر چکی ہے۔ خواہی اسی مہینے میں، خواہی آغازِ ماہِ آئندہ یعنی مئی میں جواب کے آنے کا مترصد ہوں۔ دیکھیے آئے یا نہ آئے۔ آئے تو خاطر خواہ آئے یا ایسا ہی سرسری آئے۔

اپریل ۱۸۶۰ء

(۳۱)

صاحب،

میں تمہارا گنہ گار ہوں۔ تمہاری کتاب میں نے دبا رکھی ہے۔ بڑی کوشش اور محنت سے وہاں اسے نہ چھپنے دیا اور منگوا لیا۔ آج، پیر کے دن، ۲۵ جون کو پارسل کی ڈاک میں روانہ کیا ہے۔ لو، اب میری تقصیر معاف کرو اور مجھ سے راضی ہو جاؤ اور اپنی رضامندی کی مجھ کو اطلاع دو۔ یہ کتاب یعنی دیوان ریختہ تم کو میں نے دے ڈالا۔ اب اس کے مالک تم ہو۔ میں نہیں کہتا کہ چھاپو، میں نہیں کہتا کہ نہ چھاپو۔ جو تمہاری خوشی ہو سو کرو۔ اگر چھاپو تو بیس جلد کا خریدار مجھ کو لکھ لو۔ اور اچھا، میرا میاں، ذرا[1] تصحیح کا بہت خیال رکھو۔

(۳۲)

میاں،

تمہاری باتوں پر ہنسی آتی ہے۔ یہ دیوان جو میں نے تم کو بھیجا ہے، اتم و اکمل ہے اور وہ کون سی دو چار غزلیں ہیں، جو میرزا یوسف علی خاں عزیز کے پاس ہیں اور اس دیوان میں نہیں؟ اس طرف سے آپ اپنی خاطر جمع رکھیں کہ کوئی مصرع میرا اس دیوان سے باہر نہیں۔ معہٰذا ان سے بھی کہوں گا اور وہ غزلیں اُن سے منگا کر دیکھ لوں گا۔

تصویر میری لے کر کیا کرو گے؟ بیچارہ عزیز کیونکر کھچوا سکے گا؟ اگر ایسی ہی ضرورت ہے تو مجھ کو لکھو۔ میں مصوّر سے کھچوا کر تم کو بھیج دوں۔ نہ نذر در کار نہ نیاز۔ میں تم کو اپنے فرزندوں کے برابر چاہتا ہوں اور شکر کی جگہ ہے کہ تم فرزند

---

[1] غالب "ذرا" کو ز سے لکھتے تھے۔ ہندوستانی اکیڈیمی کے مجموعہ خطوط میں اس خط کا جو فوٹو چھپا ہے۔ اس میں ذرا کو "ز" ہی سے لکھا ہے۔

سعادت مند ہو۔ خدا تم کو جیتا رکھے اور مطالب عالیہ کو پہنچاوے۔

سہ شنبہ ۳ر جولائی سنہ ۱۸۶۰ء غالبؔ

(۲۳)

میاں،

میں جانتا ہوں کہ مولوی میر نیاز علی صاحب نے وکالت اچھی نہیں کی۔ میرا مدعا یہ تھا کہ وہ تم پر اس امر کو ظاہر کریں کہ دلّی میں ہندی دیوان کا چھپنا پہلے اس سے شروع ہوا ہے کہ حکیم احسن اللہ خاں صاحب تمھارا بھیجا ہوا فرمہ مجھ کو دیں اور وہ جو میں نے یہاں کے مطبع میں چھاپنے کی اجازت دی تھی، یہ سمجھ کر دی تھی کہ اب تمھارا ارادہ اس کے چھاپنے کا نہیں۔ غور کرو، میرٹھ کے چھاپے خانے والے محمد عظیم[1] کس عجز و الحاح سے دیوان لیا تھا اور میں نے نظر تمھاری ناخوشی پر بہ جبر اس سے پھیر لیا۔ یہ کیوں کر ہو سکتا تھا کہ اور کو چھاپنے کی اجازت دوں؟ تم نے جو خط لکھنا موقوف کیا، میں سمجھا کہ تم خفا ہو۔ میں نے مولوی نیاز علی صاحب سے کہا کہ برخوردار شیو نرائن سے میری تقصیر معاف کروا دینا۔ بھائی خدا کی قسم میں تم کو اپنا فرزند دلبند سمجھتا ہوں۔ اس دیوان اور تصویر کا ذکر کیا ضرور ہے؟ رام پور سے وہ دیوان صرف تمھارے واسطے لکھوا کر لایا[2]۔

دلّی میں تصویر بہ ہزار جستجو بہم پہنچا کر مول لی اور دونوں چیزیں تم کو بھیج دیں وہ تمھارا مال ہے چاہو اپنے پاس رکھو، چاہو کسی کو دے ڈالو، چاہو پھاڑ کر

[1] خط نمبر ۳ میں اس کا نام عظیم الدین لکھا ہے۔

[2] یہ عجیب دعویٰ ہے کہ دیوان ضیاء الدین خاں نیّر کے کہنے پر کاتب سے نقل کرا کے رام پور سے بطریق ڈاک دلّی بھیجا تھا اور وہی نسخہ نیّر سے لے کر میرٹھ بھیجا تھا۔ خط نمبر ۱۳ میں ہے کہ اسے میرٹھ میں نہ چھپنے دیا اور واپس منگوا لیا۔ وہی نسخہ شیو نراین کو بھیجا۔ اب فرماتے ہیں کہ یہ دیوان شیو نراین کے واسطے لکھوا کر لائے تھے۔

پھینک دو۔ تم نے دستنبو کی جدول اور جلد بنوا کر ہم کو سوغات بھیجی تھی، ہم نے اپنی تصویر اور اُردو کا دیوان تم کو بھیجا۔ میرے پیارے دوست ناظر بنسی دھر کی تم یادگار ہو؎

اے گل بہ تو خورسندم تو بوے کسے داری

۱۰ر جنوری ۱۸۶۲ء خوشنودی کا طالب غالب

(۳۴)

برخوردار منشی شیو نرائن کو دعا کے بعد معلوم۔ تصویر پہنچی، تحریر پہنچی، سُنو میری عمر ستّر برس کی ہے اور تمھارا دادا میرا ہم عمر اور ہم شطرنج[1] باز تھا اور میں نے اپنے نانا صاحب خواجہ غلام حسین مرحوم سے سُنا کہ تمھارے پردادا صاحب کو اپنا دوست بتاتے تھے اور فرماتے تھے کہ میں بنسی دھر کو اپنا فرزند سمجھتا ہوں۔ غرض اس بیان سے یہ ہے کہ سو سوا سو برس کی ہماری تمھاری ملاقات ہے۔ پھر آپس میں نامہ و پیام کی راہ و رسم نہیں اور اس راہ و رسم کے مسدود ہونے کا حاصل یہ ہے کہ ایک کو دوسرے کے حال کی خبر نہیں۔ اگر تم کو میرے حال سے آگاہی ہوتی تو مجھ کو بسبیل ڈاک کبھی اکبر آباد نہ بلاتے۔

لو اب میری حقیقت سُنو۔ چھٹا مہینہ ہے کہ سیدھے ہاتھ میں ایک پھنسی نے پھوڑے کی صورت پیدا کی۔ پھوڑا پک کر، پھوٹ کر، ایک زخم، زخم کیا ایک غار بن گیا۔ ہندوستانی جرّاحوں کا علاج رہا۔ بگڑتا گیا۔ دو مہینے سے کالے ڈاکٹر کا علاج ہے۔ سلائیاں دوڑ رہی ہیں۔ استرے سے گوشت کٹ رہا ہے۔ بیس دن سے صورت افاقت کی نظر آنے لگی ہے۔

اب ایک اور داستان سُنو۔ غدر کے رفع ہونے اور دلّی کے فتح ہونے

---

[1] ساتھ کھیلنے والا۔

کے بعد میرا پنسن کھلا - چڑھا ہوا روپیہ وام دام ملا - آیندہ کو بدستور بے کم و کاست جاری ہوا، مگر لاٹ صاحب کا دربار اور خلعت جو معمولی و مقرری تھا مسدود ہوگیا - یہاں تک کہ صاحب سکوٹر بھی مجھ سے نہ ملے اور کہلا بھیجا کہ اب گورنمنٹ کو تم سے ملاقات کبھی منظور نہیں - میں فقیر متکبر، مایوس دائمی ہو کر اپنے گھر بیٹھ رہا اور حکام شہر سے بھی ملنا موقوف کر دیا - بڑے لارڈ صاحب کے ورود کے زمانے میں نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب بھی دلی میں آئے، دربار کیا، خیر، کرو، مجھ کو کیا؟ ناگاہ دربار کے تیسرے دن بارہ بجے چپراسی آیا اور کہا نواب لفٹنٹ گورنر نے یاد کیا ہے - بھائی یہ آخر فروری ہے اور میرا حال یہ ہے کہ علاوہ اس داہنے ہاتھ کے زخم کے سیدھی ران میں اور بائیں ہاتھ میں ایک ایک پھوڑا جدا ہے حاجتی میں پیشاب کرتا ہوں - اٹھنا دشوار ہے - بہرحال سوار (ہو کر) گیا - پہلے صاحب سکوٹر بہادر سے ملا، پھر نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا - تصوّر میں کیا، بلکہ تمنّا میں بھی جو بات نہ تھی، وہ حاصل ہوئی - یعنی عنایت سی عنایت، اخلاق سے اخلاق، وقت رخصت خلعت دیا اور فرمایا کہ یہ ہم تجھ کو اپنی طرف سے از راہ محبت دیتے ہیں اور مژدہ دیتے ہیں کہ لاٹ صاحب کے دربار میں بھی تیرا نمبر اور خلعت کھل گیا - انبالے جاؤ، دربار میں شریک ہو، خلعت پہنو، حال عرض کیا گیا - فرمایا - خیر، اور کبھی کے دربار میں شریک ہونا - اس پھوڑے کا بُرا ہو - انبالے نہ جا سکا - آگرے کیوں کر جاؤں؟ بابو ہرگوبند سہائے کو سلام - مضمون واحد

۳ مئی ۱۸۶۳ء غالب

منشی نبی بخش حقیر

منشی نبی بخش حقیر کے والد کا نام حسین بخش تھا۔ وہ غالب کے ہم وطن یعنی آگرے کے باشندے تھے اور میرا خیال ہے کہ پہلے سے ان کے ساتھ میرزا کے تعلقات تھے یا کم از کم شناسائی ضرور ہو گی تھی۔ حقیر علی گڑھ (کول) میں سرشتہ دار رہے پختگی علم و عقل کے زمانے میں روابط بہت بڑھ گئے اور وہ غالباً ۱۸۴۷ء میں میرزا سے ملنے دہلی آئے۔ میرزا ہی کے پاس ٹھہرے! ان کی سخن فہمی اور سخن سنجی کے متعلق میرزا نے تفتہ کو جو کچھ لکھا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حقیر اپنے عہد کے ممتاز افراد میں سے تھے۔ وہ لکھتے ہیں۔ میں حیران ہوں! اس فرزانہ یگانہ (منشی نبی بخش حقیر) کو کس درجے کی سخن فہمی اور سخن سنجی عنایت ہوئی ہے۔ میں شعر کہتا ہوں، شعر کہنا جانتا ہوں لیکن جب تک اس بزرگوار کو نہیں دیکھا تھا۔ نہیں سمجھا تھا کہ سخن فہمی کیا چیز ہے اور سخن فہم کس کو کہتے ہیں مشہور ہے کہ خدا نے حسن کے دو حصے کیے۔ آدھا یوسفؑ کو دیا اور آدھا تمام بنی نوع انسان کو۔ کچھ تعجب نہیں کہ فہمِ سخن اور ذوقِ معنی کے بھی دو حصے کیے گئے ہوں۔ آدھا منشی نبی بخش کے اور آدھا تمام دنیا کے حصے" میں آیا۔

غالباً ۱۸۵۸ء میں حقیر نے پنشن لی۔ باقی وقت آگرے میں گزارا اور ۱۸۶۰ء میں فوت ہوئے۔ ان کے بڑے بیٹے عبداللطیف صحافی بھی جانتے تھے۔ منشی ہرگوپال تفتہ اور میرزا حاتم علی بیگ مہر سے بھی حقیر کے دوستانہ روابط تھے۔

اُردوئے معلّیٰ میں حقیر اور ان کے صاحبزادے عبداللطیف کے نام صرف تین خط ہیں۔ حال میں حقیر کے نام کے خطوط کا ایک مجموعہ "نادراتِ غالب" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ جس میں دونوں کے نام چھہتر خط ہیں۔ حقیر شاعر بھی خاصے تھے۔ اگرچہ ان کا جو منتخب کلام مختلف تذکروں میں چھپا ہے،

وہ چنداں بلند نہیں - اُن کی سخن فہمی کے متعلق میرزا کا حُسن اعتقاد آخری دم تک قائم رہا - چنانچہ دوسرے خطوں میں بھی اس بات کا ذکر آیا ہے اور میرزا خود بھی اپنی غزلیں انہیں بھیجتے رہتے تھے - بعض خطوں میں لکھتے ہیں کہ :

حیف بر جانِ سخن گر بہ سخن داں نہ رسد

منشی نبی بخش مرحوم

(۱)

بھائی،

آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ حال معلوم ہوا۔ میاں کا عذر مقبول و مطبوع، حق تعالیٰ ان کو زندہ و تندرست اور خوش و خرم رکھے اور دولت و اقبال عطا کرے۔ بالفعل جناب مرزا حاتم علی صاحب کا خط آیا۔ اُنھوں نے جو صورت چھ کتابوں کی آرایش کی حسبِ تفریق سے ٹھہرائی ہے، وہ مجھ کو پسند آئی ہے۔ کل میں نے ان کو اجازت اسی طرح کی تو بین کی لکھ بھیجی ہے۔ حال تصحیح کا بہ تصریح آپ کو لکھ چکا ہوں۔ اسی پر عمل رہے۔ میں نے مرزا تفتہ کو کہ وہ غیاث اللغات کے بہت معتقد ہیں، اس امر کی اطلاع کر دی ہے۔

بھائی جان میں نے ایک قصیدہ جناب ملکہ معظمہ انگلستان کی مدح میں لکھا ہے ساٹھ شعر ہیں۔ چھ صفحے یعنی تین ورق پر چھپ کر دستنبو سے پہلے شیرازہ میں شامل کر دیے جائیں تو کتاب کو قصیدے سے عزت اور قصیدے کو کتاب کے سبب سے شہرت ہو جائے گی۔ کل جناب مرزا صاحب کو یہ خط لکھ چکا ہوں، یقین ہے کہ وہ بھی آپ سے کہیں گے اور آپ، مرزا صاحب، مرزا تفتہ اور منشی شیو نراین صاحب اس خواہش کو منظور اور اس قاعدے کو مقبول کریں گے اور جب باتفاق تم چاروں صاحب پسند کر دگے تو گویا باجلاس کونسل اس قانون کا اجرا منظور ہو جائے گا۔ امیدوار ہوں کہ اجرائے قانون سے پہلے مجھ کو منظوری کی اطلاع ہو جائے تاکہ مسودہ اس قصیدے کا بھیج دوں۔ مہتمم مطبع کو اگر کچھ تامل ہو، تو ہو، ورنہ بات آسان ہے۔ منشی عبد اللطیف کو دعا کہنا اور ان کے عذر کے مقبول ہونے کی ان کو

۱۔ یہ بجا و ... چھاپنے کا دیب

اطلاع دینا۔ بیگم کو دُعا پہنچے اور سب لڑکے بالوں کو میاں باقر علی اور حسین علی تم کو بندگی اور اپنے بھائی بہنوں کو علیٰ قدرِ مراتب بندگی، سلام، دعا کہتے ہیں۔

ہاں حضرت اب ایک امرِ مختصر کے واسطے جدا گانہ خط مرزا تفتہ کو کیا لکھوں؟ میری طرف سے دعا کہہ کر ان کو کہیے گا کہ اخبار گذشتہ کے اوراق مع خط مہتمم مطبع آفتاب عالمتاب، حکیم صاحب کو پہنچ گئے۔ کل وہ چار روپے کی ہنڈوی اور ان کے خط کا جواب روانہ کریں گے۔ آپ چتر بھوج سہائے سے کہہ دیجیے گا اور تاکید کر دیجیے گا کہ چار نمبر سابق کا منتخب کاتب سے نقل کروا کر جلد بھیجیں۔

بھائی، مجھ کو اس مصیبت میں کیا ہنسی آتی ہے کہ یہ ہم تم اور مرزا تفتہ میں مراسلت مکالمت ہو گئی ہے۔ روز باتیں کرتے ہیں۔ اللہ اللہ یہ دن بھی یاد رہیں گے۔ خط سے خط لکھے گئے ہیں۔ مجھ کو اکثر اوقات لفافے بنانے میں گزرتے ہیں۔ اگر خط نہ لکھوں گا تو لفافے بناؤں گا۔ غنیمت ہے کہ محصول آدھ آنہ ہے ورنہ باتیں کرنے کا مزا معلوم ہوتا۔ جو باتیں جواب طلب ہیں۔ اُن کا جواب طلب ہے

چار شنبہ ۲۲ ستمبر ۱۸۵۸ء۔

غالب

(۲)

بھائی،

میں تم کو اطلاع دیتا ہوں کہ آج میرے پاس لکھنؤ کے ایک پارسل کی رسید آگئی۔ دوسرا ابھی یقینی پہنچ گیا ہو گا۔ خاطر جمع رکھو۔ جناب آر نلڈ صاحب بہادر آج تشریف لے گئے۔ سُنتا ہوں کہ کلکتہ جائیں گے میم اور بچوں کو ولایت بھیج کر پھر آئیں گے۔ مجھ سے وہ سلوک کر گئے ہیں اور مجھ پر وہ احسان کر گئے ہیں کہ قیامت تک اُن کا شکرگزار رہوں گا۔ مرزا حاتم علی صاحب اگر آجائیں تو اُن کو میرا سلام کہنا مرزا تفتہ کو اگر کبھی خط لکھو تو میری دُعا کہنا۔

دوشنبہ۔ غرۂ ہم جنوری ۱۸۵۹ء

غالب

منشی عبداللطیف صاحب

صاحب،

آگے تمہارا ایک خط، پھر بارہ کتابوں اور ایک جنتری کا پارسل پہنچا۔ بعد اس کے کل ایک خط اور آیا۔ ریڈ صاحب کے وہاں آنے کا حال معلوم ہوا۔ آج ۶۔ دسمبر کی ہے۔ ۷۔ کو بموجب تمہارے لکھنے کے وہ وہاں سے جانے والے ہیں اور مجھ کو معلوم ہے کہ میرٹھ آئیں گے۔ دو دن کے بعد بمقام میرٹھ خط روانہ کروں گا۔ خاطر جمع رکھو۔ وہ صاحب مُہر جیسا لکھیں، مجھ کو اطلاع دینا۔ رہی تمہاری مُہر اس کا کچھ خیال نہ کرو۔ وہ جس طرح تم نے لکھا ہے بن جائے گی۔ مگر بھائی، ۱۸۵۸ء میں کے دن باقی رہے ہیں۔ آج ۶۔ دسمبر کی ہے۔ ۲۴، ۲۵ دن باقی رہے ہیں۔ ۱۸۵۹ء جنوری مہینے میں خدا چاہے تو کھُد جائے گی۔ تم میرے بجائے فرزند ہو، میرے بھتیجے ہو، جو تمہارا کام ہو، بے تکلف کہو۔ شرم کیا اور تکلیف کیوں؟ یہ مُہر کا کھُدنا کون سا کام ہے؟ میرزا حاتم علی صاحب ملیں تو میرا اسلام کہنا اور میرزا تفتہ کو خط لکھو تو میری سفارش لکھنا۔ وہ مجھ سے خفا ہو گئے ہیں اور خط نہیں لکھتے۔

۶ر دسمبر ۱۸۵۸ء غالب

مجروح، سرفراز حسین اور میرن

میر مہدی مجروح میر حسین نگار کے بیٹے تھے اور غالب کے عزیز ترین شاگردوں میں سے تھے۔ ہنگامۂ غدر میں دہلی کو چھوڑ کر پانی پت چلے گئے تھے پھر الور میں ملازم ہو گئے۔ لیکن بدقسمتی نے وہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ آخری زمانے میں نواب حامد علی خاں مرحوم والی رام پور کی نوازش سے کسی قدر اطمینان کا سامان میسر آ گیا تھا۔ ۱۳۱۶ھ ۱۸۹۸ء میں ان کا دیوان "مظہر معانی" کے نام سے مرتب ہوا تھا۔ اس کی جمع و ترتیب رفیق قدیم میر افضل علی عرف میرن نے کی تھی۔ جیسا کہ مظہر معانی کے دیباچے اور خاتمے میں مذکور ہے۔ یہ دیوان چھپا ہوا ملتا ہے۔

میر سرفراز حسین میر مجروح کے بھائی تھے۔ یہ بھی نوکری کرتے رہے۔ میرن صاحب کا اصلی نام میر افضل علی تھا۔ یہ مرثیہ پڑھتے تھے۔ غالب نے ایک مرتبہ میر سرفراز حسین اور میر افضل علی کو ایک تعارفی خط خانساماں علی بخش خاں کے نام دے کر رام پور بھیجا تھا لیکن یہ بچارے بے نیل مرام واپس آئے نواب یوسف علی خاں مرحوم کو اطلاع ملی تو انھوں نے اس بارے میں غالباً غالب سے استفسار کیا۔ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ میر سرفراز حسین نوکری پیشہ ہیں اور میرن صاحب مرثیہ خواں۔ میں نے اس غرض سے انھیں رام پور بھیجا تھا کہ محرم میں جہاں دس پانچ اور مرثیہ خواں مقرر ہوتے ہیں۔ میرن بھی مقرر ہو جائیں اور ریاست میں جہاں اور ملازم ہیں، وہاں میر سرفراز حسین جیسے ہوشیار اور کارگزار آدمی کو بھی نوکری مل جائے۔

بہر نوع اگر یہ دونوں میں سے ایک بھی جاتا تو بہتر تھا، نہ ہوا، بہتر۔ درحقیقت سفارش نہ تھی معرفت ہونا تھا۔ سفارش کرتا تو کیا میں آپ کو نہ لکھ سکتا تھا۔

ان کے دوستوں میں ایک صاحب نصیر الدین تھے جنھیں غالب شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے نام کی مناسبت سے کبھی کبھی "چراغ دہلی" لکھتے تھے۔ یہ شاہ محمد اعظم کی اولاد میں سے تھے۔ جو مولانا فخر الدین فخر عالم کے خلیفہ تھے۔ ایک صاحب حکیم میر اشرف علی تھے ان کا ذکر اکثر خطوں میں آیا ہے۔ میر سرفراز حسین کو غالب اکثر مجتہد العصر لکھتے تھے۔

(۱)

میاں،

آج یک شنبہ کا دن، ساتویں فروری ۱۸۵۸ء کی اور شاید بائیسویں جمادی الثانی (۱۲۷۴ھ) کی ہے۔ دوپہر کے وقت شیخ مشرف علی رہنے والے استاد حامد کے کوچہ کے میرے پاس آئے اور انھوں نے تمہارا خط لکھا ہوا ۵ جمادی الثانی کا دیا۔ ڈاک کا خط ہر گز مجھ تک نہیں پہنچا اور نہ میں شہر سے کہیں گیا۔ جہاں رہتا تھا وہیں ہوں۔ خدا جانے وہ خط مسترد کیوں ہوا۔ بھلا یہ ہو سکتا ہے کہ تمہارا خط آوے اور میں پھیر دوں؟ تم خود کہتے ہو کہ اس پر یہ لکھا ہوا آیا کہ مکتوب الیہ یہاں نہیں ہے۔ میں ہوتا اور یہ لکھتا کہ میں نہیں ہوں؟ آگرے اور الور اور کول سے برابر خط چلے آتے ہیں۔

تمھاری والدہ کا مرنا سن کر مجھ کو بڑا غم ہوا۔ خدا تم کو صبر دے اور اس عفیفہ کو بخشے۔ میرا حقیقی بھائی مرزا یوسف خاں دیوانہ بھی مر گیا۔

کیسا ہنسنا اور کہاں اس کا ملنا! یہاں جان کے لالے پڑے ہیں:

ہے موجزن اک قلزمِ خوں، کاش یہی ہو آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

اگر زندگی ہے اور پھر مل بیٹھیں گے تو کہانی کہی جائے گی۔ تم کہتے ہو کہ آیا چاہتا ہوں۔ اگر آؤ تو بے ٹکٹ کے نہ آنا۔ میر احمد علی صاحب کو لکھتے ہو کہ یہاں ہیں۔ مجھ کو نہیں معلوم کہ کہاں ہیں۔ مجھ سے ملتے تو اچھا کرتے۔ میں مخفی نہیں ہوں۔ روپوش نہیں ہوں۔ حکام جانتے ہیں کہ یہاں ہے، مگر نہ بازپرس و گیر و دار میں آیا ہوں، نہ خود اپنی طرف سے قصدِ ملاقات کا کیا ہے۔ بایں ہمہ ایمن بھی نہیں ہوں۔ دیکھیے انجام کار کیا ہے۔

نثر کیا لکھوں گا اور نظم کیا کہوں گا، وہ نثر جو تم دیکھ گئے ہو، وہی دو چار ورق اور بھی سیاہ کیے گئے ہیں۔ بھیجنا ممکن نہیں۔ جب آؤ گے اور مجھ کو جیتا پاؤ گے

تو دیکھ لوگے میکش[1] چین میں ہے، باتیں بناتا پھرتا ہے۔ سلطان جی، میں تھا۔ اب شہر میں آگیا ہے۔ دو تین بار میرے پاس بھی آیا۔ پانچ سات دن سے نہیں آیا۔ کہتا تھا کہ بی بی کو اور لڑکے کو بہرام پور، میر وزیر علی کے پاس بھیج دیا ہے۔ خود یہاں لوٹ کی کتابیں خریدتا پھرتا ہے۔ میرن[2] صاحب کی خیر و عافیت معلوم ہوئی۔ مگر نہ معلوم ہوا کہ وہاں مع قبائل ہیں یا تنہا ہیں۔ اگر تنہا ہیں تو قبائل کہاں ہیں؟

تمہارے چھوٹے بھائی کو تو میں جانتا ہوں کہ وہ یہاں ہیں اور اچھی طرح ہیں۔ بڑے بھائی کا حال کیوں نہ لکھا؟ یقین ہے کہ وہ تم یکجا ہو۔ گو ان کو ربط مجھ سے زیادہ نہیں لیکن فرزند ہونے میں تم اور وہ برابر ہو۔ خط بھیجنے میں تردّد نہ کرو۔ اور ڈاک میں بے ٹکٹ بھیجا کرو۔ زیادہ زیادہ۔

یک شنبہ ہفتم فروری ۱۸۵۸ء۔ وقت رسیدن نامہ غالب

(۲)

صاحب،

دو خط تمہارے بہ سبیل ڈاک آئے۔ کل دو پہر ڈھلے ایک صاحب اجنبی، سانولے سلونے، داڑھی منڈے، بڑی آنکھوں والے، تشریف لائے۔ تمہارا خط دیا۔ صرف ان کی ملاقات کی تقریب میں تھا۔ بارے ان سے اسم شریف پوچھا گیا، فرمایا: اشرف علی۔ قومیت کا استفسار ہوا۔ معلوم ہوا سیّد ہیں۔ پیشہ پوچھا۔ حکیم نکلے یعنی حکیم اشرف علی۔ میں اُن سے مل کر بہت خوش ہوا۔ خوب آدمی ہیں اور کام کے آدمی ہیں۔

کتنے اوچھے ہو "مصطلحات الشعرا"، "مصطلحات الشعراء"، بھائی، وہ کتاب

---

[1] میر احمد حسین میکش جنہیں بعد میں پھانسی ملی۔

[2] یعنی میر افضل عرف میرن

تمھاری ہے ۔ میں نے غصب نہیں کی ۔ میرے پاس مستعار ہے ۔ دیکھ چکوں گا، بھیج دوں گا۔ تقاضا کیوں کرو؟ میاں محمد افضل تصویر کھینچ رہے ہیں ۔ جلدی نہ کرو ۔ دیر آید درست آید ۔ سرفراز حسین اور میرن صاحب اور میر نصیر الدین کو دعائیں

صبح چہار شنبہ ہفتم ۱۲۷۵ھ رمضان ہشتم مارچ ۱۸ سنہ ۱ غالب

(۲)

کیوں یار کیا کہتے ہو ۔ ہم کچھ آدمی کام کے ہیں یا نہیں؟ تمھارا خط پڑھ کر دو سو بار یہ شعر پڑھا:

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک آتشِ شوق تیز تر گردد

کلو کو مولوی مظہر علی صاحب کے پاس بھیج کر کہلا بھیجا کہ آپ کہیں جاییے گا نہیں، میں آتا ہوں ۔ بھلا بھائی، اچھی حکمت کی ۔ کیا وہ میرے باپ کے نوکر تھے کہ میں اُن کو بلاتا؟ انھوں نے جواب میں کہلا بھیجا کہ آپ تکلیف نہ کریں، میں حاضر ہوتا ہوں ۔ دو گھڑی کے بعد وہ آئے ۔ ادھر کی بات، ادھر کی بات ۔ کوئی انگریزی کاغذ دکھایا، کوئی فارسی خط پڑھوایا ۔ "اجی ۔ کیوں حضرت! آپ میرن صاحب کو نہیں بلاتے؟" صاحب ۔ میں تو ان کو لکھ چکا ہوں کہ تم چلے آؤ اور ایک مقام کا ان کو پتہ لکھا ہے کہ وہاں ٹھہر کر مجھ کو اطلاع کرو، میں شہر میں بلا لوں گا ۔" "صاحب: اب وہ ضرور آئیں گے" آخر کار، اُن سے اجازت لے کر اب تم کو لکھتا ہوں کہ ان سے مختصر یہ کہہ دو کہ "بھائی یہ تو مبالغہ ہے کہ روٹی وہاں کھاؤ تو پانی یہاں پیو ۔ یہ کہتا ہوں کہ

۱؎ اس تاریخ میں دو غلطیاں ہیں ۔ جن میں سے میرے اندازے کے مطابق ایک خود غالب سے سرزد ہوئی دوسری کاتب یا ناقل سے ۔ ۷، رمضان ۱۲۷۵ھ کو دن یقیناً چہار شنبہ تھا ۔ غالب نے اس کے ساتھ انگریزی تاریخ "بیستم" لکھی تھی ۔ کاتب یا ناقل نے اسے ہشتم بنا دیا ۔ مہینہ مارچ کا نہیں ۔ اپریل کا ہونا چاہیے ۔ یہ غلطی غالباً خود غالب سے ہوئی ۔

عید وہاں کرو تو باسی عید یہاں کرو۔

میرا حال سنو کہ بے رزق جینے کا ڈھب مجھ کو آگیا ہے۔ اِس طرف سے خاطر جمع رکھنا۔ رمضان کا مہینہ روزے کھا کھا کر کاٹا، آیندہ خدا رازق ہے۔ کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے۔ بس صاحب جب ایک چیز کھانے کو ہوئی، اگرچہ غم ہی ہو تو پھر کیا غم ہے؟

میر سرفراز حسین کو میری طرف سے گلے لگانا اور پیار کرنا۔ میر نصیرالدین کو دعا اور شفیع احمد صاحب کو اور میر احمد علی صاحب کو سلام کہنا۔ میرن صاحب کو نہ سلام نہ دعا۔ یہ خط پڑھا دو اور اِدھر کو روانہ کرو۔

کیا خوب بات یاد آئی ہے، کیوں وہ شہر سے باہر ٹھہریں؟ اور کیوں کسی کے بلانے کی راہ دیکھیں؟ شکرم میں، کرانچی میں، چھپے ہیں یعنی ڈاک میں آئیں۔ بلی ماروں کے محلے میں میرے مکان پر آ اتر پڑیں۔ میرزا قربان علی بیگ کے مکان میں مولوی مظہر علی رہتے ہیں۔ میرے اِن کے مسکن میں ایک میر خیراتی کی حویلی درمیان ہے۔ ڈاک کو زنہار کوئی نہیں روکتا۔ یہ صلاح تو ایسی ہے کہ اگر اس خط کے پہنچتے ہی چل دیں تو بھی عید یہیں کریں۔

غالب

مئی ۱۸۵۸ء

(۴)

خوبی دین و دنیا روزی باد۔ میر اشرف علی نے تمہارا خط دیا۔ وہ جو تم نے لکھا تھا کہ تیرا خط میرے نام کا میرے ہمنام کے ہاتھ جا پڑا۔ صاحب قصور تمہارا ہے۔ کیوں ایسے شہر میں رہتے ہو۔ جہاں دوسرا میر مہدی بھی ہو۔ مجھ کو دیکھو کہ میں کب سے دلی میں رہتا ہوں۔ نہ کوئی اپنا ہم نام ہونے دیا نہ کوئی اپنا ہم عرف بننے دیا، نہ ہم تخلص بہم پہنچایا۔ فقط

پنسن کی صورت یہ ہے کہ کوتوال سے کیفیت طلب ہوئی۔ اس نے اچھی لکھی۔ کل ہفتے کے دن ساتویں اگست کی مجھ کو اجرٹن صاحب بہادر نے بلایا۔ کچھ سہل سوال مجھ سے کیے۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تنخواہ ملے۔ تردّد اگر ہے تو اس میں ہے کہ پندرہ مہینے پچھلے بھی ملتے ہیں یا صرف آیندہ کو مقرر ہوئی ہے۔

غلام فخر الدین خاں کی دو ایک روبکاریاں ہوئی ہیں۔ صورت اچھی ہے خدا چاہے تو رہائی ہو جائے۔

صاحب، ہم نے گھبرا کر اس تحریر فارسی[1] کو تمام کیا، دفتر بند کیا اور یہ لکھ دیا کہ یکم اگست ۱۸۵۸ء تک میں نے پندرہ مہینے کا حال لکھا اور آیندہ لکھنا موقوف کیا۔ تم کو آگے اس سے لکھا تھا کہ تم اپنے اوراق کا فقرہ اخیر لکھ بھیجو۔ اب پھر تم کو لکھا جاتا ہے کہ جلد لکھو تا کہ میں اس کے آگے کی عبارت تم کو لکھ کر بھیج دوں۔ ہاں صاحب میر اشرف علی صاحب بھی یہی فرماتے تھے کہ میر سرفراز حسین پانی پت آیا چاہتے ہیں۔ اگر آ جائیں تو مجھ کو اطلاع کرنا۔

۸ اگست ۱۸۵۹ء غالب

(۵)

میاں،

تم کو پنسن کی کیا جلدی ہے؟ ہر بار پنسن کو کیوں پوچھتے ہو؟ پنسن جاری ہو اور میں تم کو اطلاع نہ دوں؟ ابھی تک کچھ حکم نہیں دیکھوں کیا حکم ہو اور کب ہو؟ میرن صاحب جے پور پہنچے۔ تم شاہ پور ہی بتاتے ہو۔ شاید سچ یہی ہو۔ ہاں میر محمود علی اور یہ، میر بدہ اور ابو الفضل تو تھے، مگر دیکھا چاہیے درخت جگہ سے اکھڑ کر بدشواری جمتا ہے۔ خلاصہ میری فکر کا یہ ہے کہ اب بچھڑے ہوئے یار کہیں قیامت ہی کو

---

[1] یہ اشارہ دستنبو کی طرف ہے۔

جمع ہوں تو ہوں۔ سو وہاں کیا خاک جمع ہوں گے۔ سُنی الگ، شیعہ الگ، نیک جُدا، بد جُدا۔ میر سرفراز حسین کو دُعا۔ میر نصیر الدین کو پہلے بندگی، پھر دُعا۔ کتاب کا نام "دستنبو" رکھا گیا۔ آگرے میں چھاپی جاتی ہے۔ تم سے تمھارے ہاتھ کے اوراق لکھے لوں گا۔ تب ایک کتاب تم کو دوں گا۔

روز ورود نامہ، پنجشنبہ ۷ ستمبر ۱۸۵۸ء — از غالب

(۶)

سیّد صاحب،

تمھارے خط کے آنے سے وہ خوشی ہوئی جو کسی دوست کے دیکھنے سے ہو۔ لیکن زمانہ وہ آیا ہے کہ ہماری قسمت میں خوشی ہی نہیں۔ خط سے معلوم ہوا تو کیا معلوم ہوا کہ ڈھائی سو روپے، ان دنوں میں ڈھائی روپے بھی بھاری ہیں۔ ڈھائی سو کیسے؟ سبحان اللہ۔ باوجود اس تہی دستی کے پھر بھی کہنا پڑتا ہے کہ روپے گئے بلا سے، آبرو بچی۔ اب میر سرفراز حسین کو چاہیے کہ الور چلے جائیں۔ شاید نئے بندوبست میں کوئی صورت نوکری کی نکل آئے۔ میری دعا کہو اور یہ کہو کہ اپنا حال اور اپنا قصہ اپنے ہاتھ سے مجھ کو لکھیں۔ پنشن کا حال کچھ معلوم ہوا ہو تو کہوں۔ حاکم، خط کا جواب نہیں لکھتا۔ عملے میں ہر چند تفحص کیجیے کہ ہمارے خط پر کیا حکم ہوا، کوئی کچھ نہیں بتاتا۔ بہ ہر حال اِتنا سُنا ہے اور دلائل اور قرائن سے معلوم ہوا ہے کہ میں بے گناہ قرار پایا ہوں اور ڈپٹی کمشنر بہادر کی رائے میں پنشن پانے کا استحقاق رکھتا ہوں۔ پس اس سے زیادہ نہ مجھے معلوم، نہ کسی کو خبر۔

میاں، کیا باتیں کرتے ہو؟ میں کتابیں کہاں سے چھپواتا؛ روٹی کھانے کو نہیں۔ شراب پینے کو نہیں۔ جاڑے آتے ہیں، لحاف توشک کی فکر ہے۔ کتابیں کیا چھپواؤں گا؟ منشی امید سنگھ اندور والے دلّی آئے تھے۔ سابقہ معرفت مجھ

سے نہ تھا۔ ایک دوست ان کو میرے گھر لے آیا۔ انھوں نے وہ نسخہ دیکھا چھپوانے کا قصد کیا۔ آگرے میں میرا شاگرد رشید منشی ہرگوپال تفتہ تھا۔ اُس کو میں نے لکھا۔ اُس نے اس اہتمام کو اپنے ذمہ لیا۔ مسودہ بھیجا گیا۔ آٹھ آنہ فی جلد قیمت ٹھیری، پچاس جلدیں منشی اُمید سنگھ نے لیں۔ پچیس روپے چھاپے خانے میں بطور ہنڈوی بھجوا دیے۔ صاحب مطبع نے بشمول سعی منشی ہرگوپال تفتہ چھاپنا شروع کیا۔ آگرے کے حکام کو دکھایا۔ اجازت چاہی۔ حکام نے بکمال خوشی اجازت دی۔ پانسو جلد چھاپی جاتی ہے۔ اس پچاس جلد میں شاید پچیس جلد منشی اُمید سنگھ مجھ کو دیں گے۔ میں عزیزوں کو بانٹ دوں گا۔ پرسوں خط تفتہ کا آیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک فرمہ چھپنا باقی رہا ہے۔ یقین ہے کہ اسی اکتوبر میں قصہ تمام ہو جائے۔ بھائی میں نے ۱۱۔ مئی ۱۸۵۷ء سے اکیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک کا حال لکھا ہے اور خاتمہ میں اس کی اطلاع دے دی ہے۔ امین الدین خاں کو جاگیر ملنے کا حال اور بادشاہ کی روانگی کا حال کیونکر لکھتا؟ ان کو جاگیر اگست میں ملی، بادشاہ اکتوبر میں گئے۔ کیا کرتا اگر تحریر موقوف نہ کرتا؟ منشی اُمید سنگھ اندور جانے والے تھے۔ اگر ختم کر کے مسودہ اُن کے سامنے آگرے نہ بھیج دیتا تو پھر چھپواتا کون؟

(۷)

بھائی،

ایک خط تمھارا پہلے پہنچا اور ایک خط کل آیا۔ پہلے خط میں کوئی امر جواب طلب نہ تھا، اگرچہ کل کے خط میں بھی صرف کتابوں کی رسید تھی، لیکن چونکہ دو امر لکھنے کے لائق تھے، اس واسطے لفافہ تمھاری پسند کا تمھاری نذر کرنا پڑا۔ پہلا امر یہ ہے کہ آج میر نصیر الدین دوپہر کو میرے پاس آئے تھے۔ اُن کو دیکھ کر دل خوش ہوا۔ تم نے بھی خط میں لکھا تھا کہ میر سرفراز حسین الور گئے تھے اور میر نصیر الدین بھی کہتے تھے

کہ میں اور وہ ایک دِن پانی پت سے چلے۔ وہ ادھر گئے۔ میں ادھر آیا۔ ظاہراً پارسل کے پہنچنے سے پہلے وہ روانہ ہوئے ہیں۔ اُن کی کتاب رہ گئی۔ اب ان تک کیوں کر پہنچے گی۔ خدا خیر کرے۔

میاں لڑکے، سُنو میر نصیر الدین اولاد میں سے ہیں شاہ محمد اعظم صاحب کے؛ وہ خلیفہ تھے مولوی فخر الدین صاحب کے اور میں مرید ہوں اس خاندان کا۔ اس واسطے میر نصیر الدین کو پہلے بندگی لکھتا ہوں اور پھر تمھارے علاقہ سے دُعا۔ صوفی صافی ہوں اور حضراتِ صوفیہ حفظِ مراتب ملحوظ رکھتے ہیں:

گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی

یہ جواب ہے تمھارے اس سوال کا کہ جو پہلے خط میں تم نے لکھا تھا۔ اب کے خط میں تم نے میرن صاحب کی خیر و عافیت کیوں نہ لکھی؟ یہ بات اچھی نہیں۔ میں تو ڈر گیا کہ اگر تمھارے خط میں ان کو دعا سلام لکھوں گا تو اُن سے تم کاہے کو کہو گے پیرزادہ صاحب یعنی میر نصیر الدین نے اُن کی بندگی مجھ سے کہی ہے۔ خدا کے واسطے میری دعا اُن سے کہہ دینا۔

(۸)

واہ واسید صاحب، تم تو بڑی عبارت آرائیاں کرنے لگے، نثر میں خود نمائیاں کرنے لگے۔ کئی دن سے تمھارے خط کے جواب کی فکر میں ہوں۔ مگر جاڑے نے بے حس و حرکت کر دیا ہے۔ آج جو بہ سبب ابر کے وہ سردی نہیں، تو میں نے خط لکھنے کا قصد کیا ہے، مگر حیران ہوں کہ کیا سحر سازی کروں۔ بھائی، تم اردو کے مرزا قتیل بن گئے ہو۔ اردو بازار میں نہر کے کنارے رہتے رہتے رود نیل بن گئے ہو۔ کیا قتیل کیا رود نیل، یہ سب ہنسی کی باتیں ہیں۔ لو سُنو، اب تمھاری دوستی کی باتیں ہیں۔

چوک میں بیگم کے باغ کے دروازے کے سامنے حوض کے پاس جو کنواں تھا، اس میں سنگ و خشت و خاشاک ڈال کر بند کر دیا۔ بلّی ماروں کے دروازہ کے پاس کئی دکانیں ڈھا کر راستہ چوڑا کر لیا۔ شہر کی آبادی کا حکم، خاص و عام، کچھ نہیں، پنسن داروں سے حاکموں کا کام کچھ نہیں۔ تاج محل، مرزا قیصر، مرزا جواں بخت کے سالے ولایت علی بیگ جے پوری کی زوجہ، ان سب کی الہ آباد سے رہائی ہو گئی ہے۔ بادشاہ، میرزا جواں بخت، میرزا عباس شاہ، زینت محل کلکتہ پہنچے اور وہاں سے جہاز پر چڑھائی ہو گی۔ دیکھیے کیمپ میں رہیں یا لندن جائیں۔ خلق نے از روے قیاس، جیسا کہ دلّی کے خبر تراشوں کا دستور ہے، یہ بات اڑا دی، سو سارے شہر میں مشہور ہے کہ جنوری سال ۱۸۵۹ء میں لوگ عموماً شہر میں آباد کیے جائیں گے اور پنسن داروں کو جھولیاں بھر بھر کر روپے دیے جائیں گے۔ خیر آج بدھ کا دن ۲۲ دسمبر کی ہے، اب کے شنبہ کو بڑا دن اور اگلے شنبہ کو جنوری کا پہلا دن ہے، اگر جیتے ہیں تو دیکھ لیں گے۔ کہ کیا ہوا۔ تم اس کا جواب لکھو اور شتاب لکھو۔

میری جان سرفراز حسین تم کیا کر رہے ہو اور کس خیال میں ہو اور آیندہ عزیمت کیا ہے؟ میر نصیر الدین کو صرف دعا اور اشتیاق دیدار۔ میرن صاحب کہاں ہیں؟ کوئی جائے اور بلا لائے "حضرت، آیئے، السلام علیکم، مزاج مبارک، کہیے مولوی مظہر علی نے آپ کے خط کا جواب بھیجا یا نہیں؟ اگر بھیجا ہو تو کیا لکھا؟ میں جانتا ہوں کہ میر اشرف علی صاحب اور میر سرفراز علی کم، اور یہ ستم پیشہ میر مہدی بہت آپ کی جناب میں گستاخیاں کرتے ہیں۔ کیا کروں؟ میں کہیں، تم کہیں۔ وہاں ہوتا تو دیکھتا کہ کیوں کر تم سے بے ادبیاں کر سکتے۔ انشاء اللہ تعالیٰ جب ایک جا ہوں گے، انتقام لیا جائے گا۔ ہے ہے کیوں کر ایک جا ہوں گے۔ دیکھیے زمانہ اور کیا دکھاتا ہے۔ اللہ، اللہ، اللہ۔

بدھ۔ ۲۲، دسمبر ۱۸۵۸ء غالب

(۹)

سید صاحب،

نہ تم مجرم، نہ میں گنہ گار۔ تم مجبور، میں ناچار۔ لو اب کہانی سنو، میری سرگذشت میری زبانی سنو۔ نواب مصطفےٰ خاں بہ میعاد سات برس کے قید ہو گئے تھے، سو ان کی تقصیر معاف ہوئی اور ان کو رہائی ملی، صرف رہائی کا حکم آیا ہے۔ جہانگیرآباد کی زمینداری اور دلّی کی املاک اور پنشن کے باب میں ہنوز کچھ حکم نہیں ہوا۔ ناچار وہ رہا ہو کر میرٹھ ہی میں ایک دوست کے مکان میں ٹھہرے ہیں۔ میں بہ مجرد استماع اس خبر کے ڈاک میں بیٹھ کر میرٹھ گیا۔ ان کو دیکھا۔ چار دن وہاں رہا، پھر ڈاک میں اپنے گھر آیا۔ تاریخ آنے جانے کی یاد نہیں، مگر ہفتہ کو گیا، منگل کو آیا۔ آج بدھ دوم فروری ہے۔ مجھ کو آئے ہوئے نواں دن ہے۔ انتظار میں تھا کہ تمھارا خط آئے تو اس کا جواب لکھا جائے۔ آج صبح کو تمھارا خط آیا۔ دوپہر کو میں جواب لکھتا ہوں: روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے   کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

میرٹھ سے آکر دیکھا کہ یہاں بڑی شدّت ہے اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں ہے۔ لاہوری دروازے کا تھانے دار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھتا ہے۔ جو باہر سے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے، اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے ہاں سے پانچ پانچ بید لگتے ہیں یا دو روپے جرمانہ لیا جاتا ہے۔ آٹھ دن قید رہتا ہے۔ اس سے علاوہ سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو، کون بے ٹکٹ مقیم ہے اور کون ٹکٹ رکھتا ہے۔ تھانوں میں نقشے مرتب ہونے لگے۔ یہاں کا جمعدار میرے پاس بھی آیا۔ میں نے کہا۔ بھائی! تو مجھے نقشے میں نہ رکھ، میری کیفیت کی عبارت الگ لکھ۔ عبارت یہ کہ اسداللہ خاں پنشن دار ۱۸۵۰ء سے حکیم پٹیالے والے کے بھائی کی حویلی

ہیں رہتا ہے۔ نہ کالوں کے وقت میں کہیں گیا، نہ گوروں کے زمانے میں نکلا۔ اور نکالا گیا۔ کرنل برون صاحب بہادر کے زبانی حکم پر اس کی اقامت کا مدار ہے۔ اب تک کسی حاکم نے وہ حکم نہیں بدلا۔ اب حاکم وقت کو اختیار ہے۔ پرسوں یہ عبارت جمعدار نے محلے کے نقشے کے ساتھ کوتوالی بھیج دی۔ کل سے یہ حکم نکلا کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان دکان کیوں بناتے ہیں؟ جو مکان بن چکے ہیں۔ انھیں ڈھا دو اور آیندہ کی ممانعت کا حکم سنا دو اور یہ بھی مشہور ہے کہ پانچ ہزار ٹکٹ چھاپے گئے ہیں۔ جو مسلمان شہر میں اقامت چاہے، بقدر مقدور نذرانہ دے۔ اس کا اندازہ قرار دینا حاکم کی رائے پر ہے۔ روپیہ دے اور ٹکٹ لے۔ گھر برباد ہو جائے، آپ شہر میں آباد ہو جائے۔ آج تک یہ صورت ہے، دیکھیے شہر کے بسنے کی کون مہورت ہے؟ جو رہتے ہیں وہ بھی اخراج کیے جاتے ہیں یا جو باہر پڑے ہوئے ہیں وہ شہر میں آتے ہیں؟ الملک للہ والحکم للہ

نورچشم میر سرفراز حسین اور برخوردار میر نصیرالدین کو دعا اور جناب میرن صاحب کو سلام بھی اور دعا بھی۔ اس میں سے جو وہ چاہیں قبول کریں۔

۲ ر فروری ۱۸۵۹ء غالب

(۱۰)

میاں،

کیوں تعجب کرتے ہو یوسف مرزا کے خطوط نہ آنے سے؟ وہ وہاں اچھی طرح ہے۔ حاکموں کے ہاں آنا جانا نوکری کی تلاش میں، حسین مرزا صاحب بھی وہیں ہیں۔ وہاں کے حکام سے ملتے ہیں۔ وہاں پنسن کی درخواست کر رہے ہیں۔ ان دونوں صاحبوں کے ہر ہفتے میں ایک دو خط مجھ کو آتے ہیں، جواب بھیجتا ہوں۔ بھائی، لکھنؤ میں وہ امن وامان ہے کہ نہ ہندوستانی عملداری میں ایسا امن تھا

امان ہوگا، نہ اس فتنہ و فساد سے پہلے انگریزی عملداری میں یہ چین ہوگا۔ امرا اور شرفا کی حکام سے ملاقاتیں، بقدرِ رتبہ تعظیم و توقیر، پنسن کی تقسیم علی العموم، آبادی کا حکم عام۔ لوگوں کو کمال لطف اور نرمی سے آباد کرتے جاتے ہیں

اور ایک نقل سُنو۔ وہاں کے صاحب کمشنر بہادر اعظم نے جو دیکھا کہ عملے میں ہنود بھرے ہوئے ہیں، اہل اسلام نہیں، ہنود کو اور علاقوں پہ بھیج دیا اور ان کی جگہ سب مسلمانوں کو بھرتی کیا۔ یہ آفت تو دلی پہ ٹوٹ پڑی ہے۔ لکھنؤ کے سوا اور شہروں میں عملداری کی وہ صورت ہے، جو غدر سے پہلے تھی۔ اب یہاں ٹکٹ چھاپے گئے ہیں۔ میں نے بھی دیکھے۔ فارسی عبارت یہ ہے: "ٹکٹ آبادی درونِ شہر دہلی بشرطِ ادخال جرمانہ" مقدار روپیہ کی حاکم کی رائے پر ہے۔ آج پانچ ہزار کا ٹکٹ چھپ چکا ہے۔ کل اتوار یوم التعطیل ہے۔ پرسوں دوشنبہ سے دیکھیے یہ کاغذ کیونکر تقسیم ہوں۔

یہ کیفیت عموماً شہر کی ہے۔ خصوصاً میرا حال سُنو: بائیس مہینے کے بعد پرسوں کوتوال کا حکم آیا ہے کہ اسد اللہ خاں پنسن دار کی کیفیت لکھو کہ وہ بے مقدور اور محتاج ہے یا نہیں۔ کوتوال نے موافق ضابطے کے مجھ سے چار گواہ مانگے ہیں۔ سو کل چار گواہ کوتوالی چبوترے جائیں گے اور میری بے مقدوری ظاہر کر آئیں گے۔ تم کہیں یہ نہ سمجھنا کہ بعد ثبوت مفلسی چڑھا ہوا روپیہ مل جائے گا اور آئندہ کو پنسن جاری ہو جائے گا۔ نہ صاحب، یہ تو ممکن ہی نہیں۔ بعد ثبوت افلاس مستحق ٹھہروں گا۔ چھ مہینے یا برس دن کا روپیہ علی الحساب پاؤں گا۔

میر صاحب جو بلائے گئے ہیں، اس طلب کے جواب میں بھی کوئی نہیں لکھتے کہ ٹکٹ میرے نام کا حاصل کر کے بھیج دو تو میں آؤں۔ دیکھو اب دس پانچ دن میں سب حال کھلا جاتا ہے۔ میر سرفراز حسین کو دعا اور میری طرف سے گلے لگانا اور

اور پیار کہنا۔ میر نصیر الدین کو دعا کہنا اور میرن صاحب کو مبارکباد کہنا۔
فروری ۱۸۵۹ء غالب

(۱۱)

میری جان،
خدا تم کو ایک سو بیس برس کی عمر دے۔ بوڑھا ہونے کو آیا، داڑھی میں بال سفید آگئے، مگر بات سمجھنی نہ آئی۔ پنسن کے باب میں اُلجھے ہو اور کیا بے جا اُلجھے ہو۔ یہ تو جانتے ہو کہ دلّی کے سب پنسن داروں کو مئی ۱۸۵۷ء سے پنسن نہیں ملا۔ یہ فروری ۱۸۵۹ء بائیسواں مہینہ ہے۔ چند اشخاص کو اس بائیس مہینے میں سال بھر کا روپیہ بطریق مدد خرچ مل گیا۔ باقی چڑھے ہوئے روپے کے باب میں اور آیندہ ماہ بماہ ملنے کے واسطے ابھی کچھ حکم نہیں ہوا۔ تم اب اپنے سوال کو یاد کرو کہ اس واقعہ سے اس کو کچھ نسبت ہے یا نہیں۔ یہ حضرت کا سوال امیر خسرو کی اُملی ہے

چیل بسولا لے گئی نوکا ہے سے بھٹکوں رے اب

علی بخش خاں[1] پچاس روپے مہینہ پاتے تھے۔ بائیس مہینے کے گیارہ سو روپے ہوتے ہیں۔ ان کو چھ سو روپیہ مل گیا، باقی روپیہ چڑھا رہا۔ آیندہ ملنے میں کچھ کلام نہیں۔ غلام حسن خاں، سو روپیہ مہینے کا پنسن دار۔ بائیس مہینے کے بائیس سو روپے ہوتے ہیں۔ اس کو بارہ سو روپے ملے۔ دیوان کشن لال کا ڈیڑھ سو روپے مہینہ، بائیس مہینے کے تین ہزار تین سو ہوتے ہیں اس کو اٹھارہ سو ملے۔ منا جمعدار دس روپیہ مہینہ کا سکہ لمبر سال بھر کے ایک سو بیس لے آیا۔ اسی طرح پندرہ سولہ آدمیوں کو ملا ہے۔ آیندہ کے واسطے کچھ حکم نہیں۔ مجھ کو مدد خرچ نہیں ملا۔ جب کئی خط پر خط لکھے تو آخر خط پر صاحب کمشنر بہادر نے حکم دیا کہ سائل کو بطریق مدد خرچ سو روپے مل جائیں۔

---

[1] علی بخش خاں رنجور۔ میرزا کی بیوی کے بھائی

میں نے وہ سو روپے نہ لیے اور پھر صاحب کمشنر بہادر کو لکھا کہ میں باسٹھ روپے آٹھ آنے مہینہ پانے والا ہوں۔ سال بھر کے ساڑھے سات سو روپے ہوتے ہیں۔ سب پنشن داروں کو سال سال بھر کا روپیہ ملا۔ مجھ کو سو روپے کیسے ملتے ہیں؟ مثل اوروں کے مجھے بھی سال بھر کا روپیہ مل جائے۔ ابھی اس میں کچھ جواب نہیں ملا۔

آبادی کا یہ رنگ ہے کہ ڈھنڈورا پٹوا کر ٹکٹ چھپوا کر ایجرٹن[2] صاحب بہادر بطریق ڈاک کلکتہ چلے گئے۔ دلی کے حمقا جو باہر پڑے ہوئے ہیں منہ کھول کر رہ گئے۔ اب وہ جب معاودت کریں گے، تب شاید آبادی ہوگی یا کوئی اور نئی صورت نکل آئے۔

میر سرفراز حسین اور میر نصیر الدین اور میرن صاحب کو دعائیں پہنچیں۔

فروری ۱۸۵۹ء
غالب

(۱۲)

میری جان، سنو داستان۔ صاحب کمشنر بہادر دہلی یعنی جناب سانڈرس صاحب بہادر نے مجھ کو بلایا۔ پنجشنبہ ۲۴-فروری کو میں گیا۔ صاحب شکار کو سوار ہو گئے تھے۔ میں الٹا پھر آیا۔ جمعہ ۲۵-فروری کو گیا۔ ملاقات ہوئی۔ کرسی دی۔ بعد پرسش مزاج کے ایک خط انگریزی چار ورق کا اٹھا کر پڑھتے رہے۔ جب پڑھ چکے تو مجھ سے کہا کہ یہ خط ہے میکلوڈ[1] صاحب حاکم اکبر صدر بورڈ پنجاب کا۔ تمہارے باب میں

۱؎ میکلوڈ (۱۸۱۰ء تا ۱۸۷۲ء) مختلف عہدوں پر فائز رہا۔ ۱۸۴۹ء میں جالندھر کا کمشنر بنا۔ غدر کے دنوں میں لاہور میں تھا۔ ۱۸۶۵ء سے ۱۸۷۰ء تک لفٹنٹ گورنر رہا۔ سندھ، پنجاب اور دہلی ریلوے کا چیرمین تھا۔ کہتے ہیں۔ عوام کا ہمدرد تھا۔ پنجاب یونیورسٹی اسی کے زمانے میں قائم ہوئی۔ ۱۸۷۲ء میں لندن کی زمین دوز ریلوے کے حادثے میں فوت ہوا۔

۲؎ فلپ ہنری ایجرٹن آئی۔ سی۔ ایس (۱۸۲۴ء تا ۱۸۹۳ء) ۱۸۴۲ء میں ہندستان آیا۔ ۱۸۵۵ء سے ۱۸۵۹ء تک دہلی میں مجسٹریٹ کلکٹر رہا۔ (ایام غدر میں رخصت پر تھا)۔ بعد ازاں امرتسر اور راولپنڈی میں کمشنر رہا۔

لکھتے ہیں کہ ان کا حال دریافت کر کے لکھو۔ سو ہم تم سے پوچھتے ہیں کہ تم ملکہ معظمہ سے خلعت کیا مانگتے ہو۔ حقیقت کہی گئی۔ ایک کاغذ آمدہ ولایت لے گیا تھا، وہ پڑھوا دیا۔ پھر پوچھا تم نے کتاب کیسی لکھی ہے؟ اُس کی حقیقت بیان کی۔ کہا ایک میکلوڈ صاحب نے دیکھنے کو مانگی ہے اور ایک ہم کو دو۔ میں نے عرض کیا "کل حاضر کروں گا"۔ پھر پنسن کا حال پوچھا، وہ گزارش کیا۔ اپنے گھر آیا اور خوش آیا۔

دیکھو، میر مہدی، حاکم پنجاب کو مقدمۂ ولایت کی کیا خبر؟ کتابوں سے کیا اطلاع؟ پنسن کی پرسش سے کیا مدعا؟ یہ استفسار بحکم نواب گورنر جنرل بہادر ہوا ہے۔ یہ صورت مقدمہ فتح و فیروزی ہے۔ غرضکہ دوسرے دن یک شنبہ یوم تعطیل تھا، میں اپنے گھر رہا۔ دوشنبہ ۲۸ فروری کو گیا۔ باہر کے کمرے میں بیٹھ کر اطلاع کروائی۔ کہا اچھا توقف کرو۔ بعد تھوڑی دیر کے گڑھ کپتان کی چھٹی آئی۔ سواری مانگی جب سواری آگئی، باہر نکلے۔ میں نے کہا: وہ کتابیں حاضر ہیں۔ کہا: منشی جیون لال کو دے جاؤ۔ وہ ادھر سوار ہو گئے، میں ادھر سوار ہو کر اپنے مکان پر آیا۔ سہ شنبہ یکم مارچ کو پھر گیا۔ بہت التفات اور اختلاط سے باتیں کرتے رہے۔ کچھ سرٹیفکیٹ گورنروں کے ساتھ لے گیا تھا، وہ دکھائے۔ ایک خط میکلوڈ صاحب بہادر کے نام کا لے گیا تھا۔ وہ دے کر یہ استدعا کی کہ کتاب کے ساتھ یہ بھی بھیجا جائے۔ "بہت اچھا" کہہ کر رکھ لیا۔ پھر مجھ سے کہا کہ ہم نے تمھاری پنسن کے باب میں اجرٹن صاحب بہادر کو کچھ لکھا ہے۔ تم اُن سے ملو۔ عرض کیا بہتر۔ اجرٹن صاحب بہادر جیسا کہ تم کو معلوم تھا، گئے ہوئے تھے۔ کل وہ آئے۔ آج میں نے اُن کو خط لکھا ہے۔ جیسا وہ حکم دیں گے، اُس کے موافق عمل کروں گا۔ جب بلائیں، تب جاؤں گا۔ دیکھو سید اسد اللہ الغالب علیہ السلام کی مدد کو کہ اپنے غلام کو کس طرح سے بچایا۔ بائیس مہینے تک بھی بھوکا پیاسا نہ رہنے دیا۔ پھر کس محکمے سے کہ وہ آج

سلطنت کا دہندہ ہے، میرے تفقد کا حکم بھجوایا۔ حکام سے مجھ کو عزت دلوائی میرے صبر و ثبات کی داد ملی۔ صبر و ثبات بھی اسی کا بخشا ہوا تھا، میں کیا اپنے باپ کے گھر سے لایا تھا؟ میر سرفراز حسین کو یہ خط پڑھا دینا اور ان کو اور نصیرالدین چراغ دہلوی[1] کو اور میرن صاحب کو دعا کہنا۔

(۱۳)

میر مہدی،

جیتے رہو آفرین، صد ہزار آفرین، اُردو عبارت لکھنے کا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے کہ مجھ کو رشک آنے لگا۔ سُنو، دلی کے تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لوٹ پنجاب احاطہ میں گئی ہے۔ یہ طرزِ عبارت خاص میری دولت تھی، سو ایک ظالم پانی پتی، انصاریوں کے محلے کا رہنے والا لوٹ لے گیا[2]۔ مگر میں نے اس کو بحل کیا۔ اللہ برکت دے۔ میرے پنسن اور ولایت کے انعام کا حال لکھا ہو حقہ سمجھ لو۔ وللہ الحمد الطاف خفیہ۔ ایک خاص طرز پر تحریک ہوئی۔ نواب گورنر جنرل بہادر نے حاکم پنجاب کو لکھا کہ حاکم دہلی سے فلاں شخص کے پنسن کے چڑھے ہوئے روپے کے یک مشت پانے کی اور آیندہ ماہ بماہ ملنے کی رپورٹ منگوا کر، اپنی منظوری لکھ کر ہمارے پاس بھیج دو تا کہ ہم حکم منظوری دے کر تمھارے پاس بھیج دیں۔ سو یہاں اس کی تعمیل بطرز مناسب ہو گی۔ کم و بیش دو مہینے میں سب روپیہ مل جائے گا اور ہاں صاحب کمشنر بہادر نے یہ بھی کہا کہ اگر تم کو روپیہ کی ضرورت ہو تو سو روپے خزانہ سے منگوا لو۔ میں نے کہا۔ صاحب، یہ کیسی بات ہے کہ اوروں کو برس دن کا روپیہ ملا اور مجھے سو روپے دلواتے ہو؟ فرمایا کہ اب چند روز میں سب روپیہ

---

[1] مولانا نصیرالدین صاحب کو میرزا غالب "چراغ دہلوی" کہتے ہیں اور میرن صاحب کو مجتہد العصر

[2] اس سے مراد میر مہدی ہیں جو غدر کے زمانے میں دہلی سے نکل کر پانی پت چلے گئے تھے اور انصاریوں کے محلے میں رہتے تھے۔

اور اجرا کا حکم مِل جائے گا۔ اوروں کو یہ بات برسوں میں میسّر آئے گی۔ میں چپ ہو رہا۔ آج دوشنبہ یکم شعبان اور ہفتم مارچ ہے۔ دوپہر ہو جائے تو اپنا آدمی مع رسید بھیج کر سو روپے منگا لوں۔ بہ یارِ ولایت کے انعام کی توقع خدا ہی سے ہے جکم تو اسی حکم کے ساتھ اس کی رپورٹ کرنے کا بھی آیا ہے، مگر یہ بھی حکم ہے کہ اپنی رائے لکھو۔ اب دیکھیے یہ دو حاکم یعنی حاکم دہلی اور حاکم پنجاب اپنی رائے کیا لکھتے ہیں۔ پنجاب کے گورنر بہادر کا یہ بھی حکم ہے کہ "دستنبو" منگا کر اور تم دیکھ کر ہم کو لکھو کہ وہ کیسی ہے اور اس میں کیا لکھا ہے۔ چنانچہ حاکم دہلی نے ایک کتاب بھی کہہ کر مجھ سے مانگی اور میں نے دی۔ اب دیکھو حاکم پنجاب کیا لکھتا ہے۔ اس وقت تمھارا ایک خط اور یوسف مرزا کا ایک خط آیا، مجھ کو باتیں کرنے کا مزا ملا تو دونوں کا جواب ابھی لکھ کر روانہ کیا۔ اب میں روٹی کھانے جاتا ہوں۔ میر سرفراز حسین میرن صاحب، میر نصیرالدین کو دعا۔

۷ مارچ ۱۸۵۹ء — از غالب از غالب

(۱۴)

سیدّ،

خدا کی پناہ! عبارت لکھنے کا ڈھنگ ہاتھ کیا آیا ہے کہ تم نے سارے جہان کو سر پر اُٹھایا ہے۔ ایک غریب سیّد مظلوم[1] کے چہرۂ نورانی پر مہاسہ نکلا ہے، تم کو سرمایۂ آرائشِ گفتار بہم پہنچا ہے۔ میری ان کو دعا پہنچاؤ اور ان کی خیر و عافیت جلد لکھو۔

بھائی، یہاں کا نقشہ ہی کچھ اور ہے، سمجھ میں کسی کے نہیں آتا کہ کیا طور ہے اوائل ماہ انگریزی میں روک ٹوک کی شدّت ہوتی تھی۔ آٹھویں دسویں سے وہ شدّت کم ہو جاتی تھی۔ اس مہینے میں برابر وہی صورت رہی ہے۔ آج ۲۷ مارچ کی ہے۔

[1] مراد ہے میرن صاحب

پانچ چار دن مہینے کے باقی ہیں۔ آنچ ویسی ہی تیز ہے، خدا اپنے بندوں پر رحم کرے۔

مجھ پر میرے اللہ نے ایک اور عنایت کی ہے اور اس غمزدگی میں ایک گونہ خوشی اور کیسی بڑی خوشی دی ہے۔ تم کو یاد ہوگا کہ ایک "دستنبو" نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کی نذر بھیجی تھی۔ آج پانچواں دن ہے کہ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کا خط مقام الہ آباد سے بسبیل ڈاک آیا۔ وہی کاغذ افشانی، وہی القاب قدیم، کتاب کی تعریف عبارت کی تحسین، مہربانی کے کلمات۔ کبھی تم کو خدا یہاں لائے گا تو اس کی زیارت کرنا۔ پنسن کے ملنے کا حکم بھی آج کل آیا چاہتا ہے اور یہ بھی توقع بڑی ہے کہ گورنر جنرل بہادر کے ہاں سے بھی کتاب کی تحسین اور عنایت کے مضامین کی تحریر آجائے۔ میرن صاحب کو سلام پہلے لکھ چکا ہوں۔ میر سرفراز حسین اور میر نصیر الدین کو دعا کہہ دینا اور یہ خط دکھا دینا۔

(۱۸)

مار ڈالا یار، تیری جواب طلبی نے۔ اس چرخ کج رفتار کا برا ہو، ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا؟ ملک و مال، جاہ و جلال کچھ نہیں رکھتے تھے۔ ایک گوشہ و توشہ تھا۔ چند مفلس و بے نوا ایک جگہ فراہم ہو کر کچھ ہنس بول لیتے تھے:

سو بھی نہ تو کوئی دم، دیکھ سکا اے فلک

اور تو یاں کچھ نہ تھا، ایک مگر دیکھنا

یاد رہے۔ یہ شعر خواجہ میر درد کا ہے

"کل سے مجھ کو ہیکش بہت یاد آتا ہے"[1] سو صاحب، اب تم ہی بتاؤ کہ میں تم کو کیا لکھوں؟ وہ صحبتیں اور تقریریں جو یاد کرتے ہو، اور تو کچھ بن نہیں آتی۔ مجھ

---

[1] میرا خیال ہے یہ فقرہ میر مہدی مجروح نے میرزا کو لکھا تھا۔ اسے نقل کر کے لکھتے ہیں کہ جب تمھیں اِن بچھڑے ہوئے دوستوں کی صحبتیں اور تقریریں یاد آتی ہیں تو مجھ سے خط پر خط لکھواتے ہو۔

سے خط پر خط لکھواتے ہو۔ آنسوؤں پیاس نہیں بجھتی، یہ تحریر تلافی اس تقریر کی نہیں کر سکتی۔ بہ ہر حال کچھ لکھتا ہوں۔ دیکھو، کیا لکھتا ہوں۔

سُنو، پنسن کی رپورٹ کا ابھی کچھ حال معلوم نہیں۔ دیر آید درست آید۔ بھئی، میں تم سے بہت آزردہ ہوں۔ میرن صاحب کی تندرستی کے بیان میں نہ اظہارِ مسرت، نہ مجھ کو تہنیت۔ بلکہ اس طرح سے لکھا گیا ہے کہ گویا ان کا تندرست ہونا تم کو ناگوار ہُوا ہے۔ لکھتے ہو کہ میرن صاحب ویسے ہی ہو گئے، جیسے آگے تھے۔ اُچھلتے کُودتے پھرتے ہیں۔ اس کے یہ معنی کہ ہے ہے، کیا غضب ہوا، یہ کیوں اچھے ہو گئے۔ یہ باتیں تمھاری ہم کو پسند نہیں آتیں۔ تم نے میر کا وہ مقطع سُنا ہو گا۔ بہ تغیر الفاظ لکھتا ہوں:

کیوں نہ میرن کو مغتنم جانوں؟ دلی والوں میں ایک بچا ہے یہ

میر تقی کا مقطع یوں ہے:

میر کو کیوں نہ مغتنم جانیں؟ اگلے لوگوں میں اک رہا ہے یہ

"میر" کی جگہ "میرن" اور "رہا" کی جگہ "بچا" کیا اچھا تصرف ہے!

ارے میاں، تم نے کچھ اور بھی سُنا؟ کل یوسف مرزا کا خط لکھنؤ سے آیا۔ وہ لکھتا ہے کہ نصیر خاں عرف نواب جان، والد اُن کا دائم الحبس ہو گیا۔ حیران ہوں کہ یہ کیسی آفت آئی۔ یوسف مرزا تو جھوٹ کا ہے کو لکھے گا۔ خدا کرے اُس نے جھوٹ سنا ہو۔

لو بھئی، اب تم جاؤ اپنے گھر، میں تو روٹی کھانے جاتا ہوں۔ اندر باہر سب روزہ دار ہیں۔ یہاں تک کہ بڑا لڑکا باقر علی خاں بھی۔ صرف ایک میں اور ایک میرا بیٹا حسین علی خاں، یہ ہم روزہ خوار ہیں۔ وہی حسین علی خاں جس کا روزمرہ ہے "کھلونے منگا دو، میں بھی بجار (بازار) جاؤں گا" میر سرفراز حسین کو

کو دُعا کہنا اور یہ خط اُن کو ضرور سُنا دینا۔ برخوردار میر نصیر الدین کو دُعا پہنچے۔
غالب اپریل ۱۸۵۹ء

(۱۶)

برخوردار کامگار میر مہدی،

قطعہ تم نے دیکھا؟ سچ مچ میرا حلیہ ہے۔ واہ اب کیا شاعری رہ گئی ہے جس وقت میں نے یہ قطعہ وہاں کے بھیجنے کے واسطے لکھا، ارادہ تھا کہ خط بھی لکھوں۔ لڑکوں نے سنایا کہ دادا جان چلو کھانا تیار ہے، ہمیں بھوک لگی ہے۔ تین خط اور لکھے رکھے تھے۔ میں نے کہا کہ اب کیوں لکھوں۔ اسی کاغذ کو لفافے میں رکھ کر، ٹکٹ لگا کر، سرنامہ لکھ، کلیان کے حوالے کر، میں گھر چلا گیا اور وہاں ایک چھیڑ بھی تھی کہ دیکھوں، میرا میر مہدی خفا ہو کر کیا باتیں بناتا ہے۔ سو وہی ہوا۔ تم نے جلے پھپھولے پھوڑے۔ لو، اب بتاؤ خط لکھنے بیٹھا ہوں۔ کیا لکھوں؟ یہاں کا حال زبانی میرن صاحب کے سُن لیا ہوگا۔ مگر وہ جو کچھ تم نے سُنا ہوگا۔ بے اصل باتیں ہیں۔ پنسن کا مقدمہ کلکتہ میں نواب گورنر جنرل بہادر کے پیشِ نظر، یہاں کے حاکم نے ایک روبکاری لکھ کر اپنے دفتر میں رکھ چھوڑی، میرا اس میں کیا ضرر۔

یہاں تک لکھ چکا کہ دو ایک آدمی آ گئے۔ دِن بھی تھوڑا رہ گیا۔ میں نے بکس بند کیا، باہر تختوں پر آ بیٹھا۔ شام ہوئی۔ چراغ روشن ہوا۔ منشی سیّد احمد حسین سرہانے کی طرف مونڈھے پر بیٹھے ہیں۔ میں پلنگ پر لیٹا ہوا ہوں کہ ناگاہ چشم و چراغ دودمان علم و یقین سید نصیر الدین آیا۔ ایک کوڑا ہاتھ میں اور ایک آدمی ساتھ اس کے سر پر ٹوکرا، اس پر گھاس بھری ہوئی۔ میں نے کہا اہاہاہا! سلطان العلما مولانا سرفراز حسین دہلوی نے دوبارہ رسید بھیجی ہے۔ بارے معلوم ہوا کہ وہ نہیں ہے، یہ کچھ اور ہے۔ فیض خاص نہیں، لطف عام ہے۔

شراب نہیں، آم ہے۔ خیر یہ عطیہ بھی بے خلل ہے، بلکہ نعم البدل ہے۔ ایک ایک آم کو ایک ایک سربمہر گلاس سمجھا، باوہ انگوری سے بھرا ہوا۔ مگر واہ کس حکمت سے بھرا ہے کہ باوجود سرپیسٹھ گلاس میں ایک قطرہ نہیں گرا ہے۔ میاں کہتا تھا کہ یہ اسّی تھے، پندرہ بگڑ گئے، بلکہ سڑ گئے تا اُن کی بُرائی اوروں میں سرایت نہ کرے، ٹوکرے میں سے پھینک دیے۔ میں نے کہا، بھائی، یہ کیا کم ہیں۔ اگرچہ تمھاری تکلیف اور تکلّف سے خوش نہیں ہوا۔ تمھارے پاس روپیہ کہاں ہے جو تم نے آم خریدے؛ خانہ آباد، دولت زیادہ۔

لیکورا ایک انگریزی شراب ہوتی ہے، قوام کی بہت لطیف اور رنگت کی بہت خوب اور طعم کی ایسی میٹھی، جیسا قند کا قوام پتلا۔ دیکھو، اس لغت کے معنی کسی فرہنگ سروری میں ہو تو۔

مجتہد العصر اور حکیم میر اشرف علی کو کہ وہ ان کے علم کی کنجی ہیں اور ٹکے ٹکے کی کتابیں چالیس پچاس روپے کو لے گئے ہیں، میری دعا کہہ دینا۔

۱۸۵۹ء

غالب

(۱۷)

بھائی،

تم تو لڑکوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ جو ماجرا سُنا تھا، وہ البتہ موجبِ تشویش تھا۔ تمھاری تحریر سے وہ تشویش رفع ہو گئی۔ پھر تم کیوں ہائے، واویلا کرتے ہو؟ اُوپر کا حاکم موافق ہے۔ ماتحت کا حاکم جو مخالف تھا، سو گیا۔ پھر کیا قصہ ہے؟

"قاطع برہان" کے سب مسودے میں نے پھاڑ ڈالے، اس واسطے کہ ہر نظر میں اس کی صورت بدلتی گئی۔ وہ تحریر بالکل مغشوش ہو گئی۔ ہاں، اس کی نقلیں صاف، کہ جن میں کسی طرح کی غلطی نہیں، نواب صاحب[۱] نے کر لی ہیں۔ ایک

---

[۱] معلوم نہیں کہ نواب صاحب سے کون مراد ہے

میرے واسطے، ایک عالی جاہ ضیاالدین خاں کے واسطے۔ میری ملک کی جو کتاب ہے، اس کی جلد بندھ جائے تو بطریق مستعار بھیج دوں گا۔ تم اس کی نقل لے کر میری کتاب مجھ کو پھیر دینا اور یہ امر بعد محرم واقع ہوگا۔ مگر یہ یاد رہے کہ جو صاحب اس کو دیکھیں گے، وہ ہرگز نہ سمجھیں گے۔ صرف "برہان قاطع" کے نام پر جان دیں گے۔ کئی باتیں جس شخص میں جمع ہوں گی وہ اس کو مانے گا۔ پہلے تو عالم ہو۔ دوسرے فن لغت کو جانتا ہو۔ تیسرے فارسی کا علم ہو اور اس زبان سے اس کو لگاؤ ہو۔ اساتذہ سلف کا کلام بھی بہت کچھ دیکھا ہو اور کچھ یاد بھی ہو۔ چوتھے منصف ہو، ہٹ دھرم نہ ہو۔ پانچویں طبع سلیم و ذہن مستقیم رکھتا ہو، معوج الذہن اور کج فہم نہ ہو۔ نہ یہ پانچ باتیں کسی میں جمع ہوں گی اور نہ کوئی میری محنت کی داد دے گا۔ ۱۲

"فہمایش" کا لفظ میاں بدھا ولد میاں جما اور لالہ گنیش داس ولد لالہ بھیروں ناتھ کا گھڑا ہوا ہے۔ میری زباں سے کبھی تم نے سنا ہے؟ اب تفصیل سنو: امر کے صیغے کے آگے شین آتا ہے، تو وہ امر معنی مصدری دیتا ہے اور اس کو "حاصل بالمصدر" کہتے ہیں۔ "سوختن" مصدر "سوزد"۔ مضارع "سوز" امر "سوزش" "حاصل بالمصدر" اسی طرح: خواہش و کاہش و گذارش و گدازش و آرایش و پیرایش و فرمایش "فہمیدن" فارسی الاصل نہیں ہے، مصدر جعلی ہے۔ فہم لفظ عربی الاصل ہے۔ ان کو موافق قاعدہ تفریس "فہمیدن" و "طلبیدن" کر لیا ہے اور اس قاعدے میں یہ کلیہ ہے کہ لغت اصل عربی آخر کو امر بن جاتا ہے۔ "فہم" یعنی "بفہم"۔ "سمجھ" "طلب" یعنی "بطلب": "مانگ"۔ "فہمد" مضارع بنا، "طلبد" مضارع بنا۔ خیر یہ فرض کیجیے کہ جب ہم نے مصدر اور مضارع اور امر بنا یا تو اب حاصل بالمصدر کیوں نہ بنائیں؟ سنو حاصل بالمصدر "فہمش" اور "طلبش" ہونا چاہیے "فہم"

تھا صیغہ امر "فہم" سے نکلا تھا، "الف" اور "ے" کہاں سے لایا؟ "فہمائی" تو نہیں ہے، جو "فہمایش" درست ہو۔ کہیں "فرمایش" کو اس کا نظیر گمان نہ کرنا۔ وہ مصدر اصلی فارسی "فرمودن" ہے۔ "فرماید" مضارع، "فرمائے" امر، حاصل مصدر "فرمایش" ۱۲

پہلے حکیم میر اشرف علی کو دعا اور بیٹا پیدا ہونے کی مبارک باد۔ میاں میں نے رات عالم سرخوشی میں تاریخی نام کا خیال کیا۔ میر کاظم الدین کے بارہ سو پچھتر ہوتے ہیں۔ لیکن یہ اسم بھی مانند لفظ "فہمایش" ٹکسال سے باہر ہے۔

جولائی ۱۸۵۹ء
غالب

(۱۸)

میری جان،

تم کو تو بیکاری میں خط لکھنے کا ایک شغل ہے۔ قلم دوات لے بیٹھے، اگر خط پہنچا ہے، تو جواب، ورنہ شکوہ و شکایت و عتاب و خطاب لکھنے لگے۔ حکیم اشرف علی آئے تھے۔ سر منڈوا ڈالا ہے۔ محلقین رؤسکم پر عمل کیا ہے۔ میں نے کہا کہ سر منڈوایا ہے تو داڑھی رکھو۔ کہنے لگے: "دامن از کجا آرم کہ جامہ ندارم" واللہ ان کی صورت قابل دیکھنے کے ہے۔ کہتے تھے کہ میر احمد علی صاحب آ گئے۔ بحال و برقرار رہے۔ خدا کا شکر بجا لایا۔ کبھی تو ایسا بھی ہو کہ کسی عزیز کی اچھی خبر سُنی جاتے۔ میرا سلام کہنا اور مبارک باد دینا۔ خبردار بھول نہ جائیو۔

تمہاری شکایت ہائے بیجا کا جواب یہ ہے کہ تم نے جو خط مجھ کو پانی پت سے بھیجا تھا اور کرنال کی روانگی کی اطلاع دی تھی، میں نے یہ تجویز کر لیا تھا کہ جب کرنال سے خط آئے گا تو میں جواب لکھوں گا۔ آج شنبہ ۱۵ اکتوبر، صبح کا وقت، ابھی کھانا پکا بھی نہیں۔ تبرید پی کر بیٹھا تھا کہ تمہارا خط آیا اور پڑھا

اور یہ جواب لکھا۔ کلیان بیمار رہے۔ ایاز کو خط دے کر ڈاک گھر روانہ کیا۔ بولو، تمھارا گلہ بے جا یا بجا؟ بھائی گلہ کرو تو اپنے سے کرو کہ تم نے کرنال پہنچ کر خط لکھنے میں کیوں دیر کی؟ اور ہاں یہ کیا سبب ہے کہ بہت دن سے میر نصیر الدین کا نام تمھارے قلم سے نہیں نکلتا؟ ان کی بندگی نہ لکھتے تو خیر و عافیت تو لکھتے۔ یہ باتیں اچھی نہیں۔ میرن صاحب کے باب میں حیران ہوں تنہا تمھارے ساتھ گئے ہیں۔ والدہ ان کی پانی پت میں ہیں۔ وہاں کوئی مکان لے کر والدہ کو وہیں بلائیں گے یا خود بعد چند روز کے یہاں آجائیں گے؟ یہ دو باتیں جواب طلب ہیں۔ میر نصیر الدین کی بندگی نہ لکھنے کا سبب اور میرن صاحب کے بود و باش کی حقیقت لکھو۔ رہا میرا پنسن اس کا ذکر نہ کرو۔ اگر ملے گا تو تم کو اطلاع دے دی جائے گی۔ شہر کی آبادی کا چرچا ہوا۔ کرائے کو مکان ملنے لگے چار پانسو گھر آباد ہوئے تھے کہ پھر وہ قاعدہ مٹ گیا۔ خدا جانے کیا دستور جاری ہوا ہے۔ آیندہ کیا ہوگا۔

سلطان العلما مجتہد العصر مولوی سید سرفراز حسین کو، اگرچہ نظر ان کے مدارج علم و عمل پر بندگی چاہیے، مگر خیر میں عزیزداری و یگانگی کی راہ سے دعا لکھتا ہوں۔ میرن صاحب کو دعا اور بعد دعا کے بہت سا پیار۔ میر نصیر الدین کو دعا۔ زیادہ کیا لکھوں۔

۱۵ اکتوبر ۱۸۵۹ء   از غالب

(۱۹)

بھائی،

نہ کاغذ ہے، نہ ٹکٹ ہے۔ اگلے لفافوں میں سے ایک بیرنگ لفافہ پڑا ہے کتاب میں سے یہ کاغذ پھاڑ کر تم کو خط لکھتا ہوں اور بیرنگ لفافہ میں لپیٹ کر

بھیجتا ہوں۔ غمگین نہ ہونا۔ کل شام کو کچھ فتوح کہیں سے پہنچ گئی ہے۔ آج کاغذ و ٹکٹ منگا لوں گا۔ شنبہ ۸۔ نومبر صبح کا وقت ہے جس کو عوام بڑی فجر کہتے ہیں۔ پرسوں تمہارا خط آیا تھا، آج جی چاہا کہ ابھی تم کو خط لکھوں۔ اس واسطے یہ چند سطریں لکھیں۔

برخوردار میر نصیر الدین[1] پر اُن کی بیٹی کا قدم مُبارک ہو۔ نام تاریخی تو مجھ سے ڈھونڈا نہ جائے گا، ہاں عظیم النسا بیگم اچھا ہے کہ اس میں ایک رعایت ہے شاہ محمد عظیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نام کی۔ مجتہد العصر کو میری دعا کہنا تم کو کیا ہُوا ہے کہ ان کو اپنا چھوٹا بھائی جان کر مجتہد العصر نہیں لکھا کرتے؟ یہ بے ادبی اچھی نہیں۔ میرن صاحب کو بہت بہت دعا کہنا اور میری طرف سے پیار کرنا۔

شہر کا حال میں کیا جانوں کیا ہے۔ "پون ٹوٹی"[2] کوئی چیز ہے وہ جاری ہو گئی ہے۔ سوائے اناج اور اُپلے کے کوئی چیز ایسی نہیں، جس پر محصول نہ لگا ہو۔ جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا۔ دکانیں، حویلیاں ڈھائی جائیں گی۔ دار البقا[3] فنا ہو جائے گی۔ رہے نام اللہ کا۔ خان چند کا کوچہ شاہ بولا کی بڑ تک ڈھے گا۔ دونوں طرف سے پھاوڑہ چل رہا ہے۔ باقی خیر و عافیت ہے۔ حاکم اکبر کی آمد آمد سُن رہے ہیں۔ دیکھیے وہ آئیں یا نہیں۔ آئیں تو دربار کریں یا نہیں۔ دربار کریں تو میں گنہ گار بلایا جاؤں یا نہیں۔ بلایا جاؤں تو خلعت پاؤں یا نہیں۔ پنسن کا نہ کہیں ذکر ہے، نہ کسی کو خبر ہے۔

سہ شنبہ ۸ نومبر ۱۸۵۹ء غالب

---

[1] میر سرفراز حسین [2] ٹون ڈیوٹی یعنی چنگی

[3] مفتی صدر الدین آزردہ مرحوم کی درسگاہ جس میں ادب، حکمت اور علوم دین کی تعلیم ہوتی تھی اور تمام طلبہ کو کھانا اور لباس اور کتابیں درسگاہ کی طرف سے ملتی تھیں۔

(۲۰)

میری جان،

تو کیا کہہ رہا ہے؟ بنیے سے سیانا سو دیوانہ۔ صبر و تسلیم و توکّل و رضا شیوہ صوفیہ کا ہے۔ مجھ سے زیادہ اس کو کون سمجھے گا جو تم مجھ کو سمجھاتے ہو؟ کیا میں یہ جانتا ہوں کہ ان لڑکوں[1] کی پرورش میں کرتا ہوں؟ استغفراللہ، لاموثر فی الوجود الااللہ۔ یا تم یہ سمجھے ہو کہ میں شیخ چلّی کی طرح سے یہ خیال باندھتا ہوں کہ مرغی مول لوں گا اور اس کے انڈے بچے بیچ کر بکری خریدوں گا اور پھر کیا کروں گا اور آخر کیا ہوگا؟ بھائی یہ تو میں نے اپنا رازِ دل تم سے کہا تھا کہ آرزوئیں یوں ہی تھی اور اب وہ نقش باطل ہو گیا۔ ایک حسرت کا بیان تھا، نہ خواہش کا۔

دیکھا، اِس پنسن قدیم کا حال؟ میں تو اس سے ہاتھ دھوئے بیٹھا ہوں۔ لیکن جب تک جواب نہ پاؤں کہیں اور کیوں کر چلا جاؤں؟ حاکم اکبر کے آنے کی خبر گرم ہے۔ دیکھیے کب آئے۔ آئے تو مجھے بھی دربار میں بُلائے یا نہ بُلائے۔ خلعت مِلے یا نہ ملے۔ اس پیچ میں ایک اور پیچ آپڑا ہے۔ اس کو دیکھ لوں اور پھر اسی کا انتظار نہیں، اِس مرحلے کے طے ہونے کے بعد پنسن مِلنے نہ مِلنے کا تردّد بدستور رہے گا۔ سبک سیر کیوں کر بن جاؤں کہ یہ سب امور ملتوی چھوڑ کر نکل جاؤں؟ پنسن جاری ہوئے پہ بھی تو سوا رام پور کے ٹھکانا نہیں ہے۔ وہاں تو جاؤں اور ضرور جاؤں۔ تین برس ثبات قدم اختیار کیا۔ اب انجام کار میں اضطراب کی کیا وجہ؟ چپکے ہو رہو اور مجھ کو کسی عالم میں غمگین اور مضطر گمان نہ کرو۔ ہر وقت میں جیسا مناسب ہوتا ہے، ویسا عمل میں آتا ہے۔

صاحب، میرن صاحب نے دو سطریں دستخط خاص سے لکھی تھیں۔ واللہ

---

[1] باقر علی خاں اور حسین علی خاں فرزندانِ عارف۔

میں کچھ نہیں سمجھا کہ یہ کس مقدمہ کا ذکر ہے۔ غالب

(۲۱)

بھائی،

کیا پوچھتے ہو؟ کیا لکھوں؟ دلّی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے۔ قلعہ، چاندنی چوک ہر روز مجمع مسجد جامع کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں، پھر کہو دلّی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔

نواب گورنر جنرل بہادر ۱۵ دسمبر کو یہاں داخل ہوں گے۔ دیکھیے کہاں اُترتے ہیں اور کیونکر دربار کرتے ہیں۔ آگے کے درباروں میں سات جاگیردار[۱] تھے کہ ان کا الگ الگ دربار ہوتا تھا۔ جھجر، بہادر گڑھ، بلب گڑھ، فرخ نگر، دوجانہ، پاٹودی، لوہارو۔ چار معدوم محض ہیں[۲]۔ جو باقی رہے اس میں سے دوجانہ و لوہارو تحت حکومت ہانسی حصار، پاٹودی حاضر۔ اگر حصار کے صاحب کمشنر بہادر ان دونوں[۳] کو یہاں لے آئے تو تین رئیس، ورنہ ایک رئیس۔ دربار عام والے مہاجن لوگ سب موجود۔ اہل اسلام میں سے صرف تین آدمی باقی ہیں: میرٹھ میں مصطفےٰ خاں، سلطان جی میں مولوی صدرالدین خاں۔ بلی ماروں میں سگِ دنیا موسوم بہ اسدؔ۔ تینوں مردود و مطرود و محروم و مغموم:

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گو برسا کرے

---

[۱] یہ دہلی کے آس پاس سات ریاستیں تھیں جنھیں ہفت گانہ کہتے تھے۔ نام غالب نے خود بتا دیئے ہیں۔

[۲] یعنی جھجر، بہادر گڑھ، بلب گڑھ اور فرخ نگر۔ یہ ریاستیں غدر میں مٹ گئیں۔

[۳] دوجانہ و لوہارو۔

تم آتے ہو، چلے آؤ۔ نثار خاں کے چھتّے کی سڑک، خان چند کے کوچے کی سڑک دیکھ جاؤ۔ بلاقی بیگم کے کوچے کا ڈھنا، جامع مسجد کے گرد ستر ستر گز میدان نکلنا سُن جاؤ۔ غالب افسردہ دل کو دیکھ جاؤ، چلے جاؤ۔

مجتہد العصر میر سرفراز حسین کو دعا، حکیم الملک حکیم اشرف علی کو دعا، قطب الملک میر نصیر الدین کو دعا۔ یوسف ہند افضل علی کو دعا۔

۱۲، دسمبر ۱۸۵۹ء ازغالب

(۲۲)

بے مے نہ کند در کف من خامہ روائی

سردست ہوا، آتش بے دود کجائی

میر مہدی صاحب، صبح کا وقت ہے جاڑا خوب پڑ رہا ہے۔ انگیٹھی سامنے رکھی ہے۔ دو حرف لکھتا ہوں، ہاتھ تاپتا جاتا ہوں۔ آگ میں گرمی سہی، مگر ہائے آتش سیال[1] کہاں کہ جب دو جرعے پی لیے، فوراً رگ وپے میں دوڑ گئی۔ دل توانا ہو گیا، دماغ روشن ہو گیا، نفس ناطقہ کو تو اجد بہم پہنچا۔ ساقی کوثر کا بندہ، اور تشنہ لب! ہائے غضب!

میاں تم پنسن پنسن کیا کر رہے ہو؟ گورنر جنرل کہاں اور پنسن کہاں۔ صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر، صاحب کمشنر بہادر، نواب لفٹنٹ گورنر بہادر، جب ان تینوں نے جواب دیا ہو تو اس کا مرافعہ گورنمنٹ میں کروں۔ مجھے تو دربار وخلعت کے لالے پڑے ہیں۔ تم کو پنسن کا فکر ہے۔ یہاں کے حاکم نے میرا نام فرد میں نہیں لکھا۔ میں نے اس کا اپیل نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کے ہاں کیا ہے۔ دیکھیے کیا جواب آتا ہے۔ بہر حال جو کچھ ہو گا تم کو لکھا جائے گا۔ اجی وہ یوسف ہند نہ سہی، یوسف

---

[1] بہنے والی آگ یعنی شراب۔

دہر سہی، یوسف عصر سہی، ان کی زلیخا نے ستم برپا کر رکھا ہے۔ مجھے تو خبر نہیں، کہیں حضرت کہہ گئے کہ میں ساڑھے سات روپے مہینہ بھیجے جاؤں گا۔ اب ان کا تقاضا ہے۔ رحیم بخش روز آتا ہے اور کہتا ہے کہ پھوپھا جان کو لکھو کہ پھوپھی جان بھوکی مرتی ہیں۔ خرچ جلد بھیجو، ورنہ نالش کی جائے گی اور تم کو گواہ قرار دیا جائے گا۔ بہ ہر حال میرن صاحب کو یہ پڑھوا دینا۔ میر سرفراز حسین کو دعا، حکیم میر اشرف علی کو دعا، یوسف ہفت کشور کو دعا۔

سہ شنبہ ۱۳ دسمبر ۱۸۵۹ء از غالب

(۱۳)

میاں لڑکے،

کہاں پھر رہے ہو؟ ادھر آؤ، خبریں سنو۔ دربار لارڈ صاحب کا میرٹھ میں ہوا۔ دلی کے علاقے کے جاگیردار، بموجب حکم کمشنر دہلی میرٹھ گئے، موافق دستور قدیم مل آئے۔ غرضکہ پنجشنبہ ۲۹ دسمبر کو پہر دن چڑھے لارڈ صاحب یہاں پہنچے۔ کابلی دروازہ کی فصیل کے تلے ڈیرے ہوئے۔ اسی وقت توپوں کی آواز سنتے ہی میں سوار ہو کر گیا۔ میر منشی سے مِلا۔ ان کے خیمہ میں بیٹھ کر صاحب سکتر کو خبر کروائی۔ جواب آیا کہ فرصت نہیں۔ یہ جواب سُن کر نومیدی کی پوٹ باندھ کر لے آیا۔ ہر چند پنسن کے باب میں ہنوز لا و نعم نہیں، مگر کچھ فکر کر رہا ہوں۔ دیکھوں کیا ہوتا ہے۔ لارڈ صاحب کل یا پرسوں جانے والے ہیں۔ یہاں کچھ کلام و پیام نہیں ممکن۔ تحریر ڈاک میں بھیجی جائے گی۔ دیکھیے کیا صورت در پیش آئے گی۔

مسلمانوں کی املاک کی واگزاشت کا حکم عام ہو گیا ہے۔ جن کو کرایے پر ملی ہے اُن کو کرایہ معاف ہو گیا ہے۔ آج یک شنبہ یکم جنوری ۱۸۶۰ء ہے، پہر دن چڑھا ہے کہ یہ خط تم کو لکھا ہے۔ اگر مناسب جانو تو آؤ، اپنی املاک پر قبضہ پاؤ۔ چاہو

یہیں رہو، چاہو پھر چلے جاؤ۔ میر سرفراز حسین، میر نصیر الدین، میرن کو میری دعائیں کہنا اور حکیم میر اشرف علی کو بعد دعا کے یہ کہہ دینا کہ وہ جوب جو تم نے مجھ کو دی تھی اُن کا نسخہ جلد لکھ کر بھیج دو۔ واللہ موجود ما سوا معدوم۔

یکم جنوری ۱۸۶۰ء اپنی مرگ کا طالب غالب

(۲۴)

ہا ہا ہا! میرا پیارا مہدی آیا۔ آؤ بھائی، مزاج تو اچھا ہے۔ بیٹھو۔ یہ رام پور[1] ہے، دار السرور ہے جو لطف یہاں ہے، وہ اور کہاں ہے، سبحان اللہ! شہر سے تین سو قدم پر ایک دریا ہے اور کوسی اس کا نام ہے۔ بے شبہ چشمہ آبِ حیات کی کوئی سوت اس میں ملی ہے۔ خیر، اگر یوں بھی ہے تو بھائی، آب حیات عمر بڑھاتا ہے، لیکن اتنا شیریں کہاں ہوگا؟

تمہارا خط پہنچا۔ تردد عبث۔ میرا مکان ڈاک گھر کے قریب اور ڈاک منشی میرا دوست، نہ عرف لکھنے کی حاجت، نہ محلے کی حاجت۔ بے وسواس خط بھیج دیا کیجیے اور جواب لیا کیجیے۔ یہاں کا حال سب طرح خوب ہے اور صحبت مرغوب ہے۔ اس وقت تک مہمان ہوں۔ دیکھوں، کیا ہوتا ہے۔ تعظیم و توقیر میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں ہے۔ لڑکے دونوں میرے ساتھ آئے ہیں۔ اس وقت اس سے زیادہ نہیں لکھ سکتا۔

فروری ۱۸۶۰ء از غالب

(۲۵)

میر مہدی، تم میرے عادات کو بھول گئے؟ ماہ مبارک رمضان میں کبھی

---

[1] یہ خط اس زمانے میں لکھا گیا، جب میرزا غالب پہلی مرتبہ بہ زمانہ نواب یوسف علی خاں رام پور گئے تھے۔

مسجد جامع کی تراویح ناغہ ہوئی ہے؟ میں اس مہینے میں رام پور کیوں رہتا؟ نواب صاحب مانع رہے اور بہت منع کرتے رہے۔ برسات کے آموں کا لالچ دیتے رہے۔ مگر بھائی، میں ایسے انداز سے چلا کہ چاند رات کے دن یہاں آ پہنچا۔ یک شنبہ کو غرّہ ماہ مقدس ہوا۔ اسی دن سے ہر صبح کو حامد علی خاں کی مسجد میں جا کر جناب مولوی جعفر علی صاحب سے قرآن سنتا ہوں۔ شب کو مسجد جامع جا کر نماز تراویح پڑھتا ہوں۔ کبھی جو جی میں آتی ہے تو وقت صوم مہتاب باغ میں جا کر روزہ کھولتا ہوں اور سرد پانی پیتا ہوں۔ واہ واہ کیا اچھی طرح عمر بسر ہوتی ہے[1]۔

اب اصل حقیقت سنو۔ لڑکوں کو ساتھ لے گیا تھا، وہاں انھوں نے میرا ناک میں دم کر دیا۔ تنہا بھیج دینے میں وہم آیا کہ خدا جانے اگر کوئی امر حادث ہو تو بدنامی عمر بھر رہے۔ اس سبب سے جلد چلا آیا، ورنہ گرمی برسات وہاں کاٹتا۔ اب بشرط حیات جریدہ بعد برسات جاؤں گا اور بہت دنوں تک یہاں نہ آؤں گا۔ قرارداد یہ ہے کہ نواب صاحب جولائی ۱۸۵۹ء سے کہ جس کو یہ دسواں مہینہ ہے سو روپے مجھے ماہ بماہ بھیجتے ہیں۔ اب جو میں وہاں گیا تو سو روپیہ مہینہ بنام دعوت اور دیا۔ یعنی رام پور رہوں تو دو سو روپیہ مہینہ پاؤں اور دلّی رہوں تو سو روپیہ۔ بھائی سو دو سو میں کلام نہیں، کلام اس میں ہے کہ نواب صاحب دوستانہ و شاگردانہ دیتے ہیں، مجھ کو نوکر نہیں سمجھتے۔ ملاقات بھی دوستانہ رہی۔ معانقہ و تعظیم، جس طرح احباب میں رسم ہے، وہ صورت ملاقات کی ہے۔ لڑکوں سے میں نے نذر دلوائی تھی بس بہ ہر حال غنیمت ہے۔ رزق کے اچھی طرح ملنے کا شکر چاہیے، کمی کا شکوہ کیا؟ انگریز کی سرکار سے دس ہزار روپے سال ٹھہرے۔ ایک صاحب[2] نے نہ دیے مگر تین ہزار روپے سال۔ اس میں سے مجھ کو ملے ساڑھے سات سو روپے سال۔

---

[1] یہ محض سخن گستری اور عبارت طرازی ہے۔ [2] نواب احمد بخش خاں۔

عزت میں وہ پایہ جو رئیس زادوں کے واسطے ہوتا ہے، بنارہا دو خاں صاحب بسیار مہربان دوستاں " القاب۔ خلعت سات پارچے اور جیغہ و سرپیچ و مالائے مروارید۔ بادشاہ اپنے فرزندوں کے برابر پیار کرتے تھے۔ بخشی، ناظر، حکیم کسی سے توقیر کم نہیں، مگر فائدہ وہی قلیل۔ سو میری جان، یہاں بھی وہی نقشہ ہے کوٹھڑی میں بیٹھا ہوں۔ ٹٹی لگی ہوئی ہے۔ ہوا آرہی ہے۔ پانی کا جھجر دھرا ہے۔ حقہ پی رہا ہوں، یہ خط لکھ رہا ہوں۔ تم سے باتیں کرنے کو جی چاہا، یہ باتیں کر لیں۔ میر سرفراز حسین اور میرن صاحب اور میر نصیرالدین صاحب کو یہ خط پڑھا دینا اور میری دعا کہہ دینا۔

جمعہ ۱۶ اپریل ۱۸۶۱ء از غالب

(۲۶)

میاں،

کیوں ناسپاسی و ناحق شناسی کرتے ہو؟ چشم بیمار ایسی چیز ہے کہ جس کی کوئی شکایت کرے؟ تمہارا منہ چشم بیمار کے لائق کہاں! چشم بیمار میرن صاحب قبلہ کی آنکھ کو کہتے ہیں، جس کو اچھے اچھے عارف دیکھتے رہتے ہیں۔ تم گنوار چشم بیمار کو کیا جانو؟ خیر ہنسی ہو چکی۔ اب حقیقت مفصل لکھو۔ تم زحیر کی عادت رکھتے ہو عوارضِ چشم سے تم کو کیا علاقہ؟ میرے نورِ چشم کی آنکھ کیوں دکھی؟ میں نے خط تمہیں جان کر نہیں لکھا، تم نے لکھا تھا کہ بعد عید میں وہاں آؤں گا۔ مجھ کو خط بھیجنے میں تامل ہوا لکھنے کچھ ہو کرتے کچھ ہو۔

تنخواہ کی سنو۔ دو برس کے دو ہزار دو سو پچاس روپے ہوئے۔ ننو بدہ خرچ کے جو پائے تھے، وہ کٹ گئے۔ ڈیڑھ سو متفرقات میں اٹھ گئے۔ مختارکار دو ہزار لایا۔ چونکہ میں اس کا قرضدار ہوں۔ روپے اس نے اپنے گھر میں رکھے اور مجھ سے

کہا کہ میرا حساب کیجیے۔ حساب کیا۔ سولہ سو سات کم پندرہ سو روپے ہوئے۔ میں نے کہا، میرے قرض متفرق کا حساب کر۔ کچھ اوپر گیارہ سو روپے نکلے ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ گیارہ سو روپے بانٹ دے۔ نو سو بچے آدھے تو لے، آدھے مجھے دے۔ وہ کہتا ہے پندرہ سو مجھ کو دو، پانسو سات تم لو۔ یہ جھگڑا مٹ جائے گا، تب کچھ ہاتھ آئے گا۔ خزانے سے روپیہ آگیا ہے۔ میں نے آنکھ سے دیکھا ہو تو آنکھیں پھوٹیں۔ بات رہ گئی، پت رہ گئی۔ حاسدوں کو موت آگئی، دوست شاد ہو گئے۔ میں جیسا ننگا بھوکا ہوں، جب تک جیوں گا، ایسا ہی رہوں گا۔ میرا دارہ گیر سے بچنا کرامت اسداللہی ہے، ان بیسوں کا ہاتھ آنا عطیہ یداللہی ہے۔ حاکم شہر لکھ دے کہ یہ شخص ہرگز پنسن پانے کا مستحق نہیں، حاکم صدر مجھ کو پنسن دلوائے اور پورا دلوائے؟

میرن صاحب کو دعا کہتا ہوں اور مزاج کی خبر پوچھتا ہوں۔ جواب ترکی بہ ترکی، جواب عربی بہ عربی۔ جو انھوں نے لکھا، وہ میں نے بھی لکھا۔ مجتہد العصر کو بندگی لکھوں۔ دعا لکھوں، کیا لکھوں؟ نہیں بھئی، وہ مجتہد ہوں، ہوا کریں میرے فرزند تو ہیں۔ میں دعا ہی لکھوں گا اور اسی طرح میر نصیر الدین کو بھی دعا۔

از غالب

مئی ۱۸۶۰ء

(۲۷)

جانِ غالب،

اب کے ایسا بیمار ہو گیا تھا کہ مجھ کو خود افسوس تھا۔ پانچویں دن غذا کھائی۔ اب اچھا ہوں، تندرست ہوں۔ ذی الحجہ ۱۲۷۶ھ تک کچھ کھٹکا نہیں ہے۔ محرم کی پہلی تاریخ سے اللہ مالک ہے۔ میر نصیر الدین آئے کئی بار، میں نے ان کو دیکھا نہیں۔ اب کی بار۔ دورے میں مجھ کو غفلت بہت رہی۔ احباب کے آنے کی خبر نہیں ہوئی۔ جب سے اچھا ہوا ہوں، سید صاحب نہیں آئے۔ تمھاری آنکھوں کے غبار

کی وجہ یہ ہے کہ جو مکان دلّی میں ڈھائے گئے اور جہاں سڑکیں نکلیں، جتنی گرد اُڑی، اُس کو آپ نے ازراہِ محبّت آنکھوں میں جگہ دی۔ بہ ہرحال اچھے ہو جاؤ اور جلد آؤ۔ مجتہد العصر میر سرفراز حسین کا خط آیا تھا۔ میں نے میرن صاحب کی آزردگی کے خوف سے اس کا جواب نہیں لکھا۔ یہ رقعہ اُن دونوں صاحبوں کو پڑھا دینا کہ میر سرفراز حسین صاحب اپنے خط کی رسید سے مطلع ہو جائیں اور میرن صاحب میرے پاس اُلفت پر اطلاع پائیں۔

چہار شنبہ ۶/ جون ۱۸۶۱ء از غالب

(۲۸)

میاں،

تمھارے خط کا جواب تین باتوں پر ہے۔ دو کا جواب لکھتا ہوں، تیسری بات کا جواب تم بتاؤ کہ تمھیں کیا لکھوں؟ پہلی بات میاں محمد فضل تصویر لے گئے۔ اب وہ تصویر کھینچا کریں اور تم انتظار۔ دوسری بات میر نصیر الدین آئے اور تینوں صاحبوں کا جیند کے جانے کا حال مفصل معلوم ہوا۔ حق تعالیٰ اپنے بندوں پہ رحم فرمائے۔ تیسری بات میرن صاحب کو، جب تک تم کہو، میں دلّی نہ بلاؤں۔ گویا ان کے عاشق تمھیں ہو، ہم نہیں۔ بھائی، ہوش میں آؤ۔ غور کرو۔ یہ مقدور مجھ میں نہیں کہ ان کو یہاں بلا کر ایک الگ مکان رہنے کو دوں اور اگر زیادہ نہ ہو تو تیس روپے مہینہ مقرر کروں کہ بھائی یہ لو اور دریبہ اور چاوڑی اور اجمیری دروازے کا بازار اور لاہوری دروازے کا بازار ناپتے پھرو اور اردو بازار اور خاص بازار اور بلاقی بیگم کا کوچہ اور خان دوران خاں کی حویلی کے کھنڈر گنتے پھرو۔ اے میر مہدی تو درماندہ و عاجز پانی پت میں پڑا رہے۔ میرن صاحب وہاں پڑے ہوئے دلّی دیکھنے کو ترسا کریں، سرفراز حسین نوکری ڈھونڈتا پھرے اور

میں اُن غمہائے جانگداز کی تاب لاؤں ؟ مقدور ہوتا تو دکھا دیتا کہ میں نے کیا کیا:
اے بسا آرزو کہ خاک شدہ - اللہ اللہ -
سہ شنبہ ۱۷ جمادی الثانی ۱۲۷۷ھ - ۱۸ دسمبر ۱۸۶۰ء غالب

(۲۹)

میاں،
تمھاری تحریر کا جواب یہ ہے کہ وہ تصویر جو میں نے میاں محمد افضل کو دی تھی وہ انھوں نے واپس دی اور اس کی نقل کے باب میں یہ کہا کہ ابھی تیار نہیں ہے جب وہ تیار ہو جائے گی - اُن کو روپیہ دے کر لے لوں گا - خاطر جمع رکھو
پنسن سب کو سراسر ششماہی ملنے کا حکم ہو گیا - ہر مہینے میں سود ی لو اور کھاؤ - کشمیری کٹڑہ بگڑ گیا ہے وہ اونچے اونچے در اور وہ بڑی بڑی کوٹھریاں دور ہ یہ نظر نہیں آتیں کہ کیا ہوئیں - آہنی سڑک کا آنا اور اس کی رہگزر کا صاف ہونا ہنوز ملتوی ہے - چار دن سے پُروا ہوا چلتی ہے - ابر آتے ہیں مگر صرف چھڑکاؤ ہوتا ہے - مینہ نہیں برستا، گیہوں، چنا، باجرہ تینوں اناج ایک بھاؤ ہیں - نو سیر، ساڑھے نو سیر - میر سرفراز حسین اور میرن صاحب کو میں اچھی طرح نہیں سمجھا کہ جھجر میں ہیں یا یہاں ہیں - میر نصیرالدین دو بار میرے پاس آئے، اب مجھ کو نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہیں - قاسم علی خاں قطب الاقطاب ایک دن کہتے تھے کہ میر احمد صاحب کے قبائل یہاں آئے ہوئے ہیں - آخر وہ شادی بھئی[۱] کب ہونے والی ہے اور کہاں ہونے والی ہے ؟ اس خط کا جو جواب لکھو تو سب حالات مفصل لکھو -

چہار شنبہ - نہم جنوری ۱۸۶۱ء غالب

---

[۱] یہاں سب نے "بھی" پڑھا ہے - لیکن بھی کا کوئی مطلب نہیں نکلتا، اصل لفظ "بھئی" ہے -

(۳۰)

لو صاحب،

یہ تماشہ دیکھو۔ میں تو تم سے پوچھتا ہوں کہ میر سرفراز حسین اور میر نصیرالدین کہاں ہیں، حالانکہ میر نصیرالدین شہر میں ہیں اور مجھ سے نہیں ملتے۔ میر سرفراز حسین آئے ہیں اور میرے ہاں نہیں اُترے۔ لاحول ولا قوۃ۔ اُترنا کیسا، ملنے کو بھی نہیں آئے۔ افسوس ہے، جن کو میں اپنا سمجھتا ہوں، وہ مجھ کو بیگانہ جانتے ہیں۔ اب تم یہ پوچھو کہ نصیرالدین کا دلّی میں ہونا اور مجتہد العصر کا یہاں ہونا تو نے کیونکر جانا؟ بھائی، آج جمعہ کا دِن ۲۸ جمادی الثانی کی، اور ۱۱ جنوری کی صبح کے وقت، منہ اندھیرے اسی وقت میری آنکھ کھُلی تھی۔ لحاف میں لپٹا ہوا پڑا تھا کہ ناگاہ میر نصیرالدین صاحب تشریف لائے اور فرمایا کہ اب میں جاتا ہوں اور میر حسن صاحب بھی جاتے ہیں۔ میں سمجھا میر سرفراز حسین۔ جب بعد تکرار معلوم ہوا، تو میر حسن جے پور سے آئے اور خدا جانے کہاں اترے اور اب کہاں جاتے ہیں ہے ہے! مجھے غیر سمجھا یا مرا ہوا سمجھا کہ میرے ہاں نہ آئے اور مجھ سے نہ ملے۔ اپنی سسرال میں رہے اور میکے کو چھوڑا۔ واللہ میرا جی ان کو دیکھنے کو بہت چاہتا تھا۔ اب اُٹھا ہوں۔ سردی رفع ہو لے، دھوپ نکل لے۔ آغا جان کے ہاں آدمی کو بھیجتا ہوں۔ میں کم بخت یہ بھی تو نہیں جانتا کہ آغا جان کہاں رہتے ہیں۔ اب میر احمد علی کی بی بی پاس حبش خاں کے پھاٹک آدمی بھیجوں گا۔ جب آغا جان کے گھر کا پتہ معلوم ہو جائے گا اور آدمی دیکھ آئے گا۔ اور یہ بھی معلوم کر آئے گا کہ میر حسن صاحب ہیں تو میں سوار ہو کر جاؤں گا اور ان سے ملوں گا۔ تم اس خط کا جواب جلد لکھو اور اپنے چچا کے یہاں آنے کا منشا اور اس کا حال لکھو۔ تصویر کا حال آگے لکھ چکا ہوں۔ خاطر جمع رکھو اور مجتہد العصر اور میرن صاحب کا حال لکھو۔

غالب

جمعہ ۱۱ جنوری ۱۸۶۱ء

(۳۱)

جانِ غالب،

تمھارا خط پہنچا۔ غزل اصلاح کے بعد پہنچتی ہے:

ہر اک سے پوچھتا ہوں وہ کہاں ہے[۱]

مصرع بدل دینے سے یہ شعر کس رتبہ کا ہو گیا۔ اے میر مہدی تجھے شرم نہیں آتی:

میاں یہ اہلِ دلی کی زبان ہے[۲]

ارے اب اہلِ دہلی ہندو یا اہلِ حرفہ ہیں یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں، یا گورے ہیں۔ ان میں سے تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے؟ لکھنو کی آبادی میں کچھ فرق نہیں آیا۔ ریاست تو جاتی رہی، باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں خس کی ٹٹی، پروا ہوا اب کہاں؟ وہ لطف تو اسی مکان میں تھا۔ اب میر خیراتی کی حویلی میں وہ چھت اور سمت بدلی ہوئی ہے۔ بہ ہر حال مے گزرد۔ مصیبت عظیم یہ ہے کہ قاری کا کنواں بند ہو گیا۔ لال ڈگی کے کنوئیں یک قلم کھاری ہو گئے۔ خیر کھاری ہی پانی پیتے، گرم پانی نکلتا ہے۔ پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔ جامع مسجد ہوتا ہوا راج گھاٹ کے دروازے کو چلا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازہ تک، بے مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر

۱۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا، اصل مصرع کیا تھا۔ دیوان مجروح میں یہ شعر یوں ہے:

نہیں لیتا ہوں خطِ رشک سے نام   ہر اک سے پوچھتا ہوں وہ کہاں ہے

۲۔ مجروح کے دیوان میں ایسا کوئی شعر نہیں۔ غزل کا مقطع یوں ہے:

سخن گو، یوں تو اک عالم ہے مجروحؔ   مرے استاد کی پر کیا زباں ہے

ممکن ہے پہلے یہاں "یہ اہل دلی کی زبان ہے" لکھا ہو پھر اسے بدل کر "مرے استاد کی پر کیا زباں ہے" بنا دیا ہو۔

جو پڑے ہیں، وہ اگر اُٹھ جائیں تو ہُو کا مکان ہو جائے۔ یاد کرو، مرزا گوہر کے باغیچے کے اس جانب کو کئی بانس نشیب تھا، وہ اب باغیچے کے صحن کے برابر ہو گیا۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ فصیل کے کنگورے کھلے رہے ہیں، باقی سب اٹ گیا۔ کشمیری دروازہ کا حال تم دیکھ گئے ہو۔ اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازے سے کابلی دروازے تک میدان ہو گیا۔ پنجابی کٹڑہ، دھوبی واڑہ، رامجی گنج، سعادت خاں کا کٹڑہ، جرنیل کی بی بی کی حویلی، رامجی داس گودام والے کے مکانات، صاحب رام کا باغ، حویلی، ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا۔ قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا تھا۔ اب جو کنوئیں جاتے رہے اور پانی گوہرِ نایاب ہو گیا تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا۔ اللہ اللہ۔ دلّی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے۔ واہ رے حُسنِ اعتقاد۔ ارے بندۂ خدا اردو بازار نہ رہا، اُردو کہاں؟ دلّی کہاں؟ واللہ اب شہر نہیں ہے، کمپ ہے، چھاؤنی ہے۔ نہ قلعہ، نہ شہر، نہ بازار، نہ نہر۔

الور کا حال کچھ اور ہے۔ مجھے اور انقلاب سے کیا کام؟ الگزنڈر ہیدرلے[۳] کا کوئی خط نہیں آیا۔ ظاہرا اُن کی مصاحبت نہیں، ورنہ مجھ کو ضرور خط لکھتا رہتا۔ میر سرفراز حسین اور میرن صاحب اور نصیر الدین کو دعا۔

۱۸۶۰ء از غالب

---

[۳] اس کا باپ فرانسیسی تھا، جس نے ہندوستانی عورت سے شادی کر لی تھی۔ ہدرلے اُردو کا بڑا اچھا شاعر تھا۔ زین العابدین خاں عارف سے تلمذ تھا۔ مستقل تخلص آزاد تھا لیکن کبھی کبھی الگ بھی تخلص کرتا تھا جو الگزینڈر کا مخفف تھا۔ تیس برس کی عمر میں فوت ہوا۔ اس کا دیوان اس کے چھوٹے بھائی ٹامس ہڈرلے نے ۱۸۶۳ء میں آگرے میں چھپوایا۔

(۳۲)

آؤ میاں سید زادہ آزادہ، دلی کے عاشق دلدادہ، ڈھے ہوئے اُردو بازار کے رہنے والے، حسد سے لکھنؤ کو بُرا کہنے والے، نہ دل میں مہر و آزرم نہ آنکھ میں حیا وشرم۔ نظام الدین ممنون کہاں! ذوق کہاں! مومن خاں کہاں! ایک آزردہ سو خاموش، دوسرا غالب وہ بیخود و مدہوش۔ نہ سخنوری رہی، نہ سخندانی، کس برتے پر تتا پانی۔ ہائے دلی! وائے دلی! بھاڑ میں جائے دلی۔

منشی صاحب پانی پت کے رئیسوں میں ایک شخص ہیں احمد حسین خاں ولد دلاور خاں ولد سردار خاں۔ نانا اس احمد حسین خاں کے غلام حسین خاں ولد صاحب خاں۔ اس شخص کا حال ازروئے تحقیق مشرح و مفصل لکھو قوم کیا ہے؟ عمر کیا ہے؟ طریق کیا ہے؟ احمد حسین خاں کی لیاقت ذاتی کا کیا رنگ ہے؟ طبیعت کا کیا ڈھنگ ہے؟ بھائی لکھو اور جلد لکھو۔

پنجشنبہ ۲۳ فروری ۱۸۶۱ء

(۳۳)

اے جناب میرن صاحب، السلام علیکم

حضرت آداب!

”کہو صاحب اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی“

”حضور میں کیا منع کرتا ہوں۔ میں نے تو عرض کیا تھا کہ اب وہ تندرست ہوگئے ہیں۔ بخار جاتا رہا ہے۔ صرف پیچش باقی ہے۔ وہ بھی رفع ہو جائے گی۔ میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دُعا لکھ دیتا ہوں، آپ پھر کیوں تکلیف کریں“۔

”نہیں، میرن صاحب! اس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں وہ خفا ہُوا ہوگا۔ جواب لکھنا ضرور ہے“۔

”حضرت، وہ آپ کے فرزند ہیں۔ آپ سے خفا کیا ہوں گے“۔

"بھائی، آخر کوئی وجہ تو بتاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو؟"

"سبحان اللہ، اے لو حضرت، آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے۔"

"اچھا تم باز نہیں رکھتے۔ مگر یہ تو کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں؟"

"کیا عرض کروں، سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سُنتا اور حظ اُٹھاتا۔ اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ تمھارا خط جائے۔ میں پنج شنبہ کو روانہ ہوتا ہوں۔ میری روانگی کے تین دن کے بعد آپ خط شوق سے لکھیے گا۔"

"میاں، بیٹھو، ہوش کی خبر لو۔ تمھارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ؟ میں بوڑھا آدمی، بھولا آدمی، تمھاری باتوں میں آگیا اور آج تک اسے خط نہیں لکھا۔ لاحول ولاقوۃ۔"

سنو، میر مہدی صاحب، میرا کچھ گناہ نہیں۔ میرے خط کا جواب لکھو۔ تپ تو رفع ہو گئی۔ پیچش رفع ہونے کی خبر شتاب لکھو۔ پرہیز کا بھی خیال رکھا کرو۔ یہ بڑی بات ہے کہ وہاں کچھ کھانے کو ملتا ہی نہیں۔ تمھارا پرہیز اگر ہوگا بھی تو عصمت بی بی از بے چادری ہوگا۔

حالات یہاں کے مفصل میرن صاحب کی زبانی معلوم ہوں گے۔ دیکھو، بیٹھے ہیں۔ کیا جانوں حکیم میر اشرف علی میں اور ان میں کچھ کونسل تو ہو رہی ہے۔ پنج شنبہ روانگی کا دن ٹھہرا تو ہے۔ اگر چل نکلیں اور پہنچ جائیں تو اُن سے یہ پوچھو کہ جناب ملکۂ انگلستان کی سالگرہ کی روشنی کی محفل میں تمھاری کیا گت ہوئی تھی اور یہ بھی معلوم کہ لیجیو کہ جو فارسی مثل مشہور ہے کہ "دفتر را گاؤ خورد" اس کے معنی کیا ہیں

پوچھیو اور نہ چھوڑیو جب تک یہ نہ بتائیں ۔ اس وقت پہلے تو آندھی چلی، پھر مینہ آیا ۔ اب مینہ برس رہا ہے ۔ میں خط لکھ چکا ہوں ۔ سرنامہ لکھ کر رکھ چھوڑوں گا ۔ جب تر شح موقوف ہو جائے گا تو کلیان ڈاک کو لے جائے گا ۔ میر سرفراز حسین کو دعا پہنچے ۔ اللہ اللہ تم پانی پت کے سلطان العلما، اور مجتہد العصر بن گئے ۔ کہو وہاں کے لوگ تمھیں قبلہ و کعبہ کہنے لگے یا نہیں ؟ میر نصیرالدین کو دعا کہنا ۔

مئی ۱۸۶۱ء غالب

(۳۴)

برخوردارا ،

تمھارا خط آیا ۔ حال معلوم ہوا ۔ میں اس خیال میں تھا کہ الور کا کچھ حال معلوم کر لوں ۔ اور کپتان الگزنڈر کا خط آئے اور میں اس کو میر سرفراز حسین کے مقدمے میں لکھوں ، تو اس وقت تمھارے خط کا جواب لکھوں ۔ چونکہ آج تک ان کا خط نہ آیا ۔ میں سوچا اگر اسی انتظار میں رہوں گا اور خط کا جواب نہ بھیجوں گا تو میرا پیارا میر مہدی خفا ہو گا ۔ ناچار جو کچھ الور کا حال سنا ہے وہ اور کچھ اپنا حال لکھتا ہوں ۔ ہر چند میں نے دریافت کرنا چاہا ، حکیم محمود علی کا وہاں پہنچنا اور یہ کہ وہاں پہنچنے کے بعد کیا طور قرار پایا ، کچھ معلوم نہیں ہوا ۔ صرف خبر واحد ہے کہ ان کو راؤ راجا نے صاحب ایجنٹ سے اجازت لے کر بلا لیا ہے ۔ کہتے ہیں کہ صاحب ایجنٹ الور نے راجہ کے بالغ اور عاقل ہونے کی رپورٹ صدر کو بھیجی ہے ۔ کیا عجب ہے کہ ان کا راج ان کو مل جائے ۔

مولانا غالب علیہ الرحمۃ اِن دِنوں میں بہت خوش ہیں ۔ پچاس ساٹھ جزو کی کتاب امیر حمزہ کی داستان کی اور اسی قدر حجم کی ایک جلد بوستان خیال کی آگئی

سترہ بوتلیں بادۂ ناب کی توشک خانہ میں موجود ہیں۔ دِن بھر کتاب دیکھا کرتے ہیں رات بھر شراب پیا کرتے ہیں:

کسے کیں مرادش میسر بود — اگر جم نہ باشد سکندر بود

میر سرفراز حسین کو اور میرن صاحب کو اور میر نصیر الدین کو دعائیں اور دیدار کی آرزو ئیں۔

(۳۵)

میاں،

کِس حال میں ہو؟ کس خیال میں ہو؟ کل شام کو میرن صاحب روانہ ہُوئے۔ یہاں اُن کی سسرال میں قصے کیا کیا نہ ہُوئے۔ ساس اور سالیوں نے اور بی بی نے آنسوؤں کے دریا بہا دیے۔ خوش دامن صاحبہ بلائیں لیتی تھیں۔ سالیاں کھڑی ہوئی دعائیں دیتی تھیں۔ بی بی مانند صورت دیوار چپ، جی چاہتا تھا۔ چیخنے کو مگر ناچار چُپ، وہ تو غنیمت تھا کہ شہر ویران، نہ کوئی جان نہ پہچان ورنہ ہمسائے میں قیامت برپا ہو جاتی۔ ہر ایک نیک بخت اپنے گھر سے دوڑی آتی۔ امام ضامن علیہ السلام کا روپیہ بازو پہ باندھا گیارہ روپے خرچ راہ دیے۔ مگر ایسا جانتا ہوں کہ میرن صاحب اپنے جد کی نیاز کا روپیہ راہ ہی میں اپنے بازو پر سے کھول لیں گے اور تم سے صرف پانچ روپے ظاہر کریں گے۔ اب سچ جھوٹ تم پر کھل جائے گا۔ دیکھنا کہ یہی ہوگا کہ میرن صاحب بات تم سے چھپائیں گے۔ اس

۱؎ مجموعۂ خطوطِ غالب میں اس خط کو دسمبر ۱۸۶۲ء کا قرار دیا گیا ہے جو یقیناً غلط ہے اس لیے کہ اس میں کپتان الگزنڈر ہدرلے کے خط کا انتظار مذکور ہے اور الگزینڈر ہدرلے ۲ جولائی ۱۸۶۱ء کو فوت ہوا جیسا کہ مجموعۂ مذکورہ کے خط ۳۵ سے ظاہر ہے۔ زیر غور خط لازماً جولائی ۱۸۶۱ء سے پیشتر کا ہے۔

سے بڑھ کر ایک بات اور ہے اور وہ محلِ غور ہے، ساس غریب نے بہت سی جلیبیاں اور تودہ قلاقند ساتھ کو دیا ہے اور میرن صاحب نے اپنے جی میں یہ ارادہ کیا ہے کہ جلیبیاں راہ میں چٹ کریں گے اور قلاقند تمھاری نذر کر کے تم پر احسان دھریں گے۔ "بھائی میں دلّی سے آیا ہوں۔ قلاقند تمھارے واسطے لایا ہوں" زنہار نہ باور کیجیو۔ مالِ مفت سمجھ کر لے لیجیو۔ کون گیا ہے؟ کون لایا ہے؟ کلو، ایاز کے سر پہ قرآن رکھو، کلیان کے ہاتھ گنگا جلی دو، بلکہ میں بھی قسم کھاتا ہوں کہ اِن تینوں میں سے کوئی نہیں لایا۔ واللہ میرن صاحب نے کسی سے نہیں منگایا اور سنو مولوی مظہر علی صاحب لاہوری دروازہ کے باہر صدر بازار تک اُن کو پہنچا گئے۔ رسمِ مشایعت عمل میں آئی۔ اب کہو بھائی کون بُرا اور کون اچھا ہے؟ میرن صاحب کی نازک مزاجیوں نے کھیل بگاڑ رکھا ہے۔ یہ لوگ تو اُن پر اپنی جان نثار کرتے ہیں، عورتیں صدقہ جاتی ہیں، مرد پیار کرتے ہیں۔

مجتہد العصر سلطان العلما۔ مولانا سرفراز حسین کو میری دُعا کہنا اور کہنا: حضرت ہم تم کو دعا کہیں اور تم ہم کو دعا دو۔ میاں کس قِصّے میں پھنسا ہے؟ فقہ پڑھ کر کیا کرے گا؟ طب و نجوم و ہیئت و منطق و فلسفہ پڑھ جو آدمی بنا چاہے، خدا کے بعد نبی اور نبی کے بعد امام، یہی ہے مذہبِ حق والسلام والاکرام، علی علی کیا کر اور فارغ البال رہا کر۔

مئی سنہ ۱۸۶۱ء

غالب

(۳۶)

سید صاحب،

کل پہر دن رہے تمہارا خط پہنچا۔ یقین ہے کہ اسی وقت یا شام کو میر سرفراز حسین

تمھارے پاس پہنچ گئے ہوں۔ حال سفر کا جو کچھ ہے ان کی زبانی سن لوگے۔ میں کیا لکھوں۔ میں نے بھی جو کچھ سنا ہے، انھیں سے سنا ہے۔ اُن کا اس طرح ناکام پھر آنا میری تمنا اور میرے مقصود کے خلاف ہے، لیکن میرے عقیدے اور میرے تصوّر کے مطابق ہے۔ میں جانتا تھا کہ وہاں کچھ نہ ہوگا۔ سو روپے کی ناحق زیر باری ہوئی چونکہ یہ زیر باری میرے بھروسے پر ہوئی تو مجھے شرمساری ہوئی۔[1] میں نے اس جھیاسٹھ برس کی عمر میں اس طرح کی شرمساریاں اور روسیاہیاں بہت اٹھائی ہیں۔ جہاں ہزار داغ ہیں، ایک ہزار ایک سہی۔ میر سرفراز حسین کی زیر باری سے دل کڑھتا ہے۔

وبا کو کیا پوچھتے ہو؟ قدر انداز قضا کے ترکش میں یہی ایک تیر باقی تھا، قتل ایسا عام، لوٹ ایسی سخت، کال ایسا بڑا، وبا کیوں نہ ہو؟ لسان الغیب[2] نے دس برس پہلے فرمایا،

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام　　　اک مرگ ناگہانی اور ہے

میاں ۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی۔ میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا۔ واقعی اس میں میری کسر شان تھی۔ بعد رفع فساد ہوا سمجھ لیا جائے گا۔[3]

---

[1] غالب نے سرفراز حسین اور میرن کو رام پور بھیجا تھا۔ وہاں ملازمت کی کوئی صورت نہ بنی۔ ان فقروں میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

[2] یعنی غالبؔ

[3] غالب نے ایک قطعہ کہا تھا: من کہ باشم کہ جاوداں باشم　چوں نظیری نہ ماند طالب مرد
در بہ پرسند در کدامیں سال　مرد غالب بگو کہ "غالب مرد"

اس سے ۱۲۷۷ھ نکلتے تھے اور غالبؔ نے دوستوں کو لکھا تھا کہ میں ۱۲۷۷ھ میں مر جاؤں گا۔ یہ پیش گوئی غلط ثابت ہوئی تو اب نکتہ نوازی کر رہے ہیں کہ ۱۲۷۷ھ میں اس لیے نہ مرا کہ وبا پھیل گئی اور اس میں میرا مرنا باعث کسر شان تھا۔ وبا پھیلے کی تھی، اس لیے اسے "فساد ہوا" سے تعبیر کیا۔

کلیات اُردو کا چھاپا تمام ہُوا۔ اغلب کہ اِسی ہفتے ہیں غایت اِسی مہینے میں ایک نسخہ بسبیل ڈاک تم کو پہنچ جائے گا۔

کلیات نظم فارسی کے چھاپنے کی بھی تدبیر ہو رہی ہے۔ اگر ڈول بندھ گیا، تو وہ بھی چھاپا جائے گا۔ "قاطع برہان" کے خاتمے میں کچھ فوائد بڑھائے گئے ہیں، اگر مقدور مساعدت کرے گا تو میں بے شرکت غیر اس کو چھپواؤں گا۔ مگر یہ خیال محال ہے۔ میرے مقدور کی نیاری کا حال مجتہد العصر کو معلوم ہے۔ واللہ علیٰ کل شیٔ قدیر خدا کا بندہ ہوں۔ علیؓ کا غلام۔ میرا خدا کریم، میرا خداوند سخی

"علی دارم چہ غم دارم"

وبا کی آنچ مدھم ہو گئی ہے۔ ہاں سات دِن بڑا زور شور رہا۔ پرسوں خواجہ مرزا ولد خواجہ امان مع اپنی بی بی بچّوں کے دلّی میں آیا۔ کل رات کو اس کا نو برس کا لڑکا ہیضہ کر کے مر گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ الور میں بھی وبا ہے۔ الگزنڈر ہڈرلے مشتہر بہ الک صاحب مر گیا۔ واقعی بے تکلف وہ میرا عزیز اور ترقی خواہ اور راج میں اور مجھ میں متوسط تھا۔ اِس جرم میں ماخوذ ہو کر مرا۔ خیر، یہ عالم اسباب ہے۔ اس کے حالات سے ہم کو کیا؟

جولائی ۱۸۶۱ء

(۳۷)

بھائی، تم سچ کہتے ہو:

بر سرِ فرزند آدم ہر چہ آید بگزرد

لیکن مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ یہ زیبا باری میری تحریر کے بھروسے پر ہوئی اور خلاف میری مرضی کے ہُوئی۔ جس طرح یہ آئے ہیں، اگرچہ میری طبیعت اور میری خواہش کے منافی ہے۔ لیکن و اللہ میرے عقیدے اور تصوّر اور قیاس

کے مطابق ہے۔ یعنی میں بھی سمجھا تھا کہ البتہ یوں ہی ہو گا۔

"دیوان اُردو" چھپ چکا ہے۔ ہائے لکھنو کے چھاپے خانے نے جس کا دیوان چھاپا، اس کو آسمان پر چڑھا دیا حُسن خط سے الفاظ کو چمکا دیا۔ دلّی پر اور اس کے پانی پر اور اس کے چھاپے پر لعنت۔ صاحب دیوان کو اس طرح یاد کرنا جیسے کوئی کتے کو آواز دے۔ ہر کاپی دیکھتا رہا ہوں۔ کاپی نگار اور تھا، متوسط جو کاپی میرے پاس لایا کرتا تھا وہ اور تھا۔ اب جو دیوان چھپ چکے، حق التصنیف ایک مجھ کو ملا۔ غور کرتا ہوں تو وہ الفاظ جوں کے توں ہیں یعنی کاپی نگار نے نہ بنائے۔ ناچار غلط نامہ لکھا۔ وہ چھپا بہر حال خوش و ناخوش کئی جلدیں مول لوں گا۔ اگر خدا چاہے تو اسی ہفتے میں تین مجلد اصحاب ثلثہ[1] کے پاس پہنچ جائیں۔ نہ میں خوش ہوا ہوں نہ تم خوش ہو گے۔

اور یہ جو لکھتے ہو کہ یہاں خریدار ہیں، قیمت لکھ بھیجو۔ میں دلال نہیں، سوداگر نہیں، مہتمم مطبع نہیں۔ مطبع احمدی کے مالک محمد حسین خاں، مہتمم مرزا امو جان، مطبع شاہدرہ میں، محمد حسین خاں دلی شہر رائے ماں کے کوچے میں مصوّروں کی حویلی کے پاس۔ قیمت کتاب چھ آنے، محصول ڈاک خریدار کے ذمّے۔ طالبان کتاب کو اطلاع دو۔ وہ چار دس پانچ جلدیں جس کو منگانی ہوں، محمد حسین خاں کے نام پر، دلی رائے ماں کے کوچے، مصوّروں کی حویلی کا پتہ لکھ کر خط ڈاک میں بھجوا دو۔ کتاب ڈاک میں پہنچ جائے گی۔ قیمت چاہو نقد چاہو ٹکٹ ارسال کرو۔ مجھ کو اور تم کو کیا؟ جو کہے اس کو یہ جواب دے دو۔

وبا تھی کہاں جو میں لکھوں کہ اب کم ہے یا زیادہ؟ ایک چھیاسٹھ برس کا مرد[2] ایک چونسٹھ برس کی عورت[3]، ان دونوں میں سے ایک بھی مرتا تو ہم جانتے

---

[1] میر مہدی مجروح، میرن اور سرفراز حسین [2] غالب [3] بیگم غالب

کہ ہاں وبا آئی تھی۔ تف بریں وبا! پنجشنبہ ۸۔ ماہ اگست کی قمری کے مہینے کا حال کچھ معلوم نہیں۔ کل شام کو دو دو ہونڈھے رکھ کر کئی آدمی دیکھا کیے۔ ہلال نظر نہیں آیا۔

۸ اگست ۱۸۶۱ء نجات کا طالب غالب

(۳۸)

ہاں صاحب، کیا چاہتے ہو؟ مجتہد العصر کے مسودے کو اصلاح دے کر بھیج دیا۔ اب اور کیا لکھوں؟ تم میرے ہم عمر نہیں، جو سلام لکھوں۔ میں فقیر نہیں جو دعا لکھوں۔ تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ لفافے کو کھیدا کرو، مسودہ کو بار بار دیکھا کرو، پاؤ گے کیا؟ یعنی تم کو وہ محمد شاہی روشیں پسند ہیں۔ یہاں خیریت ہے۔ وہاں کی عافیت مطلوب ہے۔ خط تمہارا بہت دن کے بعد پہنچا۔ جی خوش ہوا۔ مسودہ بعد اصلاح کے بھیجا جاتا ہے۔ برخوردار میر سرفراز حسین کو دینا اور دعا کہنا اور وہاں حکیم میر اشرف علی اور میر افضل علی کو بھی دعا کہنا۔ لازمہ سعادت مندی یہ ہے کہ ہمیشہ اسی طرح خط بھیجتے رہو۔

کیوں، سچ کہیو، اگلوں کے خطوط کی تحریر کی یہی طرز تھی؟ ہائے کیا اچھا شیوہ ہے۔ جب تک یوں نہ لکھو، وہ خط ہی نہیں ہے۔ چاہ بے آب ہے، ابر بے باراں ہے، نخل بے میوہ ہے، خانہ بے چراغ ہے، چراغ بے نور ہے۔ ہم جانتے ہیں، تم زندہ ہو۔ تم جانتے ہو، ہم زندہ ہیں۔ امر ضروری لکھ لیا، زوائد کو اور وقت پہ موقوف رکھا اور اگر تمہاری خوشنودی اسی طرح کی نگارش پہ منحصر ہے، تو بھائی ساڑھے تین سطریں ویسی بھی میں نے لکھ دیں۔ کیا قضا نہیں پڑھتے اور وہ مقبول نہیں ہوتی؟ خیر ہم نے بھی وہ عبارت جو مسودہ کے ساتھ لکھی تھی، اب لکھ بھیجی۔ معاف کرو، خفا نہ ہو۔

میر نصیر الدین ایک بار آئے تھے۔ پھر نہ آئے۔ فارسی نئی میں نے کہاں لکھی کہ تمہارے چچا کو یا تم کو بھیج دوں؟ نواب فیض محمد خاں[1] کے بھائی حسن علی خاں مر گئے۔ حامد[2] علی خاں کی ایک لاکھ تیس ہزار کئی سو روپے کی ڈگری بادشاہ پہ ہو گئی۔ کلو داروغہ بیمار ہو گیا تھا۔ آج اس نے غسل صحت کیا۔ باقر علی خان کو مہینہ بھر سے تپ آتی ہے۔ حسین علی خاں کے گلے میں دو غدود ہو گئے ہیں۔ شہر چپ چاپ، نہ کہیں پھاوڑا بجتا ہے، نہ سرنگ لگا کر کوئی مکان اڑایا جاتا ہے نہ آہنی سڑک آتی ہے، نہ کہیں دمدمہ بنتا ہے۔ دلی شہر، شہر خموشاں ہے۔ کاغذ نبڑ گیا ورنہ تمہارے دل کی خوشی کے واسطے ابھی اور لکھتا۔

یکم شنبہ۔ ۲۲ ستمبر ۱۸۶۱ء غالب

(۳۹)

صاحب۔ آج تمہارا خط دوپہر کو آیا۔ اس ہی میں نے مسودہ تاریخ کا پایا۔ قلمدان میں رکھ لیا۔ میر سرفراز حسین کو بھیج دیا۔ کل وہ کہتے تھے کہ انتیس روپے کو تین گاڑیاں مقرر ہو گئی ہیں۔ میں کل یعنی آج شام کو سوار ہو جاؤں گا۔ اب اس وقت جو میں یہ خط لکھ رہا ہوں، پہر دن باقی ہے۔ لکھ کر کھلا رکھ چھوڑوں گا۔ شام کو مجتہد العصر میرے گھر ضرور آئیں گے۔ اگر آج جائیں گے تو واسطے تودیع کے اور اگر نہ جائیں گے تو موافق معمول کے آئیں گے۔ اُن کے جانے نہ جانے کا حال صبح اسی ورق پر لکھ کر خط بند کر کے بھیج دوں گا۔ خدا کرے اُردو کی نثر کا لفافہ انھوں نے ڈاک میں بھیج دیا ہو۔ شام کو مجھے دے جائیں تو میں کل اس خط کے ساتھ اسے

---

[1] والی جھجر

[2] اعتماد الدولہ میر فضل علی کے داماد، دہلی کے آخری دور کے مشہور امیر اور غالب کے عزیز دوست لکھنؤ سے دہلی آئے تھے تو اپنا روپیہ شاہی خزانے میں داخل کر دیا تھا۔ ڈگری کا تعلق غالباً اسی روپے کے کسی حصہ سے تھا۔

بھی بھجوادوں۔

مہاراج[1] اگر دورے کو گئے تو کیا اندیشہ ہے۔ گرمی کا موسم ہے۔ لنبا چوڑا سفر کیوں کریں گے؟ آٹھ سات دن میں پھر آئیں گے۔ یہاں کی تلاش کا نتیجہ دیکھو تب کہیں جائیو۔

میرن صاحب کی تمھاری چوماچاٹی کے لکھنے کا مجھ میں دم نہیں۔ تم جا تو وہ جانیں۔ کلیات کے چھاپے کی حقیقت سنو۔ ساٹھ صفحے چھاپے گئے تھے کہ مولوی ہادی علی مصحح بیمار ہو گئے[2]۔ کاپی نگار حسنی اپنے گھر گیا، اب دیکھئے کب چھاپہ شروع ہو۔ "قاطع برہان" کا چھاپہ ختم ہوا۔ ایک جلد بطریق نمونہ آگئی۔ میں نے پچاس جلدوں کی درخواست پہلے سے دے رکھی ہے۔ اب پچاس روپے بھیجوں، تو انچاس جلدیں منگواؤں۔ دیکھیے نو من تیل کب میسر ہو اور رادھا کب ناچے۔

میاں، کل شام کو میر سرفراز حسین میرے گھر نہیں آئے یا تو الور کو مجھ سے بغیر رخصت ہوے گئے یا نہیں گئے۔ میں تو آج جمعہ ۱۶۔ مئی صبح کے وقت یہ خط ڈاک میں بھیجتا ہوں۔

۱۶ مئی ۱۸۶۲ء نجات کا طالب غالب

(۴۰)

سید صاحب،

اچھا ڈھکوسلا نکالا ہے کہ بعد القاب کے شکوہ شروع کر دینا اور میرن صاحب

---

[1] مہاراجا الور [2] کلیات نظم فارسی

[3] اس خط کے آغاز میں تاریخ یوں درج ہے: "پنجشنبہ ۱۵ ذی قعدہ و مئی ۱۸۶۲ء یعنی ذی قعدہ ۱۲۷۸ھ اور مئی ۱۸۶۲ء کی ۱۵ تاریخ تھی۔ آخری سطروں میں مرقوم ہے: "آج جمعہ ۱۶ مئی صبح کے وقت" اصل خط ۱۵۔ ہی کو لکھا تھا۔ آخری سطریں دوسرے دن جمعہ کو لکھیں۔

کو اپنا ہم زبان کر لینا۔ میں میر مہدی نہیں کہ میرن صاحب پر مرتا ہوں۔ میر سرفراز حسین نہیں کہ ان کو پیار کرتا ہوں۔ علیؑ کا غلام اور سادات کا معتقد ہوں۔ اس میں تم بھی آ گئے۔ کمال یہ کہ میرن صاحب سے محبت قدیم ہے۔ دوست ہوں، عاشق زار نہیں۔ بندہ مہر و وفا ہوں، گرفتار نہیں۔ تمہارے بھائی نے سخت مشوش بلکہ نعل در آتش کر رکھا ہے۔ ایک سلام اصلاح کے واسطے بھیجا اور لکھا کہ بعد محرم کے میں بھی آؤں گا۔ میں نے سلام رہنے دیا اور منتظر رہا کہ ڈاک میں کیوں بھیجوں؟ وہ آئیں گے تو یہیں ان کو دوں گا۔ محرم تمام ہوا۔ آج سہ شنبہ غرّہ صفر ہے۔ حضرت کا پتا نہیں۔ ظاہر ابرسات نے آنے نہ دیا۔

برسات کا نام آ گیا سو پہلے مجملاً سنو: ایک غدر کالوں کا[1]، ایک ہنگامہ گوروں کا، ایک فتنہ انہدام مکانات کا، ایک آفت وبا کی، ایک مصیبت کال کی، اب یہ برسات جمیع حالات کی جامع ہے۔ آج اکیسواں دن ہے، آفتاب اس طرح نظر آ جاتا ہے جس طرح بجلی چمک جاتی ہے۔ رات کو کبھی کبھی اگر تارے دکھائی دیتے ہیں تو لوگ ان کو جگنو سمجھ لیتے ہیں۔ اندھیری راتوں میں چوروں کی بن آئی۔ کوئی دن نہیں کہ دو چار گھر کی چوری کا حال نہ سنا جائے۔ مبالغہ نہ سمجھنا۔ ہزارہا مکان گر گئے سیکڑوں آدمی جا بجا دب کر مر گئے۔ گلی گلی ندی بہ رہی ہے قصہ مختصر، وہ ان کال تھا کہ مینہ نہ برسا، اناج نہ پیدا ہوا، یہ پن کال ہے کہ پانی ایسا برسا کہ بوئے ہوئے دانے بہ گئے جنھوں نے ابھی نہیں بویا تھا وہ بونے سے رہ گئے۔ سن لیا دلی کا حال؟ اس کے سوا کوئی نئی بات نہیں۔ جناب میرن صاحب کو دعا۔

سہ شنبہ یکم صفر ۱۲۷۹ھ ۲۹ جولائی ۱۸۶۳ء غالب

---

[1] یہ مضمون نظیری کے ایک شعر میں بھی بندھا ہے "آفتاب امروز چوں برق از دیار ما گذشت"

(۱۳۱)

برخوردار نورِ چشم میر مہدی کو بعد دعائے حیات و صحت کے معلوم ہو۔
بھائی، تم نے بخار کو کیوں آنے دیا؟ تپ کو کیوں چڑھنے دیا؟ کیا بخار میرن صاحب کی صورت میں آیا تھا۔ جو تم مانع نہ آئے؟ کیا تپ ابن بن کر آئی تھی، جو اس کو روکتے ہوئے شرمائے۔ حکیم اشرف علی ابھی آگئے ہیں۔ کہتے تھے کہ میں نے نسخہ لکھ کر آج ڈاک میں بھیج دیا ہے۔ چونکہ یہ خط بھی آج روانہ ہوتا ہے کیا عجب ہے کہ دونوں خط ایک دن، بلکہ ایک وقت پہنچیں۔ دل تمہارے واسطے بہت کڑھتا ہے۔ حق تعالیٰ تم کو جلد شفا دے اور تمہاری تندرستی کی خبر مجھ کو سنائے۔

سنو میاں سرفراز حسین ہزار برس میں تم نے مجھ کو ایک خط لکھا۔ وہ بھی اس طرح کہ جیسا جلال اسیر کہتا ہے:

بغیر در شکنم آب است رو بما دارد

پڑھتا ہوں اس خط کو اور ڈھونڈھتا ہوں کہ میرے واسطے کون سی بات ہے مجھ کو کیا پیام ہے۔ کچھ نہیں۔ شاید دوسرے صفحہ میں کچھ ہو۔ ادھر خاتمہ بالخیر ہے یارب سرنامہ میرے نام کا، آغاز تحریر میں القاب میرا، پھر سارے خط میں میرن صاحب کا جھگڑا۔ یہ کیا سبب ہے؟ میں ایسے خط کا جواب کیوں لکھوں؟ میری بلا لکھے۔ اب جو تم خط لکھو گے اور اس میں اپنے بھائی کی خیر و عافیت رقم نہ کرو گے اور میرن صاحب کا نام اور ان کے لیے سلام تک بھی اس میں نہ ہوگا۔ تو میں اس کا جواب آنکھوں سے لکھوں گا۔ اور ہاں میاں مچھر تم نے میر اشرف علی کو کیا لکھا کہ ہم نے سنا ہے کہ چچا نے اس کا مرنا سنا ہوگا۔ اس غریب کا قول یہ ہے کہ میری دونوں بہنیں اور پانچ بھانجیاں پانی پت میں ہیں۔ کیا چچا کو نہ معلوم

ہو گا کہ کون سی لڑکی مری؟ کاش اس کے باپ کا نام لکھتے تاکہ میں جانتا کہ کون سی بھانجی مری ہے؟ اب میں کس کا نام لے کر روؤں اور کس کی فاتحہ دلواؤں؟ اس امر میں حق بجانب اس مظلوم کے ہے۔ توضیح بقید نام لکھو۔

(۴۳)

واہ حضرت!

کیا خط لکھا ہے؟ اس خرافات کے لکھنے کا فائدہ؟ بات اتنی ہے کہ میرا پلنگ مجھ کو ملا، میرا بچھونا مجھ کو ملا، میرا حجام مجھ کو ملا، میرا بیت الخلا مجھ کو ملا۔ رات کا وہ شور "کوئی آئیو، کوئی آئیو" فرو ہو گیا۔ میری جان بچی۔ میرے آدمیوں کی جان بچی:

اکنوں شب من شب است روزم روز است

بھئی، تم نے یہ نہ لکھا کہ میرن صاحب کو میرا خط پہنچا یا نہ پہنچا۔ میں گمان کرتا ہوں کہ نہیں پہنچا۔ اگر پہنچتا تو بے شک وہ تمھاری نظر سے گزرتا اور میرن صاحب اس کی اصل حقیقت تم سے پوچھتے اور اس صورت میں یہ بھی ضرور تھا کہ تم اس واہیات کے بدلے مجھ کو وہ روداد لکھتے جو میرن صاحب میں اور تم میں پیش آئی۔ پس اگر، جیسا کہ میرا گمان ہے، خط نہیں پہنچا تو خیر جانے دو۔ اگر خط پہنچا ہے تو میرن صاحب کے خط کے جواب لکھوانے میں تم نے میرا ناک میں دم کر دیا تھا، اب اُن سے میرے خط کے جواب کا تقاضا کیوں نہیں کرتے؟ حسن بھی کیا چیز ہے۔ نادر کا اتنا خوف نہیں، جتنا حسین آدمی کا ڈر ہوتا ہے۔ تم اُن سے خواہشِ وصال کرتے ہوئے ڈرو، میرے خط کے جواب کے باب میں کیوں نہیں کہتے؟ نہ صاحب کچھ بات نہیں۔ میرے خط کا جواب اُن سے لکھوا کر بھجواؤ۔

یہاں کا وہ حال ہے جو دیکھ گئے ہو۔ پانی گرم، ہوا گرم، تپیں مستولی،

اناج مہنگا۔ بیچارہ منشی میر احمد حسین کا بھتیجا، میر امداد علی آشوب کا بیٹا، میر محمد شب گزشتہ کو گزر گیا۔ آج صبح کو اس کو دفن کر آئے۔ جوان صالح، پرہیزگار، مومنین کا پیش نماز تھا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

"مجتہد العصر" کا حکم بجا لاؤں گا اور نہ رئیس کو بلکہ مدار المہام ریاست کو لکھوں گا۔ رئیس میرے سوال کے جواب کو قلم انداز کر جائے گا اور مدار المہام امر واقعی لکھ بھیجے گا۔

میرن صاحب کو دعا اور کہنا کہ بھلا صاحب تم نے ہمارے خط کا جواب کیوں نہیں لکھا؟ ہم بھی تمہاری طرز کا اتباع کریں گے۔ حکیم میر اشرف علی کو دعا کہنا اور کہنا کہ اگر تم میں ان میں راہ و رسم تعزیت و تہنیت ہو تو میر احمد حسین کو خط لکھو اور یہ بھی ان کو معلوم ہو کہ حفیظ یہاں آیا ہوا ہے۔ قبائل تمہارے یہیں ہیں۔ اگر وہاں کچھ رسائی حاصل ہو تو خیر، ورنہ یہاں کیوں نہ چلے آؤ:

میں بھولا نہیں تجھ کو اے میری جان کروں کیا کہ یاں گر رہے ہیں مکان

برسات کا حال نہ پوچھو، خدا کا قہر ہے۔ قاسم خان کی گلی سعادت خاں کی نہر ہے۔ میں جس مکان میں رہتا ہوں، عالم بیگ خاں کے کٹڑے کی طرف کا دروازہ گر گیا۔ مسجد کی طرف کے والان کو جاتے ہوئے جو دروازہ تھا، گر گیا۔ سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں۔ صبح کے بیٹھنے کا حجرہ جھک رہا ہے۔ چھتیں چھلنی ہوگئی ہیں۔ مینہ گھڑی بھر برسے، تو چھت گھنٹہ بھر برسے۔ کتابیں، قلمدان سب توشے خانے میں۔ فرش پر کہیں لگن رکھا ہوا، کہیں چلمچی دھری ہوئی۔ خط لکھوں کہاں بیٹھ کر؟ چار پانچ دن سے فرصت ہے۔ مالک مکان کو فکر مرمت ہے۔ آج ایک امن کی صورت نظر آئی، کہا کہ آؤ میر مہدی کے خط کا جواب لکھوں۔

الور کی ناخوشی، راہ کی محنت کشی، تپ کی حرارت، گرمی کی شرارت، پاس

کا عالم، کثرتِ اندوہ و غم، حال کی فکر، مستقبل کا خیال، تباہی کا رنج، آوارگی کا ملال، جو کچھ کہو وہ کم ہے۔ بالفعل تمام عالم کا ایک سا عالم ہے سنتے ہیں کہ نومبر میں مہاراجا کو اختیار ملے گا۔ مگر وہ اختیار ایسا ہوگا جیسا خدا نے خلق کو دیا ہے سب کچھ اپنے قبضۂ قدرت میں رکھا، آدمی کو بدنام کیا ہے۔

بارے رفعِ مرض کا حال لکھو۔ خدا کرے تپ جاتی رہی ہو، تندرستی حاصل ہو گئی ہو۔ میر صاحب کہتے ہیں: "تندرستی ہزار نعمت ہے"

ہائے! پیش مصرع مرزا قربان علی بیگ سالک نے کیا خوب بہم پہنچایا ہے۔ مجھ کو پسند آیا ہے:

تنگ دستی اگر نہ ہو سالکؔ   تندرستی ہزار نعمت ہے

مجتہد العصر میر سرفراز حسین صاحب کو دعا۔ ہا ہا ہا۔ میر افضل علی صاحب کہاں ہیں؟ حضرت یہاں تو اس نام کا کوئی نہیں ہے۔ لکھنؤ کے مجتہد العصر کے بھائی کا نام میرن صاحب تھا۔ جے پور کے مجتہد العصر کے بھائی میرن صاحب کیوں نہ کہلائیں۔ ہاں بھائی میرن صاحب بھلا ان کو ہماری دعا کہنا

جمعہ ۱۶ ستمبر ۱۸۶۲ء   غالبؔ

(۴۳)

میری جان!

خط نہ بھیجو اور میرے خط کا انتظار کرو۔ اس کی وجہ میں نہیں سمجھا۔ تمہارا خط آئے اور میں جواب نہ لکھوں تو گنہ گار۔ نواب یوسف علی خاں ناظم[1] کا دیوان میرے پاس کہاں؟ نواب صاحب نے بہ سبیلِ ارمغان مجھے ایک ورق بھی نہیں بھیجا۔ یہاں کچھ نسخے بکتے گئے تھے، میں نے ایک مول لے کر نواب مصطفے خاں کو جہانگیر آباد

[1] والی رام پور

بھیجا تھا۔ اب محمد بخش اور رہبر جی سے کہہ دوں گا۔ اگر کسی نے لا دیا تو ایک جلد سرفراز حسین کو بھیج دوں گا۔

توقع نوکری کا حال مجھ کو مفصّل معلوم ہے۔ یہ بھی بادشاہی تنخواہ ہوئی کہ روپیہ دے کر مول لیں اور کہیں کہ تم نے نذرانہ دیا ہے بہ شرط نوکری ہو جانے کے برس چھ مہینے تک اپنا دیا ہوا روپیہ مسترد کرنا ہوگا، نوکری مفت میں[۲]۔

"مقدر" مذکر اور "تقدیر" مونث ہے۔ کون کہے فلانے کی مقدر اچھی ہے؟ کون کہے گا ڈھکے کا تقدیر بُرا ہے؟ یہ مسئلہ صاف ہے مذبذب نہیں۔ کوئی بھی "مقدر" کو مونث نہ کہتا ہوگا، تم کو تردّد کیوں ہُوا؟

"جواں مرد"۔ "جواں بخت"۔ "جواں دولت"۔ "جواں عمر"۔ "جواں سال" "جواں خرد"۔ "جواں مرگ" یہ الفاظ مقررہ اہلِ زبان ہیں کبھی مقلوب و معکوس نہیں آئے۔

"اودھ اخبار" میں بادشاہ[۳] کے مرنے کی خبر لکھی دیکھی، مگر پھر کہیں سے تصدیق نہیں ہوئی۔ نریندر سنگھ راجۂ پٹیالہ بے تکلف مر گیا۔ مسجدِ جامع کی واگذاشت کی خبر مشہور ہے، اگر سچ ہو جائے تو کیا دور ہے؟ شاہ اودھ کی املاک کی بھی واگزاشت کی خبر مشہور ہے۔

لو کہو، اب اور کیا لکھوں؟ سرِ راہ کی منڈیر کے پاس جو تخت بچھا ہے۔ اس پر بیٹھا ہوا دھوپ کھا رہا ہوں۔ اور خط لکھ رہا ہوں۔ بس، اب یہ لکھنا

---

[۲] کارکنانِ قلعۂ معلّٰی نے آخری دور میں یہ دستور ٹھہرا لیا تھا کہ نذرانے کے نام سے رقمیں لے کر نوکریاں دیتے اور جب تک نذرانے کی رقم پوری نہ ہو جاتی۔ نوکری مفت میں دینی پڑتی تھی۔ جن لوگوں کی تنخواہیں کئی کئی مہینوں کی چڑھ جاتیں۔ اُن کو مجموعی واجب الادا رقم کا ایک حصّہ دے کر پوری رقم کی رسید لی جاتی تھی۔

[۳] ابوظفر بہادر شاہ ثانی

باقی ہے کہ مجتہد العصر کو دعا اور میر افضل علی صاحب کو دعائیں۔

صبح پنجشنبہ ۳ ر جمادی الاول ۱۲۷۹ھ

مطابق ۲۰ ر نومبر سال حال ۱۸۶۲ء غالب

(۴۴)

جویائے حالِ دہلی والو سلام لو۔

مسجد جامع واگزاشت ہو گئی[1] چتلی قبر کی طرف سیڑھیوں پر کبابیوں نے دکانیں بنالیں۔ انڈا مرغی کبوتر بکنے لگا۔ دس آدمی مہتمم ٹھہرے: مرزا الٰہی بخش[2]، مولوی صدر الدین[3] تفضل حسین خاں، تین یہ سات اور ۷۔ نومبر ۱۴ جمادی الاول سال حال (۱۲۷۹ھ ۱۸۶۲ء) جمعہ کے دن ابوالظفر سراج الدین بہادر شاہ قید فرنگ و قید جسم سے آزاد ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

جاڑا ہو رہا ہے۔ ہمارے پاس شراب آج کی اور ہے۔ کل سے رات کو نری انگیٹھی پر گزارا ہے، بوتل گلاس موقوف۔

راجا پٹیالہ مر گیا۔ مہندر سنگھ اس کے خلف پر خطاب فرزندی اور القاب بحال و برقرار رہا۔ بالفعل دیوان نہال چند کام کر رہا ہے ظاہرا جو رنگ اس ریاست کا ہونے والا ہے، وہ نواب گورنر جنرل کے آنے پر کھلے گا اور

---

1. یعنی دہلی کی جامع مسجد جس پر انگریزوں نے غدر کے بعد قبضہ کر لیا تھا۔ پہلے یہ تجویز پیش ہوئی تھی کہ اسے ڈھا دیا جائے۔ پھر اسے فوجی قبضہ میں لے لیا۔ ۱۸۶۲ء میں ایک انتظامی کونسل بنا کر مسجد واگزار کیا۔

2. میرزا الٰہی بخش شاہی خاندان میں سے تھے۔ غدر میں انگریزوں کے معاون رہے۔ بہادر شاہ کو جنرل بخت خاں کے ساتھ جانے سے انھیں نے روکا تھا۔

3. مفتی صدر الدین خاں آزردہ جو غدر سے پہلے صدر الصدور تھے، آخری دور کے عظیم المرتبت عالم اور خوش ذوق شاعر تھے۔

وہ فروری کے مہینے میں یہاں آئیں گے۔

الور کی ریاست کا حال بدستور ہے۔ گورنر صاحب ہی انھیں اختیارات دیں گے۔ یعنی پٹیالہ اور الور کے راج کا انتظام اسی وقت پہ ہوگا۔ بالفعل اپنے[4] صاحب ایجنٹ الور دلی ہوتے ہوئے میرٹھ گئے ہیں۔ راجہ صاحب تجارہ[5] تک ان کی مشایعت کو گئے۔ یہاں اپنے صاحب سے، کوئی صاحب سنگھ ٹھیکہ دار الور کی سڑک کا ہے، اس نے کچھ کہا تھا۔ جواب دیا کہ الور کے مقدمات میں پنچوں کو اختیار ہے، ہم کچھ حکم نہ دیں گے۔ اسفندیار بیگ[6] متوفی کا کوئی متبنٰے مستدعی پرورش ہوا، اس کو بھی یہی جواب ملا۔ اب بولو، کیا لکھوں؟

دھوپ میں بیٹھا ہوں۔ یوسف خاں اور لالہ ہیرا سنگھ بیٹھے ہیں۔ کھانا تیار ہے۔ خط لکھ کر، بند کر کر آدمی کو دوں گا اور گھر جاؤں گا۔ وہاں ایک دالان ہے، دھوپ آتی ہے۔ اس میں بیٹھوں گا۔ ہاتھ منہ دھوؤں گا۔ ایک روٹی کا پھلکا سالن میں بھگو کر کھاؤں گا۔ بیسن سے ہاتھ دھوؤں گا۔ باہر آؤں گا۔ پھر اس کے بعد خدا جانے کون آئے گا، کیا صحبت ہوگی۔

مجتہد العصر میر سرفراز حسین صاحب اور ذاکر الحسین میر افضل علی عرف میرن صاحب کو دعا۔

منگل کا دن ۲۳ جمادی الثانی ۱۶ دسمبر پہر دن چڑھے۔

(۱۲۷۹ھ ۱۸۶۲ء) غالب

۴؎ یہ سر الیجا اپے کا پوتا تھا۔ وہی سر الیجا اپے جس نے وارن ہیسٹنگز کے عہد میں نند کمار کو پھانسی کا حکم دیا تھا۔ ۱۸۵۵ء میں الور کا پولیٹیکل ایجنٹ مقرر ہوا۔ ۱۸۶۳ء میں لارڈ لارنس کا سکرٹری بنا۔ اودے پور، جودھپور، گوالیار میں بھی رہا۔ آخر میں نیپال میں ریذیڈنٹ بن گیا۔ ۱۹۰۴ء میں فوت ہوا۔ ۵؎ ریاست الور۔ ۶؎ یہ الور میں دیوان بن گیا تھا۔

(۴۵)

برخوردار،

تمھارا خط پہنچا، مگر یہ غضب ہے کہ میں اس کا جواب نہیں لکھ سکتا اور وہ جواب طلب ہے جواب کیا لکھوں؟ قواعد عملداری کے برہم ہو گئے۔ نئے نئے دستور ہیں۔ شہرت ہوئی کہ لارڈ صاحب آتے ہیں۔ فروری کو انبالے پہنچیں گے۔ اہلِ دہلی کی ملازمت وہاں ہوگی۔ اب یہ آوازہ بلند ہے کہ فروری میں کلکتہ سے چلیں گے۔ بنارس، الہ آباد، اکبرآباد ہوتے ہوئے مارچ کو انبالہ پہنچیں گے۔ الور، جے پور، کوٹہ یہ تین راجے آگرے پہنچ گئے۔ وہاں مبر فرش کی طرح بےکار دھرے ہوئے ہیں الور کے راجا گویا یوسف ہیں، ان کے خریدار دوڑتے پھرتے ہیں۔ کوئی شکرم، کوئی کرانچی ڈھونڈ رہا ہے، کوئی پیادہ چل نکلا۔ کسی نے مانگے کا ٹٹو بہم پہنچایا۔ یہ سب قصے یک طرف، اب سنتا ہوں کہ راجستھان کے ایجنٹ نے سب رئیسوں کو لکھا ہے کہ لارڈ صاحب تمھیں بلاتے ہیں۔ جس کا جی چاہے آوے، جس کا جی نہ چاہے نہ آوے۔ اس تحریر کو دیکھ کر، جو وعدہ گاہ پر جا پہنچے، وہ پشیمان ہیں۔ جو راہ میں ہیں، وہ وہیں ٹھٹک رہے ہیں نہ آگے بڑھتے ہیں، نہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں۔ جو اپنے مقام سے نہ ہلے تھے وہ اچھے رہے۔

یہاں دو تین مہاوٹیں برس گئی ہیں۔ گیہوں، چنا اچھا ہوگا۔ ربیع کی امید پڑی:

افق ہا پُر از ابر بہمن مہی سفالینہ جام من از مے تہی

سیدھے ہاتھ پر ایک زخم، بائیں بازو پر ایک گھاؤ، سیدھی ران پر ایک پھوڑا۔ یہ حال میرا ہے۔ باقی خیر و عافیت۔ میر سرفراز حسین اور میرن صاحب کو دعا پہنچے۔

۱۸۶۳ء

غالب

(۴۶)

نورِ چشم میر مہدی کو بعد دعا کے معلوم ہو کہ "کلیات فارسی" کا پہنچنا مجھ کو معلوم ہُوا۔ میاں، اس میں اغلاط بہت ہیں۔ مبارک ہو تمھیں اور میر سرفراز حسین کو اور میرن صاحب کو اور بھائی: خدا کرے، مجھ کو بھی۔ لو صاحب ایجنٹ بہادر راجستھان کا حکم الور کے اجنٹ کو آیا کہ تم پہلی ستمبر کو راج کے کاغذ جو تمھارے پاس ہیں اور راج کا اسباب جو تمھارے تحت میں ہے وہ سب راجا صاحب کو دو اور تم الگ ہو جاؤ۔ ستمبر کی بیسویں کو ہم الور جائیں گے۔ راجا صاحب کو مسند پر بٹھائیں گے، خلعت شاہی ان کو پہنائیں گے:

ستمبر ستم بُرد و آورد داد

۲۲ر اگست ۱۸۶۳ء غالب

(۴۷)

آیئے جناب میر مہدی صاحب دہلوی، بہت دنوں میں آئے۔ کہاں تھے؟ بارے آپ کا مزاج خوش ہے؟ میر سرفراز حسین صاحب اچھی طرح ہیں؟ میرن صاحب خوش ہیں؟

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

پہلے یہ سمجھو کہ قسم کیا چیز ہے۔ قد اس کا کتنا لنبا ہے۔ ہاتھ پانو کیسے ہیں۔ رنگ کیسا ہے۔ یہ جب نہ بتا سکوگے تو جانوگے کہ قسم جسم و جسمانیات میں سے نہیں، ایک اعتبار محض ہے۔ وجود اس کا صرف تعقل میں ہے۔ سیمرغ کا سا اس کا وجود ہے۔ یعنی کہنے کو ہے، دیکھنے کو نہیں۔ پس شاعر کہتا ہے کہ جب ہم اپنی آپ قسم ہو گئے، تو گویا اس صورت میں ہمارا ہونا ہمارے فنا ہونے کی دلیل ہے ۱۲

دیدنِ حبیب را و ندیدنِ رقیب را   میخواہم از خدا و نمی خواہم از خدا

"لف ونشر" مرتب ہے۔ میخواہم از خدا دیدنِ حبیب را نمی خواہم از خدا نہ دیدنِ رقیب را۔ خوار و زار و خستہ و سوگوار۔ معنی تو اس کے موجود ہیں مگر بول چال ٹکسال سے باہر ہے۔ ایک جملے کا جملہ مقدر چھوڑ دیا ہے اور پھر اس بھونڈی طرح سے کہ جس کو المعنی فی بطن الشاعر کہتے ہیں۔ یہ شعر اساتذۂ مسلم الثبوت میں سے کسی کا نہیں ہے۔ کوئی صاحب ہوں گے کہ انھوں نے لوگوں کے حیران کرنے کے واسطے یہ شعر کہہ لیا اور کسی استاد کا نام لے دیا کہ یہ اُن کا ہے۔

تذکیر و تانیث کا کوئی قاعدہ منضبط نہیں کہ جس پر حکم کیا جائے۔ جو جس کے کانوں کو لگے۔ جس کو جس کا دل قبول کرے، اِس طرح کہے۔ رتھ میرے نزدیک مذکر ہے، یعنی رتھ آیا، لیکن جمع میں کیا کروں گا، ناچار مونث بولنا پڑے گا۔ یعنی "رتھیں آئیں" خبر مونث ہے بہ اتفاق۔ مگر کاغذ اخبار، اس کو خود سمجھ لو کہ تمھارا دل کیا قبول کرتا ہے۔ میں تو مذکر کہوں گا۔ یعنی اخبار آیا۔ پیر ہوئی یا ہوا؟ یہ منطق عوام کا ہے۔ ہمیں اس سے کچھ کام نہیں۔ ہم کہیں گے کہ دوشنبہ ہوا، پیر کا دن ہوا، نوی پیر ہوئی یا پیر ہوا ہم کیوں بولیں گے؟ "بلبل" میرے نزدیک مونث ہے۔ جمع اس کی بلبلیں۔ طوطی بولتا ہے، بلبل بولتی ہے ۱۲ بھائی، اِس امر میں مفتی و مجتہد بن نہیں سکتا۔ اپنا عندیہ لکھتا ہوں جو چاہے مانے، جو چاہے نہ مانے ۱۲

سہ شنبہ ۸ر دسمبر ۱۸۶۳ء   نجات کا طالب غالب

(۴۸)

برخوردار کامگار، میر مہدی دہلوی، اردو بازار کے مولوی، صاحب لوبیے

ولائے مرتضوی پر علم عباسؓ ابن علیؓ کا سایہ۔ راجا[1] صاحب کے سلوک کا حال ہم پہلے ہی سُن چکے تھے۔ الحمد للہ علی کل حال۔ دیکھیے، اب معاودت کب کرتے ہیں موافق اپنے وعدے کے ہم کو کیوں کر طلب کرتے ہیں۔ کلکتہ جاتے وقت فرما گئے ہیں کہ میں آکر اسد کو بلاؤں گا۔ البتہ اگر وہ بلائیں گے تو میں کیوں کر نہ جاؤں گا۔ ظاہر ہمارے تمھارے واسطے زمانہ انتہائے مصیبت اور وقت پیش آمد دولت[2] ہے۔ اب مجھ کو میرن صاحب کی خوشامد کرنی پڑے گی۔ وہ مقرب بنیں گے۔ اگر میری قسمت لڑے گی تم کامیابی کا سامان کر رکھنا۔ میرن صاحب کو مجھ پر مہربان کر رکھنا۔ بھائی، یہ جو میرن یا امیرن صاحب ہیں، حضور کے بڑے مصاحب ہیں۔ جس گروہ میں سے جس کو چاہیں حضور سے ملوادیں۔ فرقہ شعرا میں سے جس کو جو کچھ چاہیں دلوادیں۔ ان کو اور مجتہد العصر کو میری دعا کہنا۔ نجات کا طالب غالب

(۴۹)

قرۃ العینین میر مہدی و میر سرفراز حسین، مجھ سے ناخوش اور گلہ مند ہوں گے۔ اور کہتے ہوں گے کہ دیکھو، ہمیں خط نہیں لکھتا:

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں کاش پوچھو کہ ماجرا[3] کیا ہے

ماجرا یہ ہے کہ تمھارا ابھی تو کوئی خط نہیں آیا، میں جس کا جواب لکھتا۔ میرن صاحب سے تمھاری خیر و عافیت پوچھنی اور کہہ دینا کہ میری دعا لکھ بھیجنا، بس، اب اتنا ہی دم باقی ہے۔ کل میرن صاحب آئے۔ پوچھا کہ الور سے کوئی خط آیا؟ فرمایا: اس ہفتے میں کوئی خط میں نے نہیں پایا۔ کہا کہوں کیا حال ہے؟ پیش ازیں

---

[1] راجہ شیو دھیان سنگھ (جن کو شیودان سنگھ بھی لکھتے ہیں) والی الور

[2] مطلب یہ ہے کہ مصیبتوں کا زمانہ ختم ہو رہا ہے اور دولت ملنے والی ہے

[3] دیوان غالب میں "ماجرا" کی جگہ "مدعا" ہے۔

اپنا یہ شعر پڑھا کرتا تھا:

بس ہجومِ نا اُمیدی خاک میں مِل جائے گی
یہ جو اک لذّت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

اب اس زمزمے کا بھی محل نہ رہا، یعنی سعیِ بے حاصل کی لذّت خاک میں مل گئی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

شنبہ ۱۸ شعبان ۱۲۸۱ھ - ۱۷ جولائی ۱۸۶۵ء غالب

مجتہد العصر میر سرفراز حسین

(۱)

نورِ چشم راحتِ جان، میر سرفراز حسین جیتے رہو۔ تمہارے تسلّی خط نے میرے ساتھ وہ کیا۔ جو بوئے پیرہن نے یعقوب کے ساتھ کیا۔ میاں، یہ ہم تم بوڑھے ہیں یا جوان ہیں، توانا ہیں یا ناتوان ہیں، بڑے بیش قیمت ہیں۔ یعنی بہ ہر حال غنیمت ہیں۔ کوئی جلا بھُنا کہتا ہے:

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ یاد رکھنا فسانہ ہیں ہم لوگ

وہی بالاخانہ ہے اور وہی میں ہوں۔ سیڑھیوں پہ نظر ہے کہ وہ میر مہدی آئے، وہ یوسف مرزا آئے۔ . . . . . . وہ میرن آئے، وہ یوسف علی خاں آئے۔ مرے ہوؤں کا نام نہیں لیتا؛ بچھڑے ہوؤں میں سے کچھ گنے ہیں۔ اللہ، اللہ، اللہ، ہزاروں کا میں ماتم دار ہوں، میں مروں گا تو مجھ کو کون روئے گا؟ سُنو غالب، رونا پیٹنا کیا، کچھ اختلاط کی باتیں کرو۔ کہو میر سرفراز حسین سے کہ یہ خط میر مہدی کو پڑھواؤ اور میرن صاحب کو بُلاؤ۔

کل شام کو یا پرسوں شام کو میر اشرف علی صاحب میرے پاس آئے تھے۔ کہتے تھے کہ کل یا پرسوں پانی پت کو جاؤں گا۔ میں نے اُن کی زبانی کچھ پیام میرن صاحب کو بھیجا ہے، اگر بھول نہ جائیں گے، پہنچائیں گے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ صاحب ابن نہیں ہے، نہ ہو، غلام اشرف نہیں ہے، نہ ہو، اگر منظور کیجیے تو میں صوفی ہوں، ہمہ اوست کا دم بھرتا ہوں۔ بموجب مصرع:

دل بدست آور کہ حج اکبر است

تم سے کب انکار کرتا ہوں، اگر مرزا گوہر کی جگہ مانو، تو خوش، اگر غلام اشرف مانو، تو راضی۔ رات کو اپنے گھر میں باتیں بناؤ، دن کو مجھ سے جی بہلاؤ قصہ مختصر آؤ اور جلد آؤ۔ سید، الور کا جو حال لکھتے ہو، وہ سچ ہے۔ راجپوت ایسا ہی کچھ کرتے ہیں مگر مہاراجہ مسلمانوں کا دم بھرتے ہیں۔ کچھ دن جاتے ہیں کہ یہ لوگ پھر وہاں آتے ہیں، کیا مجمع برہم ہوا ہے! مجھ کو کیسا غم ہوا ہے! تم اس جرگے سے جدا ہو، تم کو کیا اندیشہ ہے؟ میر قربان علی صاحب جیسا لکھیں ویسا کرو۔ میر مہدی صاحب سارا خط پڑھ کر کہیں گے۔ مجھ کو دعا بھی نہ لکھی۔ بھائی میری دعا پہنچے۔ میر نصیر الدین ایک دن میرے ہاں آئے تھے۔ اب میں نہیں جانتا۔ یہاں ہیں یا وہاں۔ ہوں تو دعا کہنا۔ میرن صاحب کے نام تو اتنا کچھ پیام ہے۔ دعا سلام کی حاجت کیا؟ دیکھو ہم اپنا نام نہیں لکھتے، بھلا دیکھیں تو سہی تم جان جاتے ہو کہ یہ خط کس کا ہے؟

(۲)

میری جان کے چین مجتہد العصر میر سرفراز حسین،

تم کو اور تمہارے بھائی کو اور تمہارے دوست کو دعا اور پھر یہ بیان کہ غدر سے پہلے ہر دربار میں خلعت پاتا تھا۔ بعد "غدر" دربار اور خلعت اور

ملاقات سکرٹروں کی، یہ سب موقوف، اب جو لفٹنٹ گورنر پنجاب آئے، تو انھوں نے خود مجھے بلا بھیجا اور خلعت دیا اور فرمایا کہ یہ ہم اپنی طرف سے از راہِ محبت دیتے ہیں اور یہ نوید علاوہ کہ گورنر جنرل بہادر کے ہاں کا بھی دربار اور خلعت کھل گیا۔ انبالے جاؤ گے تو پاؤ گے۔ میں انبالے نہ جاسکا۔ بالفعل نائب گورنر کے خلعت پہ قناعت کی۔ اس خلعت کو بشرطِ حیات اور وقت پر موقوف رکھا۔

ہملٹن صاحب الور میں آگئے۔ راجہ صاحب دربار روز کرتے ہیں۔ اہلِ اغراض کے عرائض جو حضور میں گزرتے ہیں، وہ حضور پنچوں کے پاس بھیج دیتے ہیں۔ خریطہ یعنی حکم اختیار پانے کا ابھی نہیں آیا۔ یقین ہے کہ لارڈ صاحب بعد اختتام سفر جب شملہ پہنچیں گے، تو خریطہ جاری ہوگا۔ آج جمعہ ساتویں شوال کی اور ستائیسویں مارچ کی ہے۔ چار گھڑی دن چڑھا ہے۔ میں یہ خط لکھ کر بھیجتا ہوں۔ تم بھی پڑھو اور میر مہدی کو بھی پڑھا دو، اب شاید تھوڑے دنوں تک میں خط نہ لکھ سکوں۔ تفصیل اس کی یہ کہ رجب کے مہینے میں سیدھے ہاتھ پر ایک پھنسی ہوئی، پھنسی پھوڑا ہوگئی، پھوڑا پھوٹ کر زخم بنا، زخم بگڑ کر غار ہوگیا۔ اب بقدر ایک کفِ دست وہ گوشت مردار ہوگیا۔ انبالے نہ جانے کی بھی یہی وجہ ہوئی۔ دو ہفتے سے انگریزی علاج ہوتا ہے۔ کالا ڈاکٹر روز آتا ہے۔ آج اس نے ارادہ اس مردار گوشت کے کاٹنے کا کیا ہے۔ اب وہ آتا ہوگا۔ جلد جلد یہ لکھ کر روانہ کرتا ہوں۔ تاکہ پھر ہاتھ کے پرزے اڑا دوں۔

۷ شوال ۱۲۷۹ھ مطابق ۲۷ مارچ ۱۸۶۲ء نجات کا طالب غالب

میر افضل علی عرف میرن صاحب

(۱)

سعادت و اقبال نشان، میر افضل علی صاحب المعروف بہ میرن صاحب!

خدا تم کو سلامت رکھے اور پھر تمھاری صورت مجھ کو دکھاوے۔ تمھارا خط پہنچا۔ آنکھوں سے لگایا۔ آنکھوں میں نور آیا۔ دل پر رکھا، مزا پایا۔ کل تک اس نام کو سُن کر شرماتے تھے اور آپ ہی آپ گھُلے جاتے تھے۔ اب بن بن کر باتیں بناتے ہو اور ہم کو کڑیاں سُناتے ہو۔ کاش کہ تم یہاں آ جاؤ۔ تب اس تحریر کا مزا پاؤ۔ میر مہدی صاحب وہ تحریر تمھاری بہ نسبت میرے دیکھ کر بہت خفا ہوئے۔ چنانچہ اب جو تمھاری ان کی ملاقات ہو گی تو تم کو معلوم ہو گا۔

بھائی، تمھارے سالے بہت غرور کے پُتلے ہیں۔ دو ایک بار میں نے ان کو بُلایا۔ اُنھوں نے کرم نہ فرمایا۔ تم سچ کہتے ہو۔ یہ لوگ اور ہی آب و گِل کے ہیں۔ تمھاری اور ان کی کبھی نہ بنے گی اور گھر میں نہ چھنے گی۔ وہیں بیٹھے رہو دیکھو خدا کیا کرتا ہے۔ انشاءاللہ تعالیٰ یہ رنج و عذاب کا زمانہ جلد گزرتا ہے۔

میر سرفراز حسین صاحب کو میری دعا کہنا اور کہنا بھائی وہ زمانہ آیا ہے کہ سیکڑوں عزیز راہیِ ملکِ عدم ہوئے، سیکڑوں ایسے مفقود الخبر ہو گئے کہ ان کے مرگ و زیست کی خبر نہیں۔ دو چار جو باقی رہے ہیں، خدا جانے کہاں بستے ہیں کہ ہم ان کے دیکھنے کو ترستے ہیں۔ میر نصیرالدین کو پہلے بندگی پھر دعا

دوشنبہ ۹ نومبر ۱۸۵۸ء بین الظہر و العصر (حوالہ میر مہدی طال عمرہٗ)

نجات کا طالب غالب

(۲)

برخوردار کامگار میر افضل علی عرف میرن صاحب طال اللہ العمرہ

بعد دعا کے واضح رائے سعادت انتمائے ہو، آپ کا خط پہنچا۔ اگرچہ میں نے صرف پڑھا، میر مہدی کے جلانے کو لکھتا ہوں کہ میں نے آنکھوں سے لگایا۔ ہاں صاحب، تم نے جو لکھا ہے کہ قبلہ و کعبہ کہنے سے وہ صاحب بہت خوش ہوتے ہیں؟ کیوں نہ خوش ہوں۔ خوشی کی بات ہے۔ تمہارے سر کی قسم میں گویا دیکھ رہا ہوں اور میری نظر میں پھر رہا ہے۔ وہ میر سرفراز حسین کا شرما کر آنکھیں نیچی کرنا اور مسکرانا۔ خدا کبھی مجھ کو بھی وہ صورت دکھانے۔ میر نصیر الدین یہاں آگئے ہیں۔ تم مجتہد العصر اور حکیم میر اشرف علی کو میری دعا کہنا اور میر مہدی پوچھیں تو کہنا کہ تم کو کچھ نہیں لکھا۔ کل میں نے خبر منگوائی تھی۔ سو لڑکی کو ابھی تپ آئے جاتی ہے۔ یقین ہے کہ تم نے وہاں پہنچ کر مولوی مظہر علی کو خط لکھا ہوگا۔ ہاں تم کو ضرور ہے۔ اُن سے نامہ و پیام کی رسم رکھنی۔ والدعا

چہار شنبہ ششم جولائی ۱۸۵۹ء غالب

(۳)

میری جان،

تمہارا رقعہ پہنچا، نہ کھلا کہ میر سرفراز حسین جے پور کیوں جاتے ہیں؟ بہر حال میر مہدی کو دعا کہنا اور میر سرفراز حسین سے یہ پوچھنا کہ تم جے پور چلے، میں نے تم کو خدا کو سونپا، تم مجھے کس کو سونپ چلے؟

۲ جولائی ۱۸۶۲ء جواب کا طالب غالب

پاکستان ٹائمز پریس لاہور میں باہتمام شیخ نیاز احمد پرنٹر پبلشر چھپکر شائع ہوئی